109
50
67
48
47
49
370
225
595
20
615

4
27

Tahira.

ساحل اور سمندر

سیّد احتشام حسین

ساحل اور سمندر

(ایک سفرنامہ اور ڈائری)

سیّد احتشام حسین

(لکھنؤ یونیورسٹی)

سید وجاہت حسین نے

سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے شایع کیا

بار اول

۱۹۵۴ء

مصنّف کی دوسری کتابیں

عُنوانات

گذارش

"ساحل اور سمندر" میرے امریکہ اور انگلستان کے سفر سے متعلق چند بے ربط تاثرات اور خیالات کا مجموعہ ہے اور اس کو اسی نظر سے پڑھنا چاہیے۔ خود مجھے اس کی خامیوں کا احساس ہے تاہم اسے پیش کرتے ہوئے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ اس کا تعلق ادب کی اُس صنف سے ہے جس کی اُردو زبان میں کمی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی اشاعت سے وہ کمی پوری ہو جائے گی بلکہ خیال ہے کہ شاید اسے دیکھ کر دوسرے ادیب اس مفید، لطیف اور دلچسپ صنفِ ادب کی جانب متوجہ ہوں اور اس سے بہتر کارنامے وجود میں آئیں۔

میں نے کوشش کی ہے کہ اسے بہت سے ادبی، فلسفیانہ یا علمی مباحث سے گرانبار نہ ہونے دوں بلکہ ایک ایسا متوازن انداز قائم رہے کہ یہ باتیں ادیبوں اور علم دوستوں کو بالکل سطحی نہ معلوم ہوں اور عام پڑھنے والے ان کی خشکی سے اُکتا نہ جائیں۔ اس میں تاریخی، سیاسی، جغرافیائی معلومات یا مختلف قسم کے اعداد و شمار یکجا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے کیونکہ میرا مطمح نظر یہ نہیں تھا تاہم جہاں کہیں ایسی ضروری باتیں آگئی ہیں انھیں مناسب جگہ بھی دی گئی ہے۔ اس کی بعض باتیں کچھ حضرات کو محض سطحی معلوم ہوں گی لیکن میں نے انھیں کسی نہ کسی وجہ سے اہم سمجھ کر باقی رکھا ہے۔ دورانِ سفر میں جو کتابیں اور رسائل پڑھتا رہا ہوں عام طور سے ان کا تذکرہ بھی میں نے نہیں کیا ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ اس میں بہت سے ادیبوں، ادبی مسئلوں اور کتابوں کا ذکر ہو سکتا تھا لیکن اسے طویل بنانا یا ہر طرح کے رطب و یابس جمع کرنا میرا مقصد نہیں تھا۔

میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ صرف چند مہینوں کے قیام کے بعد اجنبی ملکوں کے متعلق بہت جچی تلی رائے قائم کرنا مشکل بھی ہے اور نامناسب بھی، لیکن یہ خیال درست نہیں کہ یہ ملک بالکل اجنبی ہیں۔ دورِ حاضر میں معلومات حاصل کرنے کے جو ذرائع موجود ہیں انھوں نے اس کام کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ میں اس بات کا مدعی بھی نہیں ہوں کہ

میں نے جو رائیں قائم کی ہیں وہ آخری اور قطعی ہیں - غائر نظر سے مطالعہ کرنے والا میرے بیانات کی روشنی میں اپنی رائے خود بھی قائم کر سکے گا۔ کیونکہ بعض اشارات اور واقعات مبہم ہونے کے باوجود اپنی کہانی واضح طور پر کہہ جاتے ہیں۔ میں نے جو کچھ سمجھا ہے اُس کی جھلک آخری باب میں ملے گی اگرچہ وہ بہت مختصر ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان صفحات کو پڑھ کر کوئی مجھ سے یہ نہیں کہہ سکے گا کہ "عیبش جملہ گفتی ہنرش نیز بگو"، کیونکہ میں نے تصویر کا ہر رُخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر میرے علم و شعور نے کہیں کہیں اس میں رنگ آمیزی کر دی ہے تو میں اس کے لئے معذرت کرنے سے معذور ہوں - یہ کیونکر ممکن ہے کہ لکھنے والا اپنی تحریر میں خود موجود نہ ہو!

اس کتاب کو تقریباً ایک سال پہلے شائع ہو جانا چاہئے تھا لیکن میری غیر معمولی تساہلی نے ایسا نہ ہونے دیا۔ آخری باب کے سوا سب کچھ اسی دن لکھ کر ختم کر چکا تھا جس دن سفر ختم ہوا، یہاں تک کہ تمہید کے ابتدائی دو باب بھی امریکہ ہی میں لکھ ڈالے تھے لیکن میں نے مسودہ یہ سوچ کر ایک طرف ڈال دیا کہ فرصت کے وقت نظر ثانی کروں گا، کہیں کچھ بڑھاؤں گا، کہیں سے کچھ نکالوں گا کیونکہ تقریباً روزانہ لکھتے رہنے میں بعض اوقات محض مختصر اشاروں سے کام لینا پڑا اور بعض مقامات پر یہ احساس ہوا کہ بات جس طرح کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا۔ پورا سال گذر گیا، فرصت ہوئی بھی اور نہیں بھی ہوئی، شائع کرنے کے لئے تقاضے اور اصرار بھی ہوئے لیکن نظر ثانی کی نوبت نہ آئی اور مجھ پر وہ کیفیت طاری ہونے لگی جو بہت سی تصانیف کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ چند دن ہوئے میرے چھوٹے بھائیوں نے سازش کی اور اس قدر مُصر ہوئے کہ میں نے مسوّدہ اُن کے حوالے کر دیا، چنانچہ اب وہی اسے شائع کر رہے ہیں۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی تو ہے لیکن معمولی لفظی ترمیموں کے سوا اور کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ بہر حال جو کچھ ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

سیّد احتشام حسین

لکھنؤ یونیورسٹی

۲۸ راگست ۱۹۵۴ء

کشمکش اور سمجھوتہ

امریکہ کا سفر! اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے لئے تمام آسانیاں فراہم ہو جائیں، بادی النظر میں بے حد دل خوش کن موقع ہے لیکن میں اپنی افتاد طبع کو کیا کہوں، میرے لئے نہیں ہے۔ رنج مجھے بے حد رنجیدہ کر دیتا ہے اور خوشیاں زیادہ خوش نہیں کرتیں۔ میں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور جن اقتصادی مشکلات میں تعلیم حاصل کی تھی، پھر ایک ملازمت ملتے ہی اس سے جس طرح چمٹ گیا تھا، اس میں کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ تحصیل علم کے لئے باہر جا سکوں گا۔ سیر و تفریح کا خیال بھی محض ایک ارمان اور دھندلی سی آرزو کی طرح آتا اور نکل جاتا تھا، اُمیدوں کے ننھے مُنے چراغ جلتے اور بجھ جاتے تھے، پھر یہ خواہش بھی بس انگلستان، ایران، عراق، عرب اور چین تک محدود رہتی تھی۔ یوں میں نے ہندوستان سے باہر سفر کے مسئلہ پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا؛ عمر کی منزلیں جس قدر قطع ہوتی جاتی تھیں، باہر نکلنے کا خیال اسی قدر پیچھے

چھوٹتا جاتا تھا لیکن جب اس کی صورت اچانک پیدا ہوگئی تو مجھے عجیب و غریب کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔

لیکن بڑھنے سے پہلے امریکہ جانے کی صورت پیدا ہونے کی داستان تو بیان کردوں!

فروری ۱۹۵۲ء کی غالباً چھبیسویں یا ستائیسویں تاریخ تھی حسب معمول یونیورسٹی گیا اتفاقاً پروفیسر ڈی، پی، مکرجی (صدر شعبہ معاشیات و عمرانیات) سے ملاقات ہوگئی انھوں نے کہا "احتشام! شام کو سات بجے حضرت گنج آجاؤ تو تمھیں ایک دلچسپ شخص سے ملادوں"۔ میں نے وعدہ کرلیا کہ آجاؤں گا لیکن کسی وجہ سے جا نہ سکا۔ دوسرے دن جب یونیورسٹی پہونچا تو پروفیسر مکرجی کا (جنھیں ہم سب عام طور سے صرف ڈی پی کہتے ہیں) رقعہ ملا کہ تم کل نہیں آئے، آج جیسے ہی یونیورسٹی پہونچو مجھ سے مل لو۔ مجھے اپنا وعدہ پورا نہ کرنے پر شرمندگی ہوئی اور دل ہی دل میں معقول عذر تلاش کرتا ہوا، ان کے پاس پہونچا معذرت کی تو بولے "خیر، جانے دو، میں نے تمھاری طرف سے کل صبح نو بجے کا وقت دے دیا ہے، کارلٹن ہوٹل جاکر مسٹر گل پیٹرک سے مل لو، گل پیٹرک کو جانتے ہو نا؟" میں نے کہا "بس اتنا جانتا ہوں کہ امریکی ہیں اور راک فیلر فاؤنڈیشن کے ایک رکن"۔ کہنے لگے "بس ٹھیک ہے، بہت معقول آدمی ہیں، دیکھو میں نے وعدہ کرلیا ہے ضرور مل لینا، وہ نو بجے تمھارا انتظار کریں گے" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، میں نے کہا "جب آپ نے وعدہ کرلیا ہے تو ضرور جاؤں گا، مگر ہے کیا؟ اُن سے کیا باتیں کروں گا؟" کہنے لگے "بس جو باتیں وہ کریں تم بھی کرنا" میں

کیا جانوں کیا باتیں کریں گے"۔ جب میں چلنے لگا تو مسکرا کر بولے "ہوشیاری سے گفتگو کرنا شاید تمھارے لئے کوئی فائدے کی صورت نکل آئے"۔

میں چلا آیا۔ "فائدے کی صورت!" فائدے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ مجھے فکر سی ہو گئی۔ ممکن ہے کوئی کتاب وغیرہ لکھنے یا ترجمہ کرنے کا مسئلہ ہو۔ چند مہینے قبل یہی مسٹر گل پیٹرک لکھنؤ آئے تھے تو ڈی، پی اور بعض دوسرے احباب سے ہندوستانی ادب کے جدید رجحانات پر ایک کتاب مرتب کرانا چاہتے تھے۔ اس کی ایک اسکیم ڈی، پی نے تیار کر کے راک فیلر فاونڈیشن کو بھیج بھی دی تھی۔ اس کا معاملہ معلّق تھا، ممکن ہے اس کے متعلق کوئی بات کریں۔ خیر دیکھا جائے گا۔

میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ دوسرے دن نو بجے کارلٹن ہوٹل گیا مسٹر گل پیٹرک سے ملاقات ہوئی اور دو ڈھائی گھنٹے تک مختلف ہندوستانی زبانوں اور ان کے ادب، ادیبوں اور ادبی مسئلوں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کئی دفعہ ہندوستان آ چکے ہیں، مختلف زبانوں کے ادیبوں سے مل چکے ہیں، جو لوگ امریکہ گئے ہیں اُن سے گفتگو کی ہے امریکی یونیورسٹیوں میں اور ان کے باہر امریکہ میں ہندوستانی ادب اور زندگی سے جو دلچسپی لی جا رہی ہے اُس سے باخبر ہیں، اس لئے ان کی باتیں بالکل سطحی نہ تھیں۔ کوئی دو گھنٹے کی گفتگو کے بعد انھوں نے کہا "آپ یورپ اور امریکہ کیوں نہیں ہو آتے" میں نے کہا "دشواریاں ہیں، اس کے علاوہ مجھے اپنے لئے کچھ زیادہ فائدہ بھی نظر نہیں آتا"۔ کہنے لگے "میں سمجھتا ہوں آپ کا یہ خیال صحیح نہیں، باہر جانے سے فائدہ ضرور ہوتا ہے بہت سی باتیں جو کتابوں سے معلوم نہیں ہوتیں، جانے سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ ہم آپ کو

راک فیلر فاونڈیشن کی طرف سے فیلوشپ دیں گے آپ امریکہ اور انگلستان میں لوگوں سے مل کر یہ پتہ لگائیے کہ ہندوستان کی ادبی زندگی میں نظم پیدا کرنے، اچھے ہونہار ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور کتابوں کی اشاعت کو بہتر بنانے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی دیکھئے کہ آپ کے پسندیدہ موضوع تنقید کے سلسلہ میں باہر کیا ہو رہا ہے۔" میں نے کہا "اس مشورہ کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن مسٹر گل پیٹرک! میرے کچھ خاص قسم کے خیالات ہیں ممکن ہے جو نتیجے میں نکالوں اُن سے آپ کو دلچسپی نہ ہو۔" کہنے لگے "میری دلچسپی کا زیادہ سوال نہیں ہے اور پھر ہمیں آپ کے خاص قسم کے خیالات وغیرہ سے واسطہ نہیں ہم تو ایسا آدمی چاہتے ہیں جو ان مسائل پر سوچنے کی کوشش کر رہا ہو۔" یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے کے اندر سے ایک فارم لاکر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس کے ساتھ اپنے ذہنی ارتقا کی مختصر سی تاریخ اور اپنے مطالعہ کی اسکیم بھی لکھ کر بھیج دیجئے گا، جی چاہے تو اسکیم کے متعلق پروفیسر ڈی، پی، مکرجی سے بھی باتیں کر لیجئے گا۔" میں اس کے لئے بالکل تیار نہ تھا، میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "لیکن میں ......" مجھے ہچکچاتے دیکھ کر کہنے لگے "کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟" میں نے کہا "مدّت ہوئی"، "بچے بھی ہیں"؟ میں نے کہا "پانچ"! "تو کیا آپ کی بیوی آپ کے ساتھ جا سکیں گی" میں نے جواب دیا "نہیں، اور ابھی تو میرا ہی جانا مشکوک ہے۔" کہنے لگے "نہیں آپ تو ضرور امریکہ آئیے میں نے ہندوستان میں یہ فارم صرف آپ کو دیا ہے، اگر کسی وجہ سے آپ یہی طے کریں کہ نہیں آئیں گے تو اسے پھاڑ کر پھینک دیجئے گا۔ مگر میری دلی خواہش ہے کہ

آپ گھر سے نکلیں، سال بھر کچھ ایسا زیادہ نہیں ہوتا" ہم آپ کی بیوی کو فیملی الاؤنس بھی دیں گے"۔ میں نے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کہا۔ "اچھا میں سوچوں گا اور پھر آپ کو بتاؤں گا"۔ بولے "میں تو کل چلا جاؤں گا، چار پانچ دن دہلی میں رہوں گا اور پھر امریکہ۔ اب آپ سے نیویارک ہی میں ملاقات ہوگی"۔ میں نے دہلی کا پتہ پوچھا اور چلا آیا۔ میرے قدم بھاری اُٹھ رہے تھے، اس دن کارلٹن ہوٹل میں مشہور ہندوستانی ایکٹر دلیپ کمار ٹھہرا ہوا تھا، تماشائیوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ پولیس انتظام میں مصروف تھی لیکن میرے لئے ایک ایسی کشمکش کا دروازہ کھل گیا تھا کہ میں اُس سے بھی لطف اندوز نہ ہو سکا۔ مسئلہ پر زیادہ غور کئے بغیر میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا یہاں تک کہ دوسرے دن میری ماں اور بیوی نے پوچھا "کیوں طبیعت کیسی ہے؟" اور میں نے ہنس کر اپنے چہرے کا غبار دھونے کی کوشش کی، "کچھ تو نہیں ٹھیک ہوں، آج مجھے ذرا جلدی یونیورسٹی جانا ہے ضروری کام ہے"۔ یونیورسٹی میں بھی میں نے کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ دو دن تک کیا سوچتا اور اُلجھتا رہا اور پھر میں نے مسٹر گل پیٹرک کو اُن کے دہلی کے پتہ پر خط لکھا کہ میں اتنا اہم فیصلہ کرنے سے پہلے دو باتیں جاننا چاہتا ہوں۔ پہلی یہ کہ اس فیلوشپ کے ساتھ کچھ شرائط تو وابستہ نہیں ہیں؟ دوسرے یہ کہ میرے کام کی واقعی نوعیت کیا ہوگی؟ پانچ چھ دن گذر گئے اور کوئی جواب نہیں آیا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے سینے سے کوئی بوجھ ہٹ رہا ہے۔ اب میں نے بیوی سے، بعض دوستوں سے اور پروفیسر ڈی پی مکرجی سے اس ملاقات کا تذکرہ اس طرح کیا کہ گویا

ایک بات ہوئی اور ختم ہوگئی پھر بھی ردّ عمل ملا جلا تھا زیادہ تر لوگوں نے کہا،
اس موقعے کو ہاتھ سے کھونا حماقت ہے، ضرور جاؤ، ایسے موقعے کہاں ملتے ہیں
اس درمیان میں راک فیلر فاؤنڈیشن کے بنگلور آفس سے ایک خط اور طبی معائنہ کا
ایک فارم آیا کہ لکھنؤ میڈیکل کالج سے اس کی خانہ پُری کرا کے مع سینہ کے ایکس رے
پلیٹ وغیرہ کے بنگلور بھجوا دیجئے۔ میں نے یہ فارم اور فیلوشپ کی درخواست کا فارم
ایک طرف ڈال دیا اور اسے بھلانے کی کوشش کی کہ میرے ضمیر میں کوئی جنگ
جاری ہے لیکن وہ ایسی نہ تھی کہ اس طرح آسانی سے بھلا دی جاتی۔ یہ
جنگ کیا تھی؟

جو باریک اور نازک سوئیاں میرے ضمیر میں چبھ رہی تھیں شاید میں
اُن کا واضح تذکرہ نہ کر سکوں لیکن بعض موٹی موٹی باتیں ضرور بیان کر سکتا ہوں، اس کا
تجزیہ کرنا بھی میرے لئے آسان نہیں ہے کہ میری اُلجھن کس قدر نفسیاتی تھی اور
کس قدر واقعاتی یا حقیقی۔ بہرحال وہ کچھ ایسی تھی کہ اب بھی جب میں سفر میں ہوں
میرے سینے پر ایک بوجھ کی طرح رکھی ہوئی ہے اور مکڑی کی طرح نت نئے جال
بُنتی چلی جا رہی ہے۔

کئی سال سے میں جس قسم کی ادبی اور تہذیبی زندگی سے وابستہ رہا ہوں
وہ میرے مضامین اور کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں سے چھپی ہوئی نہیں رہی ہے۔
اپنے طور پر میں نے مخلصانہ اور سوچ سمجھ کر اس راہ کو قبول کیا ہے، اپنے خیال میں
اس منزل سے بھی گذر چکا ہوں جب محض جذباتی انداز میں یا تفریحاً کسی نقطۂ نظر
کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ میں نے اس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کا وقتاً فوقتاً

جائزہ لیا ہے شائد اسی وجہ سے میں اپنے نقطۂ نظر میں اُس انتہا پسندی کا شکار کبھی نہیں ہوا ہوں جو کسی اصول یا راستہ کو جذباتی یا مِکانکی طور پر تسلیم کر لینے سے وجود میں آتی ہے۔ اس نقطۂ نظر نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی دشمن وہ طاقتیں ہیں جو سامراج اور سرمایہ داری کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ کیونکہ اُن کی سیاسیات اور معاشیات انھیں دوسروں کو محکوم بنائے رکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس طرح جب کبھی امریکہ کا خیال آتا ہے تو ایک سرمایہ دار اور اپنا معاشی حلقۂ اثر بڑھانے والے جنگ جو ملک کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، مثالیں دینے اور واقعات پیش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ باتیں بالکل واضح ہیں۔ امریکہ سے میری یہ بدظنی بھی جذباتی نہیں۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو امریکہ کی ٹکنیکل، طبی اور سائنٹیفک ترقی کا انکار کریں یا اگر وہاں سے کوئی مفید کتاب شائع ہو تو اُسے پڑھنے سے پہلے ہی مردود قرار دے دیں تاہم مجموعی حیثیت سے امریکہ کے لئے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ اس لئے اب جو امریکہ ہی سے وظیفہ لے کر وہیں جانے کا سوال پیدا ہوا تو فیصلہ آسان نہ رہا۔

بعض اوقات بڑے اوچھے خیالات بھی پیدا ہوتے تھے۔ اب تک تو ترقی پسندوں کے بعض انتہا پسندانہ خیالات پر، روس کی زندگی اور سیاست پر، ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی پر جب جی چاہتا تھا اعتراض کر دیتا تھا اور لوگ اسے خلوص پر مبنی سمجھتے تھے لیکن امریکہ سے واپس آکر جب کبھی ایسی ہی باتیں پُرخلوص طور پر بھی کہوں گا تو اوچھی طبیعت رکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ

محض امریکہ کی حمایت میں کہہ رہا ہوں۔ بعض لوگ مذاق ہی مذاق میں دبی زبان میں اس کی طرف اشارہ کر بھی جاتے ہیں۔ کیا کرنا چاہیئے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ایک بڑی بات خود اعتمادی کی کمی بھی ہے۔ میں نے امریکہ کی زندگی اور امریکی ادب کا مطالعہ کم کیا ہے۔ وہاں پہونچ کر اپنی کم علمی کی وجہ سے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ مجھے لوگوں میں بیٹھ کر باتیں بنانے، محفلوں میں لطیفے سنانے، چٹکلے بازی کرنے، ہنسی مذاق میں وقت گذارنے، اجنبی لوگوں میں گھُل مِل جانے کا فن بھی نہیں آتا، وہاں پہونچ کر بالکل احمق نہ بن جاؤں۔ میں بہت تھوڑی سی معلومات کا انسان ہوں، پھر لطف یہ ہے کہ مجھے ہر بات پوچھتے ہوئے شرم بھی آتی ہے، سال بھر تک کس طرح اجنبی لوگوں میں وقت گذرے گا!

میں لباس، کھانے پینے، رہنے سہنے کے طریقوں میں بے احتیاط اور بے پروا ہوں مجھے یہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ جو لوگ امریکہ ہو آئے ہیں اُن سے پوچھوں کہ وہاں رہنے کے لئے کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ یک بہ یک لباس اور کھانا پینا سب بدل دینا ہوگا، کہیں میں اس کو زیادہ نہ محسوس کروں! اگر لباس نہ بدلوں تو بھی مناسب نہیں، ہر وقت اپنے اجنبی لباس کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنے رہنا بھی مجھے پسند نہیں۔ میری صحت بھی جلد جلد رنگ بدلا کرتی ہے، خبر نہیں وہاں ایک اَن جانے دیس میں کیسی گذرے، وہاں کون میرے ناز اٹھائے گا!

مقصد واضح نہیں کہ وہاں پہونچ کر کیا کرنا ہوگا۔ مسٹر گل پیٹرک سے باتیں تو بہت سی ہوئی تھیں لیکن یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ میرے کام کی نوعیت کیا ہوگی۔ میں نے ڈی پی مکرجی سے پوچھا، انھوں نے بھی کچھ مدد نہ کی۔ مجھے امریکہ میں لکچر دینے ہوں گے، کسی یونیورسٹی میں پڑھنا ہوگا، پڑھانا ہوگا، جگہ جگہ جانا ہوگا، کوئی بات صاف نہ تھی، مبہم طور پر یہ اندازہ تھا کہ امریکہ میں ادبی صورت حال کا مطالعہ کرنا اور اگر اُس سے کچھ مواد ملے تو اُس کو ہندوستان کی صورت حال کے بہتر بنانے کے لئے کام میں لانا بس یہی اتنی بات سمجھ میں آئی تھی۔ کوئی مقالہ لکھنا ہوگا، کوئی رپورٹ دینی ہوگی، ابھی کچھ معلوم نہیں میری خاندانی زندگی بھی کچھ اس قسم کی رہی ہے کہ میں اپنے متعلقین سے اور وہ سب مجھ سے بہت زیادہ وابستہ ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نہ رہوں تو شائد ان لوگوں کو تکلیف ہو۔

اور ان سب پر بالا میری بے حوصلگی ——————

سمجھ میں نہیں آتا کس طرح اس کشمکش کا مقابلہ ہو؟ کیا فیصلہ کیا جائے؟ کوئی ایسا نہیں جس کے سامنے سینے سے یہ سب کچھ نکال کر رکھ دوں اور پوچھوں کہ بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے! کیسے پڑی ہے کہ میری اُلجھنوں میں میرا ساتھ دے۔ اس لئے میں تنہا سوچتا رہا۔ نہ جانے یہ اچھی بات ہے یا بُری میں عام طور سے اپنے دل کا حال، جس کا تعلق میری ذات سے ہو کسی سے بیان نہیں کرتا، مجبوری کی اور بات ہے۔

۲۰ مارچ کو امریکہ سے مسٹر گل پیٹرک کا خط آیا کہ دہلی میں اُنھیں میرا خط

اُس وقت ملا جب وہ سفر کے لئے تیار ہو چکے تھے اس لئے امریکہ پہونچ کر جواب لکھ رہے ہیں۔ لکھا تھا کہ مجھے آپ کے صاف سوالات سے خوشی ہوئی۔ شرائط کے متعلق جو سوال ہے اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی شرط نہیں، صرف ہم اتنا چاہتے ہیں کہ آپ امریکہ سے واپسی پر اپنی ہی یونیورسٹی میں جائیں۔ کام کیا کرنا ہوگا؟ یہ آپ طے کیجئے اور جی چاہے تو ڈی پی مکرجی سے مشورہ کر لیجئے، فارم جلد بھیجئے۔ بعض اوقات جو یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ چلو قصّہ ختم ہوا، وہ پھر بدلا۔ میں نے اپنی مختصر سوانح عمری اور ذہنی ارتقا کی کہانی لکھ ڈالی اور مطالعہ کی ایک اسکیم بنالی، کسی سے کوئی مشورہ نہ لے سکا۔ ڈی پی مکرجی، ایک بین الاقوامی معاشی کانفرنس میں شرکت کے لئے ماسکو چلے گئے تھے اور شروع مئی میں آنے والے تھے۔ اپریل کا آدھا مہینہ گذر چکا تھا، بعض دوست اصرار کر رہے تھے کہ دیر نہ کرو فارم بھر کر بھیج دو۔ میں طے نہ کر سکتا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔

اب میں نے یوں سوچنا شروع کیا، فارم بھیج دینے میں کیا ہے، کوئی پابندی تو ہے نہیں، ابھی کیا معلوم فیلوشپ ملے گی بھی یا نہیں، اگر نہ ملی تو کوئی بات ہی نہیں، اگر مل گئی تو میں آخر وقت تک انکار کر سکتا ہوں، کوئی بہانہ کر سکتا ہوں۔ اس طرح میں نے خود کو رضامند کر لیا۔ میڈیکل کالج جاکر طبی معائنہ کرالیا، فارم بھروالیا، سوانح عمری اور مطالعہ کی اسکیم ٹائپ کرالی، درخواست کا فارم بھر لیا۔ اس پر دو دستخطوں کی ضرورت تھی۔ مسٹر گل بیٹر کہنے کہا تھا، ایک ڈی پی مکرجی سے کرا لیجئے گا ایک اپنے وائس چانسلر سے۔ ڈی پی موجود نہیں تھے، میں نے وائس چانسلر اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس سے

دستخط کرالئے اور ۲۱ ۔ اپریل کو طبّی معائنہ کی رپورٹ بنگلور بھجوادی اور درخواست وغیرہ نیویارک ۔ مسٹر گل پیٹرک کو خط لکھ دیا کہ ڈی پی ایک کانفرنس میں ماسکو چلے گئے ہیں اور مئی میں واپس ہوں گے اس لئے ان کے دستخط نہ ہو سکے جب میں یہ خط لکھ رہا تھا تو خیال پیدا ہو رہا تھا کہ ڈی پی کے ماسکو جانے کا ذکر کردوں یا یہی لکھ دوں کہ موجود نہیں ہیں۔ لیکن پھر ماسکو لکھ دینا ضروری معلوم ہوا ۔ خیال ہوا کہ ماسکو لکھ دینے سے راک فیلر والوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ جس شخص نے میرا تعارف کرایا اور شائد میری تعریف بھی کی ہو اُس کے خیالات اور رجحانات کیا ہیں، تاکہ کوئی غلط فہمی نہ رہے ۔

میں نے اپنی سوانح عمری میں جو باتیں لکھیں اُن میں سے چند یوں تھیں :۔

"........ ۱۹۳۰ء میں تعلیم کے لئے میں الہ آباد پہونچا ، الہ آباد اُس وقت انگریزی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک کا مرکز تھا ، بدیسی اور خاص کر برطانوی مال کا بائیکاٹ ، ستیہ گرہ اور سیاسی چہل پہل اپنے شباب پر تھی ، میں بھی فطری طور پر قومی آزادی کے جذبے سے معمور ہو گیا۔ الہ آباد میں جو بیداری تھی میں نے اسے جذب کرنے کی کوشش کی ...... یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں میں نے لکھنا شروع کیا ۔ افسانے ، ڈرامے ، نظمیں ، تنقیدی مقالات ، علمی مضامین ، سب کچھ ۔ پڑھنے کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی خاص ترتیب یا خیال سے نہیں پڑھتا تھا لیکن ادب ، تاریخ ، فلسفہ ، سیاست ، نفسیات اور جنسیات سبھی سے دلچسپی لیتا تھا تاکہ میں زندگی کے مسائل کو پوری طرح سمجھ سکوں ...... آخر کار میرا سارا وقت تنقید سے دلچسپی لینے اور

تنقیدی مضامین لکھنے میں صرف ہونے لگا۔ ۱۹۳۶ء میں میرے خیالات ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگے۔ ملک میں جو ترقی پسند جمہوری لہریں اُٹھ رہی تھیں اور یورپ میں جو فاشزم کی مخالفت کا زور بڑھ رہا تھا میں خود کو اُن سے ہم آہنگ کرنے لگا۔ میں نے اپنی تحریروں کی مدد سے اس کشمکش کو سمجھنے کی کوشش شروع کی جو بہت ہی تند و طوفانی لیکن بہت ہی پیچیدہ شکل میں ملک کے اندر رونما ہو رہی تھی اور جس کے اندر جمہوری ترقی کے تقاضے چھپے ہوئے تھے۔ مختلف گروہوں اور طبقوں کے عمل میں یہ باتیں جس طرح ظاہر ہو رہی تھیں میں اُن کی حقیقت جاننا چاہتا تھا.........

"........ میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی ملک اور قوم کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اُس کے سماجی نظام میں پیوست ہوتی ہیں اور اُن کو اس سے الگ کر کے دیکھنا کبھی صحیح نتائج تک نہیں پہونچا سکتا...... میں نے اپنی تمام تحریروں میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، ایسا آئینہ نہیں جس میں صرف زندگی کے ٹھہرے ہوئے نقش دیکھے جا سکیں بلکہ ادب متحرک بن کر ہمیں زندگی کے اعلیٰ مقاصد تک پہونچانے اور انھیں حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان کی فطرت میں بدی نہیں ہے بلکہ حالات اُسے ایسا بناتے ہیں اور اگر ہم تمام قوموں کو مطمئن اور آسودہ حال زندگی بسر کرنے کا موقع دیں تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ انسان دوستی پر مبنی بین الاقوامیت، جو ہر ملک اور قوم کو برابری کا درجہ دینا قبول کرتی ہے اور ہر قوم کی شخصیت کو برقرار رکھنا چاہتی ہے ہماری اصل منزل ہے میرا عقیدہ ہے کہ

دائمی امن قائم ہو سکتا ہے اور انسان ترقی کی جانب بڑھ سکتا ہے۔ دنیا کے اچھے انسان اور اچھے ادیب اسی جانب رہنمائی کرتے رہے ہیں ...... اس طرح جب ادب کا مطالعہ کرتا ہوں تو اس میں انسان کے سیاسی، معاشی، تاریخی، سماجی، مذہبی، سبھی حالات کو لے لیتا ہوں تاکہ صحیح تصویر بن سکے۔ میں نے اِسی طریقہ کو مفید پایا ہے اور اِسی کی اشاعت کرتا رہا ہوں ..... میں جس زبان میں لکھتا ہوں وہ اُردو ہے، جسے ابھی بیسویں صدی کی ابتدا تک ملک کی عام زبان کی حیثیت حاصل تھی لیکن حالات اس قدر تیزی سے بدلے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاست نے وہ ابتری پھیلائی ہے کہ ہندوستان میں اس کی زندگی مشکل ہو رہی ہے۔ تاہم یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں اعلیٰ ادب موجود ہے اور اب بھی پیدا ہو رہا ہے اور میں اُس کی حیثیت منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا.....۔"

میں نے اس میں تعلیمی زندگی وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ کیا تھا لیکن مصلحتاً ترقی پسند مصنفین کی انجمن یا کسی خاص ادبی حلقہ سے اپنی وابستگی ظاہر نہیں کی تھی۔ اسے جس چیز سے بھی تعبیر کر لیا جائے۔ مطالعہ کی اسکیم جو میں نے پیش کی وہ اُس گفتگو پر مبنی تھی جو ڈیڑھ مہینے قبل مسٹر گل پیٹرک سے ہوئی تھی یعنی ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادیب، قاری اور ناشر تینوں کے مسائل پر تبادلۂ خیال اور ادبی تخلیق اور اشاعت کو منظم کرنے کی تدبیروں پر غور کرنا ——— اس بات کو میں نے ذرا پھیلا کر لکھا تھا اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ درحقیقت یہ کام تو ہندوستان ہی میں رہ کر ہو سکتا ہے لیکن اور ملکوں میں انھیں باتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہاں کے مسائل کے سمجھنے میں زیادہ

آسانی ہو گی ۔

۱۲ اپریل ۱۹۵۲ء کو گاڑی یہاں تک بڑھ گئی ۔ چند دن اور گذرے اور یونیورسٹی میں گرمیوں کی تعطیل ہو گئی ۔ ذہنی کشمکش میں کچھ کمی ہو چکی تھی، اس کا تذکرہ لوگوں سے کم آتا تھا لیکن میرے لئے نہ لکھنے پڑھنے کا ایک بہانہ سا ہاتھ آ گیا تھا بہت سے ضروری کام، بہت سے ادھورے مضامین اور دو تین مکمل اور نامکمل کتابیں میری طرف دیکھ رہی تھیں اور میں نے ہر ضروری کام سے چھٹی لے لی تھی ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان باتوں کا تعلق کہاں تک اس الجھن سے تھا مگر زمانہ دونوں کا ایک ہی ہے ۔

مئی کے دوسرے ہفتے میں مسٹر گل پیٹرک کا خط آیا کہ فارم پہونچ گیا، آپ نے جو کچھ لکھا ہے اُسے میرے ساتھیوں نے بہت پسند کیا ۔ ابھی طبی معائنہ کی رپورٹ نہیں پہونچی، وہ پہونچ جائے تو کوئی فیصلہ ہو ۔ مجھے فیصلہ کا کوئی خاص انتظار بھی نہیں تھا لیکن مسلسل ایک شش و پنج کی سی کیفیت تھی ۔ مجھے اب بھی یہی خیال تھا کہ شائد وہ لوگ مجھے فیلوشپ دینا مناسب نہ سمجھیں گے اور اگر دے ہی دیں گے تو میں اس وقت طے کروں گا کہ مجھے جانا چاہیئے کہ نہیں ۔ یونیورسٹی بند ہو چکی تھی گرمی کی تعطیل میں کہیں جا نہ سکا، مئی کا مہینہ ختم ہو گیا، جون دو تہائی گذر گیا اور اب مجھے سکون سا ہو چلا کہ قصہ ختم ہو گیا ۔ میں نے اپنے نئے مجموعۂ مضامین تنقید اور عملی تنقید کی کاپیاں پڑھ کر دہلی واپس کیں، تاباں فتحگڈھی کے اصرار پر ۱۹۵۱ء کے مطبوعہ ادب کا انتخاب کر ڈالا اور یونیورسٹی کھلنے کا انتظار کرنے لگا کیونکہ کہیں باہر نہ جانے کی وجہ سے طبیعت

چھٹیوں سے گھبرا گئی تھی۔ ۲۱ جون کو ڈاکٹر اعجاز حسین الہ آباد یونیورسٹی کا تار آیا کہ میں رات کو پہونچ رہا ہوں۔ اعجاز صاحب کا آنا ہمیشہ اسی طرح خوشگوار ہوتا ہے جیسے سخت گرمی میں برسات شروع ہو یا خزاں میں بہار آجائے اور واقعی وہ آئے تو بارش بھی ہوئی اور موسم بھی بدل گیا۔ دو تین دن دلچسپی رہی۔ ۲۳ جون کو شام کی ڈاک سے نیویارک سے خط آیا کہ مبارک ہو، فیلوشپ سال بھر کے لئے منظور ہوگئی۔ شروع ستمبر تک یہاں پہونچ جائیے، سفر کے انتظام کے معاملہ میں اگر مشورہ یا مدد کی ضرورت ہو تو ہمارے بنگلور کے آفس میں ڈاکٹر واٹسن کو لکھئے وہ آپ کی مدد کریں گے۔ ایک خط سکریٹری کی طرف سے تھا دوسرا مسٹر گل پیٹرک کی طرف سے، بہت ہی حوصلہ افزا اور شفقت آمیز۔ میں نے خط پڑھ کر اعجاز صاحب کی طرف بڑھا دیا اور پوچھا آپ کی کیا رائے ہے۔ پڑھ کر کہنے لگے رائے کیا ہے، اس میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں، ضرور جائیے۔ میں نے کچھ عذر پیش کئے، کہا، یہ سب بکواس ہے۔ مرزا جعفر حسین ایڈوکیٹ آگئے انھوں نے بھی یہی رائے دی اور ذرا دیر میں پروفیسر نجم الدین (رضا کالج رامپور) تشریف لائے انھوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا۔ ماں، بیوی، بھائی اور بچوں میں اس خبر کا ملا جلا خیر مقدم ہوا کیونکہ میرے فیصلہ نہ کرنے اور خوش نہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی کچھ اندازہ نہ تھا کہ کیا ہوگا۔ اور کیا ہونا چاہئے۔ بھائیوں نے کہا ضرور جائیے، بچوں میں اختلاف رائے ہوا، والدہ اور بیوی نے کہا جیسا مناسب سمجھو۔

دوسرے دن عید تھی، کچھ عزیز اور دوست ملنے آگئے، خبر ان لوگوں تک

پہونچی، تیسرے دن یونیورسٹی میں چرچا ہوا اور گویا یہ طے ہوگیا کہ مجھے جانا چاہیئے۔
دو تین دن کے اندر کئی دوستوں اور بزرگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ جانے کی
تیاریاں کرو وقت بہت کم ہے۔ نیویارک اور بنگلور دونوں جگہ سے خط آئے کہ
سفر پانی کے جہاز سے ہوگا اس لئے جگہ کا انتظام جلد ہونا چاہیئے تاکہ آپ ستمبر کے
شروع میں نیویارک پہونچ سکیں۔ پاس پورٹ کے لئے فوراً درخواست دے دیجئے۔
دو تین دن پھر گذر گئے اور میں نہ سمجھ سکا کہ کیا کروں۔ یونیورسٹی بند تھی، وائس چانسلر
اور ڈین دو میں سے کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے صرف یہ کیا کہ ٹامس کوک اینڈ کو
بمبئی خط لکھا کہ مجھے کسی ایسے جہاز میں جگہ چاہیئے جو ستمبر کے شروع میں نیویارک
پہونچ رہا ہو۔ اگر لندن ہو کر جانے کی صورت ہو تو بہتر ہے ورنہ پھر براہ راست امریکہ
وہاں سے جواب آگیا کہ ہمیں افسوس ہے ستمبر کے آخر تک لندن کے راستے سے
تمام جگہوں کے ٹکٹ فروخت ہو چکے ہیں اور براہ راست نیویارک کے لئے تو نومبر تک
ہم کسی جگہ کا انتظام نہیں کر سکتے۔ میں نے اس خط کی نقل ڈاکٹر واٹسن کو بنگلور
بھیج دی۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جاؤں گا، کبھی خیال ہوتا تھا کہ نہیں جاؤں گا۔
کبھی سوچتا تھا کہ نیویارک منظوری کا خط لکھ دوں کبھی ارادہ ہوتا تھا کہ معذرت
کر لوں لیکن کہیں سے بھی انکار کے لئے اخلاقی سہارا نہیں مل رہا تھا۔ جون کے
خاتمہ کے قریب بنگلور سے تار آیا کہ اگر آپ شروع اگست میں کو چین کے راستے
ہو کر ایک مال اور مسافروں کے ملے جُلے جہاز سے جانا پسند کریں تو مطلع کیجئے۔
میں نے تار دیا کہ اگر کوئی بہتر انتظام نہیں ہو سکتا تو مجھے منظور ہے۔ چند دنوں
میں جواب آگیا کہ اس وقت اِس کے سوا اور کوئی انتظام ممکن نہیں معلوم ہوتا

اس لئے آپ اگست کے شروع میں سفر کرنے کے لئے تیار رہئے ۔

اس طرح میرے لئے صرف ایک مہینہ رہ گیا اور اس ایک مہینے میں اپنی لاعلمی، ذرائع کی کمی اور تساہلی کے مقابلہ میں چند بہت بڑے بڑے کام انجام دینے تھے ۔ جہاز میں جگہ، پاسپورٹ، یونیورسٹی سے چھٹی لینا، گھر کی طرف سے اطمینان کرنا، عزیزوں سے ملنے کے لئے بعض جگہ جانا اور سامان سفر درست کرنا۔ بعض لوگوں کے لئے یہ باتیں معمولی ہیں میرے لئے مشکل تھیں ۔ جہاز میں جگہ کا مسئلہ کسی حد تک طے ہوگیا تھا یا کم سے کم اب اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں تھی ۔ پاسپورٹ کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ کتنے دن لگیں گے بلکہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ یونیورسٹی میں لکچرر ہوں، ایک دوسرے ملک نے فیلوشپ دے کر بلایا ہے، ایک امن پسند شہری ہوں مجھے پاسپورٹ بات کی بات میں مل جائے گا لیکن اس سلسلہ میں مجھے جس دشواری کا سامنا کرنا پڑا اور جس تحقیر کا احساس ہوا وہ دل شکن ہے ۔ یونیورسٹی بند ہونے کی وجہ سے چھٹی کے متعلق دشواری تھی ۔ بیوی اور چھوٹے بھائی کی طبیعت خراب تھی اس کے علاوہ خانگی زندگی کے چھوٹے موٹے کام جو چند دنوں کی غیر حاضری میں بھی مشکلیں پیدا کرتے ہیں، سال بھر کے لئے ٹھیک ہونے کی راہ دیکھ رہے تھے ۔ بعض عزیزوں سے ملنے جانا بے حد ضروری تھا کیونکہ ان کی محبت اور بزرگی کا تقاضہ یہی تھا۔ میرے پاس پیسے نہ تھے کہ کچھ کپڑے وغیرہ درست کرلوں ۔ یونیورسٹی سے قرض لینے کا خیال تھا مگر ابھی وائس چانسلر اور یونیورسٹی کے خازن صاحب موجود نہیں تھے ۔

ان باتوں کی تفصیلات سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن بعض باتوں کا

تذکرہ میری ذہنی کیفیت کے سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے اور اب جب سفر کا روزنامچہ لکھ رہا ہوں تو شائد یہ باتیں اس کی دلچسپ تمہید بن سکیں اس لئے لکھتا ہوں۔ شائد کبھی پلٹ کر خود ان دنوں کو دیکھنا چاہوں تو دیکھ تو سکوں کہ کس طرح آہستہ آہستہ ذہن ایک کام کے لئے ہموار ہوتا گیا۔ داخلی اور خارجی ترغیبات کی کشمکش کا یہ افسانہ خود مجھے اپنے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

فکریں

جولائی کی پانچویں یا چھٹویں کو مجھے اطلاع ملی کہ وائس چانسلر صاحب آگئے ہیں، اُن سے مل کر چھٹی کا مسئلہ طے کر لینا چاہئے۔ چنانچہ میں نے دوسرے دن دو عرضیاں لکھیں، ایک سال بھر کی چھٹی کے لئے اور دوسری قرض کے لئے۔ متعلقہ ارباب حل و عقد سے مل بھی گیا۔ چونکہ میں نے چودہ سال کی ملازمت میں کبھی کوئی چھٹی نہیں لی تھی، روپیہ قرض نہیں لیا تھا اس لئے بات جلد طے ہوگئی، بس دفتری کارروائی میں پانچ چھ دن کی دیر ہوئی۔ چھٹی کی طرف سے مطمئن ہو کر ۹ر جولائی کو میں نے پاسپورٹ کے لئے درخواست دی۔ حکم ہوا کہ کسی ایسے مجسٹریٹ سے اس کی تصدیق کرالاؤ جو تمھیں اچھی طرح جانتا ہو، مجسٹریٹ بھی محض عہدہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ وہ جو مجسٹریٹی کے فرائض بھی انجام دے رہا ہو۔ میں بدقسمتی سے اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جنھیں مجسٹریٹ یا پولیس افسروں سے ملنے کا شوق ہو، ایسے مواقع ملتے بھی ہیں تو میں اُن سے بچتا ہوں۔ خیر ایک دوست کو لے کر دو مجسٹریٹوں کے یہاں گیا، انھوں نے

مجبوری ظاہر کی اور کہا کہ ہمیں بار بار حکم دیا جا چکا ہے کہ جب تک ذاتی علم نہ ہو
پاسپورٹ کی درخواست پر دستخط نہ کریں ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جسے کہیں باہر
جانا ہو وہ کسی نہ کسی طرح پہلے ہی سے کسی مجسٹریٹ سے ذاتی تعلقات ضرور
پیدا کرے ورنہ یہ کیسے طرح ممکن ہے کہ پاسپورٹ کے لئے درخواست دینے والے
اور مجسٹریٹ میں ضرور دوستی ہو ۔ یہ فرد پر سرکاری گرفت مضبوط کرنے کے سوا اور کیا ہے؟
مجھے یہ بات نہایت توہین آمیز معلوم ہو رہی تھی اور فکر مند تھا کہ اپنی یونیورسٹی کے
پراکٹر ڈاکٹر سرکار کی طرف خیال گیا جو مجسٹریٹ بھی ہیں اور میں نے کاغذات کی
تصدیق کرالی ۔ دفتر کے لوگوں تک دو چار جاننے والوں کی سفارشیں پہونچائیں ،
کہ مجھے جلد ہی جانا ہے اس لئے اگر پاسپورٹ جلد مل جائے تو عنایت ہوگی ۔ ابھی
پاسپورٹ لے کر دہلی جانا اور وہاں سے ویزا حاصل کرنا تھا اس لئے اور عجلت تھی ۔
میں نے دہلی امریکی سفارت خانہ کو لکھا اُس کا جواب آیا کہ فلاں فلاں کاغذات لے کر
خود آؤ ۔ ضروری کاغذات میں تین فوٹو پاسپورٹ اور پولیس کا چال چلن کا سارٹیفکیٹ
بھی تھے ۔ یہ ہدایت بھی تھی کہ کم سے کم تین دن کے لئے آنا چاہئے طبی معائنہ ہو گا
اور سو روپیہ فیس کے داخل کرنے ہوں گے ۔

یونیورسٹی کھل چکی تھی ۔ آتے جاتے میں کچہری میں پاسپورٹ کے متعلق پوچھ لیا
کرتا تھا ، آج معلوم ہوا کہ ابھی سی آئی ڈی کی رپورٹ نہیں آئی ، چند دنوں کے بعد
معلوم ہوا کہ آئی ہے مگر ناقص ہے پھر واپس بھیجی جا رہی ہے ، پھر معلوم ہوا کہ کچھ پتہ
نہیں کاغذات کہاں ہیں ۔ اس درمیان میں میری یہی فکریں تھیں ، چیچک اور کالرہ
کے ٹیکے لگوا کر سرٹیفکیٹ لینا ، پاسپورٹ حاصل کرنا ، دوستوں سے ملنا جلنا ، کچھ

خرید و فروخت ۔ مجھے اتنی مصروفیت کا احساس اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا،
اپنے متعلق اتنی بے اعتمادی اور ناواقفیت کا احساس بھی کبھی اتنا نہیں ہوا تھا۔
عزیزوں کے تقاضے پر تقاضے آرہے تھے کہ بغیر ملے ہوئے نہ جانا، ان لوگوں کا
اکٹھا ہو کر لکھنؤ آنا مشکل تھا، میرا تنہا جانا آسان تھا، میں نے لکھا کہ ضرور آؤں گا۔
خریداری کے متعلق میرا عجب رویہ رہا ہے، بالعموم میں اس سے بچتا ہوں یہاں تک
کہ اگر مجھے جوتا بھی خریدنا ہے تو اقتدار سے کہہ دوں گا کہ میرے لئے ایک جوڑ جوتا
لیتے آنا، اس دفعہ خود اس کے اصرار پر مارا مارا پھرا۔
پاسپورٹ نہ جانے کس منزل میں تھا کہ میں تین دن کی رخصت لے کر عزیزوں
سے ملنے کے لئے وطن چل دیا۔ ماہل، اعظم گڈھ کے ضلع میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے
جو میرے بچپن میں بہت بارونق معلوم ہوتا تھا لیکن اب اجاڑ سا نظر آتا ہے تاہم
اس ویرانے سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں جن کا بدل کوئی اور زندگی، زندگی
کی کوئی پُرمسرت گھڑی نہیں ہو سکتی۔ اب بہت کم وہاں جانا ہوتا ہے لیکن اب بھی
وہاں جانا اتنی ہی آسودگی بخشتا ہے جتنی ماں کی محبت بھری آغوش۔ وہاں پہونچا
تو معلوم ہوا کہ میرے "اعزاز" میں گاؤں کی پنچایت کا جلسہ ہوگا، مجھے ایڈریس
پیش کیا جائے گا اور بچوں کو مٹھائیاں تقسیم ہوں گی! آخر کیوں؟ میں نے کون سی
جنگ فتح کی ہے؟ کون سی عزت حاصل کی ہے؟ اپنے ہم وطنوں کی کون سی خدمت
کی ہے؟ کچھ نہیں۔ پنچایت کا فیصلہ ہے کہ یہ سب کچھ ہوگا۔ میرا بچپن کا ساتھی اور
عزیز دوست فصیح پنچایت کا صدر ہے، میں جانتا ہوں کہ اس میں اُسی کا ہاتھ ہے،
اُسے رنجیدہ نہیں کر سکتا تھا، ہر طرف ایسی آمادگی تھی کہ سر جھکا دینے کے سوا

میرے لئے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ دوستوں، عزیزوں، اور ہم وطنوں کی یہی خواہش تھی مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ لمحہ میرے لئے زبردست جذباتی آزمائش کا لمحہ ثابت ہوگا ورنہ اُس کے لئے کبھی آمادہ نہ ہوتا یا ہوتا بھی تو سوچ سمجھ کر۔

جلسہ ہوا اور پرائمری اسکول کی اُس عمارت میں ہوا جس کی گرد میرے جسم میں بھی پیوست ہو چکی ہے۔ سامنے ایک بڑا مجمع تھا جس میں سبھی تھے، ہندو مسلمان، برہمن اور اچھوت، سیّد اور چمار، چھوٹے اور بڑے۔ کچھ جنھیں میں پہچانتا تھا، کچھ جن سے ناواقف تھا، سبھوں کی آنکھوں میں حیرت اور مسرت کی جھلک تھی۔ پھول اُچھل رہے تھے، باجے بج رہے تھے، بچّے تالیاں بجا رہے تھے کہ ایڈریس پڑھا گیا۔ بہت ہی محبت آمیز اور فخر انگیز جملے تھے اور مجھے جواب دینا تھا۔ میں نے بہت سے مجمعوں کے سامنے تقریریں کی ہیں لیکن مجھ پر یہ کیفیت کبھی طاری نہیں ہوئی۔ کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہ سکتا تھا۔ میرا گلا رندھ گیا اور چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ! اور میرے مُنہ سے آواز نہ نکلی، نہ جانے کہاں کی یادیں اُبل پڑی تھیں، سامنے بوڑھے پنڈت جی بیٹھے مجھے دیکھ رہے تھے جنھوں نے اسی اسکول میں کبھی مجھے پڑھایا تھا، بوڑھوں کے بے رونق اور فاقہ زدہ چہرے تھے، میلے کچیلے لباس میں کمزور اور لاغر بچّے تھے، حیرت سے کھُلی ہوئی سیکڑوں آنکھیں تھیں اور میرا ذہن ہزاروں تصویریں بنا بنا کر مٹا رہا تھا۔ میرے لئے یہ محبت کیوں ہے! میں نے اس گاؤں کے لئے، اپنے اس وطن کے لئے، ان بھوکے اور اَن پڑھ لوگوں کے لئے کیا کیا ہے، میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ محبت مجھ پر قرض رہے گی۔ مجھے یونیورسٹی کی کرسی،

راک فیلر فاؤنڈیشن سے ملا ہوا اعزاز، رسالوں میں چھپی ہوئی تعریفیں، سب اس بے پناہ اور پُر خلوص محبت کے سامنے ہیچ معلوم ہو رہی تھیں۔ اتنے میں کسی نے میرے قریب ہی ٹھنڈی سانس بھر کر میرے والد مرحوم کا نام لیا اور کہا کاش وہ زندہ ہوتے! میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی اور ہچکیاں گلے میں پھنسنے لگیں سخت آزمائش تھی اور میں بالکل طوفان کی زد پر کھڑا تھا۔ شائد کوئی میری تنگ ظرفی پر ہنسے لیکن مجھے کوئی پروا نہیں، یہ اعزاز، محبت کی یہ سند جسے مل جائے اُسے کچھ اور نہیں چاہیئے! محبت کے آنسوؤں کے سوا کوئی چیز اس کی قیمت قرار نہیں پا سکتی! میں نے کسی طرح مختصر سی تقریر کی، جلسہ ختم ہوا، سب نے مٹھائیاں کھائیں اور میں جتنے لوگوں سے مل سکا ملا۔

دوسرے ہی دن رخصت ہوا۔ سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے، میرے بعض عزیز اور دوست چھوٹے چھوٹے زمیندار ہیں (بلکہ تھے کہنا چاہیئے) ابھی چند دن ہوئے زمینداری کے خاتمہ کا اعلان ہوا تھا، میں دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہروں پر تاریک اور نامعلوم مستقبل کی پیدا کی ہوئی فکر آلود شکنیں ہیں جنھیں میں اپنی باتوں سے مٹا نہیں سکتا تھا کسی نے آنسو بہائے، کسی نے گلے لگایا، کسی نے نصیحت کی، کسی نے دعائیں دیں اور میں اپنی بیمار پھوپھی سے ملنے ایک اور جگہ چلا گیا۔

بچپن میں میں پھوپھی اور پھوپھا کے ساتھ رہا اور انھیں کو ماں باپ سمجھتا رہا اب بھی نہ مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ وہ لوگ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں اور نہ اس کا کہ میرے دِل میں اُن کی کتنی محبت اور عزت ہے! پھوپھا صاحب

ضعیفی کے باوجود مجھ سے ملنے مائل آ گئے تھے، وہ بھی ساتھ تھے رات کو اترڈیہہ (ضلع جونپور) پہونچا۔ پھوپھی اور بہن سے رخصت ہو کر دوسرے دن لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گیا، کھویا ہوا اور بے دلی کا شکار۔

لکھنؤ پہونچا تو بنگلور سے میرے سفر کا انتظام کرنے والے ایجنٹ ایم موہن اینڈ کو کا خط ملا کہ اب آپ کا جہاز غالباً ۱۵ اگست کو جائے گا۔ مجھے قدرے سکون ہوا کیونکہ جولائی کی ۲۵ ، ہو چکی تھی اور پاسپورٹ کا پتہ نہ تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا چھان بین ہو رہی تھی۔ سرکاری اور غیر سرکاری طریقوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ دیر ہونے کی کیا خاص وجہ ہے تو بس اتنا ہی پتہ چلا کہ تحقیقات ہو رہی ہے۔ آخر کار جولائی کی آخری تاریخوں میں معلوم ہوا کہ کاغذات صوبہ کی حکومت کے پاس پہونچ گئے وہاں سے پتہ لگائیے۔ اب صوبہ کی حکومت کے دفتر کے چکر شروع ہوئے۔ شائد تفصیلات کا لکھنا مناسب نہ ہو لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت ہند کو اس بات کا واضح اعلان کر دینا چاہیئے کہ جن کے متعلق اس اس قسم کی شکایات ہوں گی انھیں ملک سے باہر نہیں جانے دیا جائے گا تاکہ جو لوگ جانا چاہتے ہیں وہ اندازہ لگا لیں کہ انھیں پاسپورٹ ملے گا یا نہیں۔ خدا خدا کر کے ۱۰ اگست کو پاسپورٹ ملا۔ پاسپورٹ تو پاسپورٹ، پولیس کا ایک معمولی سا چال چلن کا سارٹیفکٹ بھی اس مشکل سے دستیاب ہوا ہے کہ میں ہی جانتا ہوں اور اس سلسلہ میں بھی جو تجربے ہوئے وہ دلچسپ بہت ہیں لیکن اس موقع پر ان کا بیان کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ شاید پھر کبھی موقع آئے۔ اب مجھے ویزا کے لئے دہلی جانا تھا، میں نے بنگلور تار دے کر جہاز کی تاریخ پوچھی تو

وہ ۴ ستمبر ہو گئی تھی ساتھ ہی مفصل خط ملا کہ اب یہ قطعی ہے۔ سفر کی تاریخوں کی یہ آنکھ مچولی بھی کتنی پریشان کن تھی!

اب جن لوگوں سے ملاقات ہوتی تھی بس یہی ذکر تھا کہ کب تک جا رہے ہو۔ کوئی سمندر کے سفر کے متعلق گُر کی باتیں بتاتا تھا، کوئی امریکہ کے قیام کے متعلق، کوئی لباس کے بارے میں رائے دیتا تھا کوئی ضروری سامانِ سفر کے بارے میں۔ کئی دوستوں نے سنجیدگی سے سمجھایا کہ دوسرے ملکوں میں اظہارِ خیال میں احتیاط برتنا۔ بہرحال ذہن سفر کے خیال سے بھر چکا تھا اور اگر دماغی کیفیت کو بھی سفر میں شامل کر لیا جائے تو سفر شروع ہو چکا تھا۔ لوگوں سے ملنے جُلنے، جلسوں اور پارٹیوں میں شریک ہونے کی وجہ سے بچوں میں رہنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا وہ اس کے شاکی تھے اور مجھے خود بھی احساس تھا کہ میں ابھی سے ان لوگوں سے دُور ہوتا جا رہا ہوں۔

میں نے امریکہ کے سفارت خانہ (دہلی) کو خط لکھا کہ میں ۱۰ راگست کو ویزا لینے کے لئے آرہا ہوں وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا اور میں اپنی اطلاع کے مطابق پہونچ گیا۔ اُس دن ویزا نہ مل سکا۔ وائس کونسل نے کہا کہ ہم ایک ہفتہ سے پہلے نہیں دے سکتے ہیں۔ میں نے کہا میں ٹھہر نہیں سکتا اور نہ ایک ہفتہ بعد آسکتا ہوں، اب میں یہ کر سکتا ہوں کہ کوچین دہلی ہوتا ہوا جاؤں اور ۲۹ راگست کو آکر ویزا لے لوں چنانچہ یہی پروگرام طے ہو گیا۔ میں تین دن تک دہلی میں لوگوں سے ملتا رہا۔

لکھنؤ واپس ہوا تو اقتدار کی طبیعت اچھی خاصی خراب تھی، بیوی کے یہاں بچہ پیدا ہوا تھا اور میں فکر میں غرق! دوست دعوتیں دے کر اور مل کر محبت کا ثبوت

دے رہے تھے، طلباء الوداع کہنے کے لئے پارٹی دینا چاہتے تھے اور میں اس قدر تھکن، کمزوری اور ذہنی خلا محسوس کر رہا تھا کہ جبراً سب کچھ کئے جا رہا تھا اور روح مُردہ ہوتی جا رہی تھی۔ فکر کے بادل گھرے ہوتے جا رہے تھے اور ذہن پر ایسی گھٹا چھا رہی تھی جو نہ کھلتی تھی نہ برستی تھی۔ منزل وہ تھی کہ جہاں یہ فیصلہ کرنا بھی تقریباً ناممکن ہوگیا تھا کہ جانے سے انکار کر دُوں۔

جب سفر کے متعلق غور کرتا ہوں تو اپنی بعض دلچسپ ذہنی کیفیات کا پتہ چلتا ہے۔ میں سفر سے بہت خوش ہوتا ہوں، سفر کرنا چاہتا ہوں لیکن اُس کے لوازم سے گھبراتا بھی ہوں، مجھے ہمیشہ سفر کا ارادہ کرنے میں دیر لگتی ہے لیکن سفر کو انسانی تجربہ کی تکمیل کے لئے ضروری خیال کرتا ہوں۔ قرآن مجید میں خدا کی زمین پر چلنے پھرنے، اسلامی تاریخوں میں تجربہ اور حصولِ علم کے لئے سفر کرنے کے متعلق جو ہدایتیں ہیں میں نے اُنھیں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس کے متعلق مفکرین کے جو اقوال اور شعرا کے جو خیالات ہیں انھوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے لیکن پھر بھی میں اُس کی تکالیف سے گھبراتا رہا ہوں۔ مجھ میں مارکوپولو اور ابنِ بطوطہ، کولمبس اور واسکوڈی گاما کی حوصلہ مندی کا دُور دُور تک پتہ نہیں ہے، میں موجودہ دور کے سفر کی آسانیوں سے واقف ہوں پھر بھی اُلجھتا ہوں اور سفر کرنا بھی چاہتا ہوں۔ یہ باتیں عجیب اور متضاد معلوم ہوتی ہیں لیکن انھیں سے انسان کی شخصیت اور اس کی گُتھیوں کا انکشاف ہوتا ہے۔

میں امریکہ اور یورپ جا تو رہا ہوں مگر کس حیثیت سے؟ کیا میں بیرونی ممالک میں ہندوستان کی، ہندوستان کی کسی جماعت کی کسی گروہ کی نمائندگی کا حق

رکھتا ہوں؟ نہیں، کیا میں اردو ادب کا سفیر ہوں؟ نہیں، کیا میں ہندستان کی تہذیب کا ترجمان ہوں؟ نہیں۔ پھر میری حیثیت کیا ہے؟ ایک طالب علم کی جو اپنے علم اور تجربہ کو وسعت دینے، ایک خاموش تماشائی کی طرح دوسری تہذیبوں کا مطالعہ کرنے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرنے اور جس حد تک ممکن ہو انصاف پسندانہ طور پر دوسری قوموں اور لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے جارہا ہے۔ اُسے یہ یقین نہیں ہے کہ وہ بہت کچھ سیکھے گا، اُسے یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ بہت جچی تُلی رائے قائم کرے گا، اُسے یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ وہ امریکہ یا انگلستان میں ہندوستان کا پایہ بلند کرے گا لیکن اُسے اپنے اوپر یہ بھروسہ ضرور ہے جہاں تک ہو سکے گا وہ جذبات پر قابو رکھ کر انصاف پسندانہ حقائق کا مطالعہ کرے گا اور اگر وہاں کچھ سیکھے گا تو اپنے پاس چھپا کر نہیں رکھے گا بلکہ اُس میں اپنے ملک کو بھی شریک کرے گا۔ مگر ابھی تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ اجنبی دیس میں جا کر کیا کھوتا ہے اور کیا حاصل کرتا ہے اور اُس کی اُفتادِ طبیعت اُس سے کیا مطالبے کرتی ہے!

سفر کے اٹھارہ دن

۲۹ر اگست ۱۹۵۲ء جمعہ

آج دہلی میں تقریباً سال بھر کے لئے شروع ہونے والے سفر کی ڈائری شروع کر رہا ہوں، دیکھوں جو یہ سلسلہ قائم رہ جائے۔ اس اچانک شروع ہونے والی ڈائری کے لئے ایک تمہید کی ضرورت ہے، وہ میرے ذہن میں محفوظ ہے، کسی دن لکھ لوں گا۔

لکھنؤ اور دہلی کے درمیان فاصلہ ہی کتنا ہے لیکن آج کا دن کل سے بہت مختلف ہے۔ کل جب لکھنؤ میں تھا تو ذرا دیر کے لئے یونیورسٹی گیا، چند ہی ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے وقت میرے عزیز شاگرد ڈاکٹر محمد حسن نے لال باغ کے ایک خوبصورت ریسٹران میں چائے پلائی اس صحبت کی دلچسپ چیز مجتبیٰ سلام مچھلی شہری کی ایک ناصحانہ نظم تھی جس میں دونوں باتوں کی تلقین کی گئی تھی، امریکہ جاکر بدل نہ جاؤں اور آنکھیں بند کئے ہوئے جیسا

جاؤں ویسا ہی واپس نہ آؤں۔ مجھے یقین ہے کہ نظم محبت اور خلوص سے لکھی گئی تھی۔ بعض احباب سے وہاں رخصت ہوا، بعض نے اسٹیشن تک آنے کا وعدہ کیا۔ مگر پھر بھی لوگ ملنے کے لئے آتے رہے اور چلتے چلاتے آگے آنے والے دنوں کے متعلق سوچنے کا وقت نہ ملا۔ ساڑھے آٹھ بجے اسٹیشن چلا۔ ماں بہن، بیوی بچوں، چچا، بھائیوں، عزیزوں اور دوستوں سے رخصت ہونا بہت صبر آزما تھا، بے حد، مگر میں نے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اسٹیشن پر بہت سے عزیز اور دوست تھے، بہت سے عزیز طلباء تھے۔ ان سب کی محبت میں شک نہیں لیکن مجھے اپنی اہمیت کے احساس کے بجائے شرم کا احساس ہو رہا تھا۔ ایاز نے کبھی اپنی قدر پہچانی ہو یا نہیں، میں تو پہچانتا ہوں کہ میں کیا ہوں! گاڑی چھوٹ گئی اور لکھنؤ سال بھر کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دور چل کر سر باہر نکال کر دیکھا تو اندھیرے میں لکھنؤ پہچانا بھی نہیں جاتا تھا، صرف قرب کا احساس تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے بیتے لمحوں پر نگاہ کی تو عزیزوں کی بھیگی ہوئی آنکھیں اور اُداس چہرے نظر آئے، خوشی اور غم کے آنسوؤں سے دُھلے ہوئے۔ غم زیادہ اور خوشی کم۔ خود میں نے اپنے جذبات کو تولا تو غم ہی زیادہ تھا۔

آج صبح سے دہلی میں ہوں۔ خورشید (ایک عزیز جو دہلی سکریٹریٹ میں ہیں) کے یہاں نہیں گیا بلکہ دِلّی کالج پہونچا۔ فرقت صاحب (غلام احمد فرقت مصنف مد اوا اور نا روا) اور اسد (مہدی عباس حسینی) وہیں ہیں اُن کا ملنا یقینی تھا۔ نہا دھو کر امریکی سفارت خانے ویزا کے لئے چل دیا۔ انھیں

لکھ چکا تھا، تار دے چکا تھا، بنگلور سے ڈاکٹر والسٹن کا خط پہونچ چکا تھا کہ آج
ویزا ضرور ملنا چاہیئے چنانچہ کچھ دیر کاغذات کی خانہ پُری کے بعد ویزا مل گیا۔
دو باتوں نے ضمیر اور خودداری کو ضرور مجروح کیا۔ ایک فارم پر دستخط کرنے پڑے
کہ کسی فاسسٹ یا کمیونسٹ جماعت سے تعلق نہیں اور ہاتھوں کی دسوں انگلیوں
کے نشان دو تین جگہ مختلف شکلوں میں دینے پڑے ممکن ہے اور جگہوں پر بھی ایسا
ہی ہوتا ہو لیکن مجھے یہ بات کچھ غیر شریفانہ سی معلوم ہوتی ہے۔ میرے ذہن میں
انگوٹھے کا نشان کچھ جہالت اور جرائم سے متعلق ہو گیا ہے۔

ویزا سے فارغ ہو کر کناٹ سرکس چلا گیا کہ بنگلور تار دے کر جہاز کی روانگی
کی صحیح تاریخ معلوم کر لوں کیونکہ لکھنؤ ہی میں ایک اُڑتی سی خبر ملی تھی کہ تاریخ پھر
بدل گئی ہے۔ تار دے دیا اور فرصت کا احساس ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں دہلی آیا
تھا تو یہاں کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا تھا، اب نقش دھندلے بھی ہو چکے ہیں اور
تصویروں کے خاکے بدل بھی چکے ہیں، جی چاہتا ہے پھر دیکھ ڈالوں مگر طبیعت
میں اُمنگ نہیں۔ شمیم بھائی (جناب شمیم کرہانی میرے عزیز جو دہلی کالج میں پڑھاتے
ہیں) کے یہاں گیا، شاہراہ کے دفتر گیا، حالی پبلشنگ ہاؤس میں حاضری
دی، خورشید کو لے کر دہلی کالج پہونچا، کچھ ملنے والے اکٹھا ہو گئے اور وقت کٹ گیا
اور یہ سفر کا پہلا دن تھا۔

۳۰ / اگست سنیچر ۔ بنگلور سے تار آگیا کہ جہاز ۹ / ستمبر کو کوچین بندرگاہ سے
روانہ ہوگا۔ مدراس کا ٹکٹ خرید چکا تھا، جا کر تاریخ بدلوائی اور طے کیا کہ تین
چار دن دلّی ہی میں گذار دوں گا۔ لوگوں سے ملتا جلتا رہا۔ رات کو انڈیا چائنا

فرنڈشپ ایسوسی ایشن کے مشاعرے میں شرکت کی۔ حضرت جوشؔ،
جگن ناتھ آزادؔ، علی سردار جعفری، جذبیؔ، وامقؔ، نریش کمار شادؔ،
فکرؔ تونسوی، مخمورؔ جالندھری، تاباںؔ، شفیق نقوی، جامعہ کے کئی دوست
سبھی اکٹھا مل گئے، مشاعرہ تو اچھا نہیں ہوا، وقت اچھا گذرا۔

۳۱، اگست اتوار - آج بھی ملنا ہی جلنا رہا۔ قاضی معزالدین (آزاد
کتاب گھر دہلی) سے اپنی کتاب تنقید اور عملی تنقید کے جلد شائع کرنے کا
اور حالی پبلشنگ ہاؤس والوں سے ۱۹۵۱ء کا منتخب ادب جلد چھاپنے کا
تقاضا کیا۔ احمد حسین الہ آبادی (جو پی ٹی آئی میں ہیں) کے یہاں دوپہر کا لذیذ
کھانا کھایا۔ احمد کو میں بائیس سال سے جانتا ہوں جب وہ چھوٹے سے
تھے۔ قد کے لحاظ سے تو چھوٹے اب بھی ہیں لیکن عقل بڑوں کو سکھاتے ہیں۔
ایک زمانے میں لاابالی معلوم ہوتے تھے مگر اب ایک اچھے شوہر اور اچھے باپ
کی حیثیت سے ذمہ دارانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج بھی شمیم بھائی کے یہاں
گیا۔ ہنس راج رہبر بیمار ہیں انھیں دیکھنے گیا۔ کل جوشؔ صاحب سے ملنے
نکلوں گا اور جامعہ میں حاضری دوں گا۔

یکم ستمبر دوشنبہ - آج بقرعید ہے کل ہی سے مسلمانوں کے محلّوں میں غیر معمولی
چہل پہل نظر آرہی تھی آج تو جامع مسجد، چتلی قبر، کلاں محل، ترکمان دروازہ
وغیرہ کی طرف غیر معمولی ہجوم ہے۔ لیکن مجھے کیا کرنا ہے۔ صبح سے پیچش شروع
ہوگئی اور میں پڑے رہنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ خورشید کے یہاں آکر
لیٹ گیا ہوں۔ کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اُلجھن ہے کہ سفر پر روانہ

ہونا ہے اور یہ پیچش ——— ! لوگوں سے ملنے جلنے کا پروگرام ختم - نہ جامعہ ، نہ جوش صاحب !

۲ ستمبر منگل — بہت تکلیف ہے - اپنی آزمائی ہوئی دوائیں استعمال کی ہیں لیکن کوئی فائدہ نہیں — لکھنؤ خط لکھا ہے لیکن اس کا تذکرہ نہیں کیا ، وہ لوگ پیچش کی حالت میں میری تکلیف سے واقف ہیں بہت پریشان ہو جائیں گے۔ آج بالکل نکلا ہی نہیں ، کچھ لوگ ملنے کے لئے خورشید ہی کے یہاں آ گئے۔ خورشید اور حسن مہدی (میرے عزیز دلی کالج میں تاریخ کے استاد) میری وجہ سے پریشان ہیں۔

۳ ستمبر بدھ — صبح سے یہ خیال ذہن میں دھنستا جا رہا تھا کہ آج شام کو روانہ ہو جانا ہے اور پیچش کو آج تیسرا دن ہے - اس بیماری نے مجھے نکما بنا دیا ہے ، بہت کم لوگ یقین کریں گے کہ معدے کا مریض محض " نصف انسان " رہ جاتا ہے۔ کئی دوائیں استعمال کیں ، تکلیف میں کمی ہے مگر طبیعت بہت سست ہے - آج لکھنؤ کا خیال بہت آ رہا ہے - عزیزوں کا ، بیوی بچوں کا ، دوستوں کا اور بے نام دھندلی یادوں کا - خیالات بھی بھٹک رہے ہیں - میں کیوں جا رہا ہوں اور کہاں ؟ کہیں صرف اس لئے تو نہیں جا رہا ہوں کہ دنیا یہ نہ کہے موقع ملا اور کھو دیا ! بہ ظاہر مجھ میں کوئی حوصلہ نہیں معلوم ہوتا ! اصل وجہ یہ ہے کہ ابھی میرے سامنے مقصد واضح نہیں ہے -

بیماری کی وجہ سے پڑے پڑے چودھری کی THE BIOGRAPHY OF AN UNKNOWN INDAN پڑھ ڈالی ، آج کل جسے دیکھو اُس کا ذکر کر رہا ہے - جو حصے بنگال سے ، مصنّف کی نجی زندگی اور قریبی ماحول سے

متعلق ہیں وہ بہت اچھے ہیں، جہاں سیاسیات، کلچر، فوجی مسائل کا ذکر ہے اُس نے متاثر نہیں کیا۔ سوانح عمری میں بے جا قسم کی علمیت کا اظہار مناسب نہیں۔

رات ہو رہی ہے اور میں دہلی سے باہر نکل چکا ہوں۔ ابھی نئی دہلی سے گذرا، وہ پُرانا قلعہ تھا، وہ سامنے ہمایوں کا مقبرہ اور وہ دُور پر قطب مینار۔ وہ فرید آباد کا نیا شہر۔ سورج بالکل ڈوب رہا ہے اس فضا میں سورج کے ڈوبنے کا خیال انگریزی سامراج کے سورج کے ڈوبنے تک ذہن کو لے گیا۔ اِس دہلی کے افق پر بہت سے سورج ڈوب چکے ہیں اور بہت دنوں کے بعد اب یہ ایک "آزاد جمہوریہ" کا صدر مقام ہے۔ پھر مجھے اندھیرے کا خیال کیوں آ رہا ہے!

ابھی اڑتالیس گھنٹے گذر کر مدراس پہونچنا ہے، متھرا، آگرہ، جھانسی سب سے گذر کر صبح ہوگی۔

۱۴ ستمبر جمعرات — (دہلی اور مدراس کے درمیان) رات نیند نہیں آئی۔ پیچش نے پیچھا نہیں چھوڑا، مسافر وہی رہے جو دہلی میں ساتھ ہوئے تھے، اِن سے کیا باتیں کروں! کھانے پینے میں جی نہیں لگا، کتابوں نے متوجہ نہیں کیا۔ دوائیں، کیلے، چاول اور دہی کھاتا رہا، ٹائم ٹیبل اور بیرونی ممالک، خاص کر امریکہ کے نقشے دیکھتا رہا۔

اِٹارسی سے نکل کر "دھارا کھوہ" میں دو انجن لگے، آگے چھ سات سرنگیں ملیں۔ جنگل اور پہاڑ، اُن کی عظمت اور حُسن۔ مگر اِن پہاڑوں نے کتنی زمین پر قبضہ کر رکھا ہے! کیا انسان ان کے سامنے بے بس ہے؟ مگر نہیں ابھی کچھ دیر پہلے بھوپال سے پچیس تیس میل نکل کر دیکھ چکا ہوں کہ پہاڑیوں کے سینے شق

گئے جا رہے ہیں، مشینیں، جنھیں انسان نے جنم دیا ہے، برابر پہاڑوں کے پُرزے اُڑا رہی ہیں، کوہساروں کے اندر کٹتی ہوئی سیکڑوں میل کی راہ چل کر کون ہے جسے انسانی محنت اور قوّت کا احساس نہ ہوتا ہوگا!

دن بھر مناظر کم و بیش یکساں رہے۔ چھوٹی بڑی پہاڑیاں، کہیں چٹانیں کہیں مٹّی کے تودے، جنگل اور جھاڑیاں، برسات کی وجہ سے سبزہ کی فراوانی، چھوٹے بڑے بے ترتیب کھیت اور جوش کے الفاظ میں کھیتوں کے درمیان ترشی ہوئی راہیں، سنگترے اور موسمبی کے باغ، عورتوں کے لباس میں رنگینی اور شوخی۔ یہاں زمین کا رنگ بھورا اور مٹیالا مُردہ سا نہیں، سرخ یا سیاہ ہے، ناگپور پہونچتے پہونچتے سورج ڈوبنے لگا۔ یہاں کئی سال پہلے کی ایک اُردو کانفرنس کی شرکت یاد آگئی، پھر اُردو زبان کا خیال آیا۔ میں سال بھر کے لئے اُردو کی اس مہم سے دُور جا رہا ہوں جس سے میری بھی گہری وابستگی ہے۔ واپس ہوں گا تو یہ جد و جہد کسی اور منزل میں ہوگی۔ کچھ بھی ہو، اُردو زندہ رہے گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ بیرونی ممالک میں اُردو کے متعلق لوگوں کا کیا خیال ہے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن ایک نامعلوم مٹیالی سی بیدلی کی کیفیت ذہن کے اندر رینگ رہی ہے اور ایک ایسے جذبے کا سامنا ہے جو اس شکل میں پہلے کبھی میرے اندر پیدا نہیں ہوا تھا۔ شائد اس لئے کہ پہلی دفعہ اتنے طویل سفر پر جا رہا ہوں، یا شائد اُس لئے کہ بیمار ہوں یا شائد اس لئے کہ ضمیر میں کشمکش ہے!

۵ رستمبر جمعہ۔ (مدراس کے قریب پہونچتے ہوئے) رات کسی وقت ٹرین ریاست حیدرآباد کے حدود میں داخل ہوئی اور صبح آٹھ بجے کے قریب آندھرا دیش میں

یوں تو آندھر دیش جس کے بننے کی جد وجہد جاری ہے[۱] حیدر آباد میں داخل ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے لیکن صوبہ مدراس میں بیجواڑہ ایک اہم تلگو شہر ہے۔ صبح سویرے ہی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر "اِسٹالین اسٹالین" کی آوازیں سُنائی دیں، آنکھ مل کر دیکھا تو بوندیں پڑ رہی تھیں اور ایک دس گیارہ سال کا لڑکا اسٹالین کی سوانح عمری بیچ رہا تھا، گویا وہ آنے والوں کو بتا رہا تھا کہ یہ تلنگانہ ہے!

آج مناظر کل کے مقابلے میں بدلے ہوئے تھے۔ پہاڑیوں کی جگہ مسطح علاقے، کہیں کہیں پتھریلی زمین، چٹانیں یا چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، مگر زیادہ تر سرسبز اور شاداب علاقہ۔ سرخ اور سیاہ زمین، جن کی زرخیزی معمولی ہل بیل سے بھی بہت کچھ اُگاتی ہے۔ میلوں تک تاڑ اور کھجور کے علاوہ دھان، مونگ پھلی، ہلدی اور سرخ مرچ کے کھیت۔ گاڑی کے ایک ساتھی نے جو آندھر کے رہنے والے ہیں اور ابھی سوار ہوئے ہیں، بتایا کہ اس زمین میں روئی بہت اچھی ہوتی ہے لیکن مونگ پھلی اور تمباکو سے آمدنی زیادہ ہوتی ہے اس لئے اب کسان ادھر ہی متوجہ ہیں۔ پھر بھی کہیں کہیں میلوں تک دھان کے کھیت نظر آئے۔ پھر یہ ہر سال مدراس میں قحط کیوں؟ شاید بارش کے سہارے بیٹھے رہنے کا انجام ہے۔ بیجواڑہ سے نکلتے ہی کرشنا ندی اور اس کی شاندار نہر بکنگھم نے اس علاقہ کو بہت شاداب بنا رکھا ہے۔ آگے چل کر وہ بات نہ رہی، میلوں تک بنجر علاقہ ملا، حالانکہ ٹرین کے ساتھی نے کہا تھا اگر بنجر زمین دکھائی دے تو سمجھنا کہ اس زمین کے لئے جھگڑا ہے۔ ٹرین سے

---

[۱] اور جو اب ادھورا سا صوبہ بن چکا ہے۔

دُور دُور تک گندے گندے گاؤں دکھائی دیے۔ جھونپڑیاں ہر گاؤں میں کم سے کم پچانوے فیصدی معلوم ہوتی تھیں۔ کہیں بیچ میں اکّا دُکّا پکّے مکان مگر لباس سے یہاں کے لوگ غریب نہیں معلوم ہوتے۔ مرد دھوتی کُرتے اور پگڑی میں، عورتیں رنگین ساریوں میں، زیادہ تر ننگے پاؤں۔ مگر اس چلتی ہوئی ریل سے کیا اندازہ لگا سکتا ہوں! ٹرین کے ساتھی نے ایک پہاڑی پر ٹوٹے ہوئے قلعہ کے نشانات اور ان کے درمیان ایک سفید مسجد دکھائی جو وِجے نگر کے کسی ہندو راجہ نے بنوائی تھی، واللہ اعلم۔

آندھر یونیورسٹی میڈیکل کالج کے پانچویں سال کے ایک طالب علم سے اُردو کے متعلق باتیں ہوئیں اُس نے بتایا کہ اس علاقہ کے تمام مسلمان اُردو بولتے ہیں، بعض اسکولوں میں اور کچھ کالجوں میں اُردو کا انتظام ہے۔

میں یہ لکھ رہا ہوں اور مدراس قریب آتا جا رہا ہے۔ تین ساتھی جو دہلی سے ساتھ ہیں یہاں سے الگ الگ راہوں پر چل کھڑے ہوں گے۔ ایک سردار جی ہیں جنھوں نے کئی سال فوجی تاریخ نویسی کے محکمہ میں کام کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوا کہ دوسری جنگ عظیم میں ہندوستانی فوجوں کے کارناموں پر ہندوستانی حکومت کی طرف سے لکھی ہوئی کتاب THE EASTERN EPIC کی پہلی جلد شائع ہو گئی ہے جسے کامپٹن میکنزی نے ناول کے انداز میں لکھا ہے۔ میکنزی کو اچھی خاصی رائلٹی ملے گی، اخراجات دیے جا چکے ہیں۔ پوری کتاب بتّیس [۳۲] جلدوں میں ہوگی۔ اللہ اکبر! ہندوستانی فوجوں کے اتنے شاندار کارنامے! دوسرے صاحب ہیں پنجابی، بیوی اور دو بچّوں کے ساتھ۔ تاجر ہیں، راستے بھر بار بار

کھاتے رہے ۔ اُن کا بچّہ دلچسپ ہے ، مجھے اُس کی شرارتیں دیکھ کر اپنا بچّہ ارشد یاد آتا رہا ۔

پیچش کا سلسلہ آج بھی رہا مگر تکلیف میں کمی ہے ۔ وقت گذاری کے لئے اسکرین بمبئی کا تازہ پرچہ دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر دیکھ کر ہنسی آگئی ۔ فلم اسٹار ثریّا کو پیچش ہو رہی ہے ۔ غالب کا شعر یاد آگیا ؎

کم نہیں خوبیِ ہمنامیِ چشمِ خوباں تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

بہت دُور داہنی طرف یعنی پچھم میں مشرقی گھاٹ کے کُہسار نظر آرہے ہیں اور پورب میں سمندر کبھی کبھی اپنی جھلک دکھا جاتا ہے ۔ سیاہ ، پُرشور اور اضطراب انگیز ۔ اب رات کی روشنی میں جگمگاتا ہوا مدراس کا شہر نظر آرہا ہے ۔ اِس وقت تو بڑا حسین معلوم ہوتا ہے ۔

دس بجے رات ۔ اس وقت ایک اچھے مگر "ترکارنے" (VEGETARIAN کا یہ ترجمہ ڈاکٹر جعفر حسن حیدرآبادی نے کیا ہے) ہوٹل میں ہوں ۔ ٹرین سے یہ سوچ کر اُترا تھا کہ ابھی کو چین کے لئے ٹکٹ لے لوں گا اور کل چلا جاؤں گا مگر بات کی بات میں صورت حال بدل گئی ۔ اسٹیشن پر اُترتے ہی ایک نوجوان نے غالباً میرے سوٹ کیس پر نام پڑھنے کے بعد انگریزی میں پوچھا "آپ پروفیسر احتشام حسین ہیں ؟" اثبات میں جواب دینے پر کہا "آپ کے نام یہ دو خط ہیں" وہیں کھڑے کھڑے خط پڑھے ۔ لکھا تھا کہ اب جہاز ۹ ستمبر کے بجائے ۱۳ کو روانہ ہوگا ، ہمیں افسوس ہے کہ وقت نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو دہلی اطلاع نہ دے سکے آپ مدراس میں قیام فرمائیے ۔ بنگلور سے راک فیلر فاؤنڈیشن کا بھی یہی مشورہ ہے ۔

جس قسم کی امداد کی ضرورت ہو ہم حاضر ہیں۔ یہ خط رام موہن اینڈ کو میرے سفر کے ایجنٹوں کا تھا۔

تو یوں بھی ہوتا ہے! یہ سب میری بے حوصلگی اور بے دلی کی آزمائش ہے! یوں ہوتا تو مزا آجاتا کہ داستانوں کے شہزادوں کی طرح پلک جھپکاتے کوئی طاقت مجھے اُٹھا کر نیویارک کے کسی ہوٹل میں پہونچا دیتی اور اِن جھگڑوں سے نجات ملتی یا مجھ میں یہ جرأت ہوتی کہ میں اب بھی راک فیلر فاؤنڈیشن کو یہ لکھ کر بھیج دیتا کہ لیجئے یہ رہی آپ کی فیلوشپ، میں باز آیا اس مصیبت سے۔ ع

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کشتی بہت دُور دریا کے اندر لاکر کوئی مجھے یہ سوچتے ہوئے دیکھ لے تو کیا کہے! میں بھی کیا احمق ہوں۔

اسٹیشن پر سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ایک ہوٹل کے ایجنٹ نے اپنے ہوٹل کا کارڈ دیا "وسنت وہار"۔ میں اُس کے ساتھ ہو لیا۔ یہ بہت بڑا، شاندار لیکن خالص مدراسی ہوٹل ہے۔ کمرہ اچھا ہے لیکن کھانا؟ بوائے سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہاں دو قسم کے کھانے ملتے ہیں۔ بمبیا اور مدراسی۔ میں نے سوچا، مدراس میں مدراس ہی کا کھانا کیوں نہ کھایا جائے، بچپن کی وجہ سے چاول کھانا ہی تھا، میں نے تجربہ کے لئے خود کو ہوٹل والوں کے سپرد کر دیا۔ کھانے کے کمرے میں گیا تو کئی اور آدمی بیٹھے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سفید پتھر کی میزیں ہر شخص کے سامنے تھیں، پہلے کیلے کے پتے بچھائے گئے پھر اُس پر پانی چھڑکا گیا، پھر اُسی پر ترکاریاں، چٹنی، چاول لاکر رکھ دئے گئے، ایک شخص نے

تھوڑا سا گھی لاکر چاول پر ڈال دیا، دوسرے نے دال، ایک نے دہی کا پیالہ سامنے لاکر رکھ دیا اور گلاس میں پانی، تھوڑی دیر کے بعد ایک پاپڑ بھی آگیا۔ یہ تھا مدراسی کھانا۔ بمبئی کے کھانے میں چپاتیاں بھی ہوتی ہیں اور ترکاری زیادہ ہوتی ہے۔
میں دہی چاول کھاکر اپنے کمرے میں آگیا۔ دیکھئے کل کیا ہوتا ہے!

۶ ستمبر سنیچر صُبح — نہا دھو کر آٹھ بجے میں نے مدراس شہر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ صرف ایک پیالی (گلاس) چائے پی۔ ابھی پیچش کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ہوٹل سے نکل کر مدراس کا مشہور اخبار ہندو خریدا اور کمرے میں واپس آکر دیکھنے لگا۔ یہ حیدر آباد میں ملکی اور غیر ملکی کا جھگڑا پھر شروع ہوا۔ دہلی کے ارباب حل وعقد کا خیال ہے کہ اس میں رضا کاروں اور کمیونسٹوں کا ہاتھ ہے۔ رضا کاروں کا تو ہوسکتا ہے، کمیونسٹوں کا کیوں! لسانی بنیاد پر حق خود ارادیت تسلیم کرنے، صوبوں کی لسانی تشکیل پر زور دینے کے بعد حیدر آباد کی اتفاقیہ وحدت کو ٹوٹنے پھوٹنے سے بچائے رکھنے کی کوشش کیونکر صحیح ہوسکتی ہے۔ ہاں حیدر آباد شہر کا معاملہ البتہ غور طلب ہے۔ ۱۹۴۷ء میں بھی جب کمیونسٹوں نے آزاد حیدر آباد کا نعرہ لگایا تھا تو میں نے یہی کہا تھا، حیدر آباد ریاست کیا ہے؟ اس کی قومیت کیا ہے؟ کیا پھر کمیونسٹ یہ غلطی کریں گے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا، مجھے یقین نہیں آتا۔

۴ بجے سہ پہر — لیجئے سارا نقشہ ہی بدل گیا، پروگرام میں ایسی اچانک تبدیلی کی طرف میرا وہم بھی نہیں جاتا تھا۔ دس بجے رام موہن اینڈ کو کے دفتر پہونچا انھوں نے کہا آپ کو ہوائی جہاز سے امریکہ بھیجنے کا خیال ہے کیونکہ آپ کا

بہت وقت خراب ہوا ہے۔ ٹھیر جائیے ابھی بنگلور سے کوئی اطلاع آتی ہوگی۔
میں انھیں کے دفتر میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ بنگلور سے ٹیلیفون آیا معلوم ہوا
کہ بنگلور میں راک فیلر فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر واٹسن مجھ سے باتیں کرنا چاہتے
ہیں۔ گفتگو کرکے پتہ چلا کہ مجھے اب بمبئی جانا ہے اور وہاں سے ہوائی جہاز سے
نیویارک۔ دو منٹ کے اندر سارے انتظامات بدل گئے۔ میرے بمبئی جانے کے
لئے فرسٹ کلاس میں جگہ ریزرو ہوگئی اور طے ہوا کہ ۹ ستمبر کو بمبئی چلا جاؤں
وہاں سے ۱۲ ستمبر کو TWA کے جہاز سے نیویارک۔

میرے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوئے، خاص قسم کی کشمکش،
الجھن، خوشی اور تکلیف، حیرت اور عدم واقفیت کی وجہ سے خوف کے ملے جلے
جذبات، جن کا تجزیہ مشکل ہے۔ معمولی مادی سوالات سے لے کر گہرے ذہنی
سوالات تک سب الجھن پیدا کرتے ہیں۔ بحری جہاز سے جانے والے مسافر کا
سامان لے کر چلا تھا، ہوائی جہاز کے لئے یہ بہت ہے۔ ایک بکس میں کچھ کتابیں
اور کپڑے وغیرہ لکھنؤ واپس بھیج دینا چاہیئے، اب اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔
بنگلور سے ڈاکٹر واٹسن نے کہا تھا کہ ہم فاضل اسباب کا کرایہ بھی دے دیں گے
لیکن بہت سا اسباب لے کے چلنا اچھا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں بعض چیزیں تو
لے ہی جانا ہے۔ اس میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر مزمدار کی کچھ کتابیں، کچھ کاغذات
اور سلائڈ ہیں، وہ یہ چیزیں میرے سپرد کرکے امریکہ چلے گئے کہ میں پانی کے
جہاز سے جاؤں گا اور اُن کا یہ سامان لیتا آؤں۔ اِس امانت کو کیسے چھوڑ دوں۔
مدراس میں رام موہن اینڈ کو برانچ کا منیجر وسیع معلومات کا انسان ہے،

بہت تیز اور ہمدرد، اُس سے معلوم ہوا کہ جس جہاز سے میں جانے والا تھا وہ اس سلسلہ کا جہاز ہے جو امریکہ سے جنگ کا سامان کوریا لے جاتے ہیں، وہاں سے خالی آتے ہیں، سنگاپور اور کوچین سے مال لیتے اور امریکہ واپس جاتے ہیں۔ خوشی ہے کہ میں اس جہاز پر سفر کرنے سے بچ گیا، شاید یہ خوشی ایک طرح کی جذباتی اور خیالی خود فریبی کی شکل ہو۔

۷ ستمبر اتوار۔ کل شام کو ایک ڈاکٹر کے یہاں گیا، ابھی طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی، یوں تو کل اِدھر اُدھر سارے مدراس میں پھرتا رہا لیکن شام کو خاص طور سے میرینا بیچ (ساحل) دیکھنے گیا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے ساحلوں میں اس کا دوسرا نمبر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وسیع ساحل پر زندگی کی بے پایاں عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ ریت پر ہزارہا انسان بیٹھے سمندر کا حسن اور جلال دیکھ رہے ہیں۔ پانی کی لہریں گزوں اونچی اُٹھتی اور ریت پر چڑھ جاتی ہیں، پھر پلک جھپکتے میں واپس ہو جاتی ہیں۔ چھوٹے بچے، عورتیں اور نوجوان ہی نہیں، بوڑھے بوڑھے لوگ بالکل کنارے پر کھڑے ہو جاتے ہیں، لہریں اُنھیں گھٹنوں تک بھگوتی اور واپس جاتی ہیں، بچے ہنستے اور بوڑھے مسکراتے ہیں۔ حدِ نظر تک پانی کی لہروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، شام کی ٹھنڈی اور دُھلی ہوئی ہوا، جو نہ جانے کہاں سے آتی ہو گی، ساری گندگیوں سے پاک، محض سمندر کے پانی کی خوشبو لئے ہوئے آتی ہے۔ اندھیرے کے ساتھ سمندر کی ہیبت اور سیاہی بڑھتی جاتی ہے اور لوگ دھیرے دھیرے ساحل چھوڑنے لگتے ہیں۔ مدراس کا ساحلی حسن بالکل فطری ہے، بمبئی میں چوپاٹی اور میرین ڈرائیو کا حسن اِس سے مختلف ہے۔

وہاں حسن فطرت میں انسانی حسن کی آمیزش سے انسان اپنی مادّی حقیقت کا گہرا احساس رکھتا ہے، یہاں انسانی حسن کی مد بڑی حد تک غائب ہے۔ شہر کے مختلف حصّوں میں گھوم پھر کر دس بجے رات کو پلٹا۔ آج صبح پھر نکلا اور بے ارادہ ایک بجے تک پھرتا رہا۔

مدراس کا شہر اندر سے کچھ ایسا خوبصورت نہیں۔ یہاں کے مکانوں کی ساخت شمالی ہند سے بہت مختلف ہے۔ سرکاری عمارتیں بھی مختلف وضع قطع کی ہیں۔ مسجدوں کی شکلیں بھی شمالی ہند سے نہیں ملتیں، رسم و رواج تو خیر بہت مختلف ہیں ہی، عام معاشرت بھی بہت الگ تھلگ ہے۔ عورت اور مرد اچھا لباس پہنے ہوئے ننگے پاؤں چلتے ہوئے ملیں تو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ کلکتہ، بمبئی اور دہلی کی طرح لوگ ٹریموں اور بسوں کے لئے فوراً کیو نہیں بناتے۔ اکثر بڑی بڑی دوکانوں پر بڑا سا پپیتے کا پھل رسّیوں میں لٹکا ہوا نظر آتا ہے جس پر کاجل اور سیندور سے ناک آنکھ منھ بنا دئے گئے ہیں۔ بعض دوکانوں میں رسّی میں بندھی ہوئی اشوک کی پتّیاں لٹکتی دکھائی دیتی ہیں، غالباً یہ بُری رُوحوں کو دُور رکھنے یا برکت کے لئے ہوگا۔ میں نے بہت سی جگہیں نہیں دیکھی ہیں اس لئے کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتا لیکن یہاں چاندی کے زیور اور ظروف جیسے بنے ہوئے میں نے دیکھے اور کہیں نظر سے نہیں گذرے۔

آج اتوار ہے بازار بند ہیں، یونیورسٹی بھی بند ہوگی، جی چاہتا ہے کہ وہاں جاؤں مگر کون جاننے والا ہے، محض عمارت دیکھ کر کیا کروں گا، پھر بھی ہو سکا تو کل جاؤں گا۔

شام کے وقت اڈیار جانے کے خیال سے نکلا تھا لیکن دیر ہوگئی اور بیسنٹ بیچ ہی نے قدم پکڑ لئے ۔ آج تو یہاں انسانوں کا اتنا ہجوم تھا کہ حیرت ہوگئی ۔ سمندر کی ریت پر آدمی ہی آدمی تھے ، کھڑے بیٹھے ، کھیلتے کودتے ، دوڑتے ، ننگے ، اچھے لباس والے ۔ کل مجھے شک تھا کہ شائد مدراس والوں کو اپنے اس ساحل پر ناز نہیں لیکن آج لوگوں کا والہانہ اجتماع دیکھ کر اُن کی عقیدت کا قائل ہونا پڑا ۔ میں نے سرِ راہ ایک نوجوان سے پوچھا یونیورسٹی کہاں ہے ؟ اُس نے پاس ہی کی ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا ، اس وقت اس میں روشنی اور چہل پہل تھی ، معلوم ہوا کہ اِنٹر یونیورسٹیز بورڈ کا جلسہ ہو رہا ہے ، یہیں بہت سے تعلیمی ادارے ہیں اور یہیں کرکٹ کا مشہور میدان چیپک گراؤنڈ ہے ۔ ایک طرف سمندر دوسری طرف یہ ساری عمارتیں ۔ باتیں کیں تو یہ نوجوان انجینیر نکلا ، اُس نے بڑے فخریہ انداز میں مجھ سے پوچھا ، اس بیچ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ میں نے کہا عظیم الشان ہے ۔ میں نے تو صرف بمبئی کا ساحل دیکھا ہے ۔ اُس نے اس طرح مُنہ بنایا گویا بمبئی کا ساحل بھی اس کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے ! آج کا یہ منظر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا ۔ اس سارے ہجوم میں میں تنہائی محسوس کر رہا تھا ۔ لیکن نہیں میری طرح اور بھی لوگ ہوں گے جو اچانک یہاں پہونچ گئے ہیں ، ساٹھ ستر ہزار انسانوں کے درمیان میں ایک انسان خود کو اجنبی کیوں محسوس کرے ! مجمع میں ایک جوش اور والہانہ پن معلوم ہوتا تھا جیسے سمندر کی لہروں میں ——— سمندر کے چند قطرے اُچھل کر دُور ریت میں جذب ہو گئے تو کیا ، اگر دو چار انسان اس مجمع میں کھوئے کھوئے سے ہیں تو کیا !

آج میں نے مدراس کا زیادہ حصہ دیکھ ڈالا، لکھنؤ میں کبھی ZOO کی طرف رُخ بھی نہیں کرتا تھا، مدراس میں وہاں بھی دو تین گھنٹے لگا دئے، غالباً لکھنؤ سے بڑا نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی خاص بات ہے۔ انتظام لکھنؤ سے اچھا ہے، اندر ایک جھیل اور ایک کیفے بھی ہیں۔

مدراس میں صرف ایک کتاب خریدی GOD THAT FAILED کمیونزم کے خلاف یہ بڑی مشہور کتاب ہے، میں نے اسے کہیں کہیں سے پڑھا تھا اب غور سے پڑھنا چاہتا ہوں بلکہ رات میں نے بہت سے صفحے دیکھ بھی ڈالے، کتاب پر نشان بناتا جا رہا ہوں اپنے تاثرات کسی دن اطمینان سے لکھوں گا خیال تھا کہ سمندر میں بائیس دن لکھتا پڑھتا ہی رہوں گا اور اس بہانے کچھ ہو جائے گا لیکن اب تو پروگرام ہی بدل گیا۔

۸ ستمبر دوشنبہ — طبیعت بہتر ہے لیکن اتنے سفر اور بھاگ دوڑ کا عادی نہ ہونے کی وجہ سے تھکا تھکا سا محسوس کرتا ہوں، حالانکہ ابھی اصل سفر پڑا ہی ہوا ہے۔ سخت پرہیز کر رہا ہوں۔ گھر پر کبھی اتنا خیال نہیں کرتا تھا۔ وجہ ظاہر ہے۔

صبح نو بجے کے قریب نکلا رام موہن اینڈ کو کے دفتر گیا۔ میرے پاسپورٹ میں سعودی عرب اور مصر کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ یہاں ٹھہرنا نہیں ہے مگر چونکہ جہاز وہاں سے گذرے گا اس لئے ویزا کی ضرورت ہے۔ اگر مدراس حکومت کا محکمہ داخلہ چاہے تو میرے پاسپورٹ میں ان ملکوں کا ذکر کر سکتا ہے۔ ویزا تو بمبئی ہی سے ملے گا۔ سب سے زیادہ لمبی فیس سعودی عرب کی ہے۔ یہ کام رام موہن اینڈ کو اور TWA کمپنی کے ذریعہ سے ہو جائے گا اور پاسپورٹ

بمبئی ہیں مع ویزا کے واپس مل جائے گا۔ ابھی بیٹھا فارم وغیرہ بھر ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر شرد کمار (لکھنؤ میڈیکل کالج) آ گئے، انھیں بھی اسی جہاز سے جانا تھا اب اُن کا پروگرام بھی وہی بنا جو میرا تھا، خیر بہت اچھا ہے کہ ان کا ساتھ نیویارک تک تو رہے گا۔ انھیں امریکہ کی یوٹا یونیورسٹی میں دو سال تک رہنا اور اعلیٰ طبّی تعلیم حاصل کرنا ہے۔

دفتر میں سارے کام ادھورے چھوڑ کر میں تو گیارہ بجے نکل پڑا، طے ہوا کہ چار بجے آ کر جہاز کا ٹکٹ وغیرہ لے لوں گا۔ میں سیدھے بڑے ڈاکخانے پہونچا وہاں کچھ خط لکھے، قریب ہی ہاربر ہے، بڑے بڑے بینکوں اور تجارتی کمپنیوں کی عمارتیں ہیں، انھیں دیکھتا رہا۔ ہاربر کے اندر جانے کے لئے پاس کی ضرورت تھی، وہ ٹریفک مینجر سے مل سکتا تھا مگر دو تین گھنٹے انتظار کے بعد — میرے پاس اتنا وقت کہاں تھا، ساڑھے بارہ بج چکے تھے اور میرے سر پہ اڈیار سوار تھا۔

آڈیار شہر کے مرکزی علاقہ سے آٹھ نَو میل کے فاصلہ پر ہے، بسیں جاتی ہیں، میں سوا بجے وہاں پہونچ گیا۔ ہر شہر کی طرح مدراس بھی اِدھر اُدھر پھیل رہا ہے چنانچہ نئی بستیاں بستی جا رہی ہیں اور اڈیار تک آبادی ہی آبادی ہے۔ اڈیار ساحلی علاقہ میں ہے۔ میرے پاس وقت کی کمی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ اگر اچھی طرح نہیں تو تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی تھیاسوفی کے اس شہرۂ آفاق مرکز کی چوکھٹ تو چھو آؤں، کچھ نہ ہو گا حاضری تو ہو جائے گی۔

ایک بڑے پھاٹک سے ہو کر ایک چمن زار میں داخل ہوا، دُور تک چلتے جاؤ، کچھ نہیں، پھر ایک خاص قسم کا پتھر کا پھاٹک نصب ہے جس پر کچھ ایلورا

اور ایلیفینٹا سے ملتے جلتے نقوش ہیں۔ ایسے ہی چند پھاٹک اور ہیں، راستوں کے نام مادام بالاواٹسکی، ڈاکٹر الکاٹ اور ڈاکٹر اینی بسنٹ کے نام پر ہیں، آگے بڑھ کر THE GREAT HALL ملا۔ اس میں تمام مذاہب کی علامتیں ملتی ہیں، کچھ مورتیوں کی شکل میں، کچھ کتبوں کی شکل میں۔ بڑے حرفوں میں لکھا ہوا ہے "سچ سے بڑا کوئی مذہب نہیں" مادام بالاواٹسکی اور الکاٹ کے مجسمے ہیں اور اُسی جگہ اِس تثلیث کی تکمیل کے لئے مسز بسنٹ کا بسٹ بھی رکھ دیا گیا ہے، یا تو کسی معتقد نے چڑھائے ہیں یا غالباً وہاں کا قاعدہ ہے، ہر مورت کے سامنے پھول رکھے ہوئے تھے، عجیب خاموشی تھی، میری ہی طرح کچھ اجنبی ادیار دیکھنے آئے تھے اور اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے کیونکہ آج وہاں تعطیل تھی اور ایک متنفس بھی کچھ بتانے کے لئے موجود نہیں تھا۔ کتب خانہ بند، دارالاشاعت بند، سارے کمرے بند ——— صرف تصویریں اور مجسمے دیکھنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ اسلام کے نیچے کلمہ اور قرآن شریف کی ایک آیت عربی خط میں لکھی ہوئی تھی اِس بڑے احاطہ اور چمن زار میں مسجد، مندر، گرجا، ہیکل، پیگوڈا، آتش خانے سبھی ہیں ایک بہت بڑا برگد کا درخت گوتم بدھ کے نِروان حاصل کرنے کی یاد دلا رہا ہے۔ غالب کا شعر بار بار یاد آرہا تھا ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا — واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

انسان سکون کی جستجو میں سرگرداں ہے، بت بنا بنا کر توڑتا جاتا ہے۔ دنیا سے بھاگ کر یہ بھی سکون تلاش کرنے کی ایک کوشش ہے، تصوف کی ایک بدلی ہوئی شکل۔ اسے جاذب توجہ بنانے کے لئے جدید ذرائع اشاعت

اختیار کئے گئے ہیں۔ اڈیار کا ماحول خوشگوار، پُرسکون اور آسودگی بخش ہے لیکن کتنے انسانوں کے لئے ایسا ماحول ممکن ہے۔ عام انسان کے لئے اس میں کیا ہے؟ فلسفیانہ نظر سے دیکھنے والوں کو تو ہر جگہ گہرائیاں مل جاتی ہیں۔ اگر تمام مذاہب میں سچائی ہے تو پھر ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ تھیاسوفی کو شائد لوگ مذہب نہیں کہتے لیکن اس کا رکھ رکھاؤ تو مذہب سے زیادہ پابند بنا دیتا ہے۔ خیر مجھے اس بحث میں اُلجھنے کی کیا ضرورت ہے، کاش آج یہاں 'کاروبار شوق' جاری ہوتا تو چند لمحوں کے لئے میں بھی کچھ سمجھنے کی کوشش کرتا حالانکہ شائد مجھ میں وہ روحانیت مر چکی ہے جو ایسی باتیں سمجھنے کے لئے لازمی ہے۔

تین بجے واپس آیا۔ سامان اُلٹا پلٹا، ایک بکس خالی کیا اُس میں کچھ کپڑے، کتابیں اور دوسری چیزیں بند کیں اور لے جاکر رام موہن اینڈ کو کے حوالہ کیا کہ اسے لکھنؤ بھجوا دیں۔ رام موہن اینڈ کو کے مقامی منیجر نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور سفری بیگ کے ساتھ آشرباد بھی دی، کچھ ضروری ہدایتیں کیں اور یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر واٹسن کے صاحبزادے اسی جہاز سے نیویارک جا رہے ہیں، ۱۲ ستمبر کو وہ اُنھیں پہونچانے بمبئی جائیں گے۔ اُن کی خواہش ہے کہ ۱۲ ستمبر کی دوپہر کو اُن سے تاج محل ہوٹل میں مل لوں۔

شام تک اتنا تھک چکا تھا کہ کہیں اور جانے کی ہمت نہ ہوئی، نیچ جاسکتا تو جاتا لیکن اب طاقت نہیں۔ بقول شخصے "ابھی بہت سا سفر پڑا ہے طاقت بچائے رکھنا چاہئے" کل صبح بمبئی جانا ہے۔

مدراس چھوڑتے ہوئے یہ خیال بار بار آرہا ہے کیا دکنی ہند کبھی پورے

ہندوستان کی تہذیبی وحدت میں ضم ہو سکے گا؟ غالباً کبھی نہیں؟ کیا خود دکنی ہند کے چار بڑے بڑے لسانی علاقے ایک دوسرے میں ضم ہو سکیں گے؟ شائد یہ بھی کہنا مشکل ہے کیونکہ جس طرح ہم ہر دراوڑی زبان سے ناآشنا ہیں اُسی طرح عام دراوڑی اپنی زبان کے علاوہ ہر دوسری دراوڑی زبان سے ناآشنا ہے، ہاں عادات و اطوار میں تھوڑی بہت یکسانیت ضرور ہے۔

اس بات کا افسوس ہے کہ تین دن مدراس میں رہا اور یہاں اُردو زبان و ادب کی موجودہ حیثیت کے متعلق کچھ معلومات فراہم نہ کر سکا، ایک وجہ تو میری طبیعت کی خرابی ہے اور دوسری مکمل ناواقفیت۔ کوئی ایک معقول ذریعہ بھی ہوتا تو دو چار حضرات سے مِلا جا سکتا تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے یہاں کے چند نوجوانوں نے ایک رسالہ فن کار نکالا تھا۔ ذہن پر بہت زور دیا کہ اُس کا پتہ یاد آئے نہیں یاد آیا، دو ایک صاحبوں سے پوچھا تو وہ اجنبی نکلے۔

۹ ستمبر منگل — (مدراس اور بمبئی کے درمیان)۔ صبح ہوٹل سے نکل کر اسٹیشن کی راہ لی۔ ایک مدراسی مسافر مسٹر راماسوامی کا ساتھ ہے میرے ساتھی ڈاکٹر شرد کمار کو دوسرے ڈبہ میں جگہ ملی ہے۔ مسٹر راماسوامی جوان ہیں اور دلچسپ شخصیت کے مالک۔ مدراس شہر سے صوبائی اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے ہیں اور صوبہ کی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے سکریٹری ہیں بہت سی باتیں ہوئیں، وزراء سے لے کر عوام تک، اُن کا ذاتی رجحان بائیں بازو کی طرف ہے لیکن راجگوپال اچاری کے جادو میں گرفتار رہیں۔ اُن سے باتیں کر کے معلوم ہوا کہ تھوڑے سے لوگوں کے سوا سبھی راجہ جی کے بندۂ بے دام ہیں آج دن بھر اُن سے دلچسپ باتیں ہوا کیں۔

مصر، ایران، پاکستان اور ہندوستان کے متعلق کھلے دل سے اظہارِ خیال ہوتا رہا
ہندوستان کے لئے اُنھیں کمیونزم مناسب نہیں معلوم ہوتی لیکن اگر ہندوستانی انداز
کی ہو تو انھیں اختلاف نہ ہوگا۔ بہرحال مسٹر راماسوامی کے ساتھ دن اچھا کٹا۔

میں نے آج بھی پرہیز کیا حالانکہ طبیعت بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ پیچش
کے آثار بالکل مٹ چکے ہیں۔ لیکن میں اس حالت میں بیمار ہونے سے ڈرتا ہوں۔
یہاں سفر میں کون پُرسان حال ہوگا۔ مجھے یہ بھی شوق نہیں ہے کہ اگر بیمار پڑوں تو
کوئی تیمار دار نہ ہو۔ میں بیزاری کی اس منزل پر نہیں ہوں کیونکہ میں جس سماج میں
ہوں وہ فرد اور جماعت دونوں کے لئے جد و جہد کی کھلی ہوئی راہیں رکھتا ہے۔
مجھ پر تنہائی اور بیزاری کے لمحات گذر جاتے ہیں لیکن کوشش کرتا ہوں کہ وہ میری
زندگی کا جز نہ بنیں۔ میرے اندر مسلسل کشمکش جاری ہے اور میں اپنی افتادِ طبع سے
لڑ جھگڑ کر قنوطیت کے حصار سے باہر نکل رہا ہوں میرا خیال ہے کہ اس کے لئے
انفرادیت کا گلا گھونٹنے کی ضرورت نہیں ہے، اجتماعی احساس اور اجتماعی ارادہ کے
ساتھ اُن رکاوٹوں پر قابو پانے کی ضرورت ہے جو انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔

ریل کی پٹریوں کے دونوں جانب مناظر کچھ بہت زیادہ قابل ذکر نہیں ہیں
نزدیک اور دُور پہاڑ اور پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ پانی کی کمی ہے۔ پانچ گھنٹے کے
سفر کے بعد ٹرین رایلاسیما کے علاقہ میں داخل ہوئی، یہی وہ قحط زدہ علاقہ ہے
جس کا ذکر ایک مہینے پہلے اخباروں میں بہت رہتا تھا۔ یہاں پانی کا سخت قحط
پڑا اور فوج کو کنویں کھودنے کے علاوہ بہت دُور سے پانی لانا پڑا۔ کھیت سوکھے
ہوئے پڑے ہیں اِدھر معمولی بارش ہوگئی ہے اس لئے جا بجا سبزہ نظر آ رہا ہے۔

بعض اسٹیشنوں پر اب بھی پانی سے بھرے ہوئے گاڑی کے ڈبے کھڑے ہیں اور لوگ اُن میں سے پانی قریب کے گاؤں میں لے جا رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں میں ریت اُڑ رہی ہے۔ مسٹر راماسوامی سے میں نے کہا آپ لوگ کب تک بادلوں کی آس لگائے بیٹھے رہیں گے یہاں کے لئے کچھ سوچنا چاہیئے، کہنے لگے تنگ بھدرا پروجکٹ مکمل ہو جائے تو کچھ آسانی ہو جائے گی۔ مگر غالباً اس علاقہ کو بہت فائدہ نہیں پہونچے گا۔ اگرچہ مدراس میں رعیت واری سسٹم ہے لیکن پھر بھی چھوٹے چھوٹے زمیندار وجود میں آ گئے ہیں جن کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین ہے۔ مدراس کی حکومت انھیں ختم کرنا چاہتی ہے۔ یہ ہو جائے اُسی وقت کچھ ہو سکے گا۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے اور کب تک۔

آج کے اخبار میں ایک دلچسپ خبر دیکھی۔ امریکہ کے فورڈ فاونڈیشن نے پچیس ہزار ڈالر امریکن کونسل آف لرنڈ سوسائٹیز کو دئے ہیں کہ وہ امریکہ میں تلگو، اُردو، بنگالی، پنجابی اور پشتو کی ترقی پر خرچ کرے۔ میں لکھنؤ اور دہلی میں تھا تو اکثر دوستوں نے کہا تھا کہ وہاں اُردو کی تعلیم کی تحریک چھیڑ نا شائد اُردو کے لئے کچھ ہو جائے اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ وہاں پہونچ کر اندازہ لگاؤں گا کیا ہو سکتا ہے، بارے ایک مرکز کا پتہ تو چلا۔ کیا بات ہے کہ امریکہ پہونچنے کو صرف چار دن رہ گئے ہیں لیکن ابھی ذہن میں کوئی نقشہ، کوئی پروگرام نہیں بنتا! میری جگہ پر کوئی اور ہوتا تو امریکہ کے متعلق بہت سی معلومات یکجا کر لیتا، میں نے کچھ بھی نہیں کیا، وہاں ضرور دشواریاں ہوں گی۔

۱۰ ستمبر بدھ صبح — ابھی کچھ دیر پہلے ٹرین ڈھونڈ کے اسٹیشن پر پہونچی اور

مسٹر راما سوامی اُتر گئے۔ انھیں پرسوں اندور، اے آئی سی سی کے اجلاس میں شریک ہونا ہے۔ وہ پہلے کہیں ایک دیہات میں جائیں گے جہاں ایک مسلمان فقیر "سائیں بابا" کی سمادھی ہے، لاکھوں ہندو مسلمان اُن کی سمادھی پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ مسٹر راما سوامی نے فوجی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے، دو سال صحت کے خیال سے سوئزرلینڈ میں رہے ہیں لیکن عقیدت پھر عقیدت ہی ہے، وہ اُس جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں سائیں بابا رہا کرتے تھے!

اِس دفعہ اندور میں کانگریس کو بعض اہم فیصلے کرنے پڑیں گے۔ سب سے زیادہ دلچسپ سوال کانگریس اور کانگریسی حکومت کے تعلق کا ہے۔ یہ کوئی نیا سوال نہیں ہے۔ اسے پہلے اچاریہ کرپلانی نے، پھر پرسوتم داس ٹنڈن نے اور اب بمبئی کے مسٹر پاٹل نے اُٹھایا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ضبط و نظم کے نقطۂ نظر سے یہ اہم سوال ہے حالانکہ جب پنڈت نہرو ہی دونوں جگہ ہیں تو اس سوال کی بہت زیادہ عملی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ صوبوں میں بھی صوبائی کانگریس، آل انڈیا کانگریس کے منظور کردہ نظام سے ہٹ نہیں سکتی، مگر کامیابی اس لئے نہیں ہوتی کہ اس میں شخصیتوں اور ذاتی ناکامیوں کا بھی ہاتھ ہے۔ خیال ہے کہ کانگریس مختلف صوبوں کے خاتمۂ زمینداری اور زرعی اصلاحات کے مسئلہ پر بھی غور کرے گی۔ اگر نتائج کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اصلاحات کچھ بھی نہیں، عوام کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے، چھوٹے زمیندار اور کسان بھوکے مر رہے ہیں مجھے اب بھی پنڈت نہرو کی عوام دوستی پر بھروسہ ہے اور ساری کانگریس میں صرف

وہی ہیں جو حالات کے بہتر بنانے کی ہمت اور طاقت رکھتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اب وہ عوام کی اصل حالت سے بے خبر ہیں۔

دس بجے رات ۔ اس وقت بمبئی میں چرچ گیٹ کے قریب ایرلائنس ہوٹل میں ہوں۔ صاف ستھرا خوبصورت اور بڑا ہوٹل ہے، یہاں سے میرین ڈرائیو، تاج محل، انڈیا گیٹ، اسٹیشن سب قریب ہیں۔

پونا سے بمبئی تک کا راستہ درحقیقت حسین ترین راستہ ہے پہاڑوں، سرنگوں اور ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان یہ راستہ غیرمعمولی کیفیات پیدا کرتا ہے۔ پونا سے چلتے ہی بادل چھا گئے تھے اور تھوڑی تھوڑی بارش ہو رہی تھی۔ بادلوں کے بھورے بھورے آوارہ ٹکڑے وادیوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے یا پہاڑیوں پر تیر رہے تھے۔ سبز اور سیاہ پہاڑوں کے درمیان کہیں کہیں پانی کے آبشار سفید سانپ کی طرح بل کھاتے گر رہے تھے۔ اس سے زیادہ حسین منظر سفر کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے! پونا ہی میں حیدرآباد کے نواب ساجد یار جنگ کا ساتھ ہو گیا تھا۔ موصوف کنور محمود حسن خاں (اقبال منزل لکھنؤ) کے خسر ہیں، نہایت شائستہ، دلچسپ اور باوقار انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ لکھنؤ اور سارے شمالی ہند کے اخلاق، شائستگی اور زبان کی تعریف کرتے رہے۔ کوئی بائیس سال سے حیدرآباد چھوڑ کر میسور میں اقامت گزیں ہیں۔ اجنبی مقامات پر زبان کے سمجھنے اور نہ سمجھنے کا ذکر ہو رہا تھا نواب صاحب کہنے لگے کہ جب میں نیا نیا میسور گیا تو کئی دلچسپ واقعات پیش آئے۔ ایک سیٹھ صاحب نے جن سے پہلے سے تعلقات تھے ایک دعوت میں

مدعو کیا، میں نے اپنی اجنبیت دُور کرنے کے لئے اپنے پاس بیٹھے ہوئے صاحب سے پوچھا" آپ کا اسم مبارک" وہ کچھ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے اور ذرا سا سرک کر بیٹھے، میں متحیر تھا کہ کیا بات ہے، اتنے میں سامنے بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے اپنے ساتھی سے کہا" چھٹ پا ہندوستان" میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، خاموش رہا۔ جب سیٹھ صاحب میرے پاس آئے تو میں نے کہا کہ میں نے اِن صاحب سے پوچھا آپ کا اسم مبارک! تو یہ گھبرا گئے اور کوئی جواب نہیں دیا، کیا بات ہے، ہنس کر بولے وہ نہ سمجھے ہوں گے۔ نام پوچھئے، وہ اسم مبارک کیا جانیں، تو میں نے دوسرا معمہ حل کرنا چاہا کہ میرے نام پوچھنے پر سامنے والے حضرت نے اپنے ساتھی سے کہا" چھٹ پا ہندستان" اس کا کیا مطلب ہے سیٹھ صاحب نے فرمایا انھوں نے کہا کہ اگر ایسی زبان استعمال کرنا ہے تو ہندوستان تشریف لے جائیے —— ایک اور لطیفہ نواب صاحب ہی نے سُنایا۔ میں ہر سال گرمیوں میں اُوٹی جاتا تھا اور انھیں سیٹھ صاحب کے مکانات میں سے ایک کرایہ پر لے لیتا تھا۔ نیا نیا میسور گیا تھا، ایک سال جو اُوٹی جاتا ہوں تو دیکھا کہ جو مکان میرے لئے ہے اُس میں قفل لگا ہوا ہے اور کوئی آدمی وغیرہ نہیں، میں نے ایک دوکان والے سے پوچھا، بھئی کیا بات ہے یہاں کوئی نہیں، سیٹھ صاحب کہاں رہتے ہیں؟ دوکاندار نے کچھ روکھا سا مُنہ بنا کر کہا،" جناب اُن کے یہاں آج غلاّٹا ہے" غلاّٹا لفظ کچھ ایسا تھا کہ میں نے سمجھا شاید غمی ہو گئی ہے، دل میں کہا کیسے وقت آیا۔ مگر ہو بھی کیا سکتا تھا، میں نے سیٹھ صاحب کے گھر کی راہ لی اور سوچتا جاتا تھا کہ تعزیت کروں گا یا

ناواقف بن کر کہوں گا کہ بھائی مکان تو کھلوا دیا ہوتا۔ اُن کے گھر پہونچتا ہوں تو بڑی چہل پہل دکھائی دی، سیٹھ صاحب مجھے دیکھتے ہی دوڑ پڑے اور گلے سے لگ گئے۔" نواب صاحب خوب آئے، آج میرے لڑکے کی شادی ہے"!

میں نے کہا بچ گیا، کچھ کہہ دیا ہوتا یا رنج کا اظہار کر دیا ہوتا تو کیسا رہتا!

باتوں باتوں میں کلیان آگیا، کلیان آجائے تو سمجھو بمبئی آگیا، اونچی اونچی عمارتیں نظر آنے لگتی ہیں، بجلی سے چلنے والی گاڑیوں کی تیز خرامی شروع ہو جاتی ہے، فضا میں بجلی کے تاروں کے جال اور زمین پر ریل کی پٹریوں کے جال نظر آتے ہیں اور اسٹیشن پر اسٹیشن گذرنے لگتے ہیں۔ بمبئی ہندوستان کا بہت ہی کاسمابالٹین شہر ہے۔ یہاں ہر جگہ کے لوگ ہیں۔ یہاں کسی کو نہ جانتے ہوئے بھی کوئی اجنبی نہیں۔ چھ سات منزلہ عمارتیں، لاکھوں کی تعداد میں موٹریں، بسیں، کروروں کا مال رکھنے والی دوکانیں، خوبصورت تعمیرات، ہوٹل، رسٹران، بینک، آدمیوں کی ریل پیل۔ کوئی شخص نہ تو غافل رہ سکتا ہے نہ کھویا ہوا۔ یہاں زندگی عمل کا نام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دولت کی اس فراوانی کے باوجود یہاں لاکھوں انسان بھوکے، ننگے اور بے گھر ہیں، پڑھے لکھے بیکار ہیں اور کام کے شائق بیمار بنے بیٹھے ہیں۔ اس شہر میں تہذیب کی وہ ساری برکتیں اور نعمتیں اکٹھا ہیں جو دنیا کے کسی بڑے شہر میں پائی جا سکتی ہیں۔

اسٹیشن سے سیدھا ہوٹل پہونچا۔ ڈاکٹر شرد کمار ساتھ ہیں سب سے پہلا کام تھا TWA کے دفتر (تاج محل ہوٹل) میں اپنے پاسپورٹ وغیرہ کی خبر لینا وہاں پہونچے تو سب کام ٹھیک ہو چکے تھے، ہوٹل واپس آئے، خواجہ احمد عباس کا

فلیٹ ہوٹل سے قریب ہی ہے - چائے پی کر وہاں پہونچے اور دیر تک باتیں ہوتی رہیں - خواجہ صاحب کے ساتھ تفریح کے لئے نکلے، اُن کا اصرار تھا کہ ان کی نئی محنت کا ثمر "انہونی" دیکھ لوں لیکن یہ پروگرام پورا نہ ہو سکا - ان کے اور چند دوسرے دوستوں کے ساتھ "ملا بار ہلس" پہونچے - رات کے آٹھ بج چکے تھے - وہاں کے خوبصورت کیفے "ناز" کی سب سے اونچی منزل پر بیٹھ کر آئس کریم کھائی گئی -

۱۱ ستمبر جمعرات - پچھلی دفعہ جب میں نومبر میں بمبئی آیا تھا تو باوجود کوشش اور خواہش کے اپنے ایک عزیز شاگرد علی رضا سے نہیں مل سکا تھا لکھنؤ واپس پہونچا تو اُس کا بہت ہی "عتاب آمیز" اور پر خلوص شکایتوں سے لبریز خط ملا - میں نے نہ ملنے کی صورت لکھ بھیجی تو غصہ رفع ہو گیا - اس دفعہ میں نے سوچا کہ اگر اُس سے نہ ملوں گا تو ایک عزیز دوست ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل جائے گا - صبح کو چائے پی کر سیدھے اُس کے مکان پر پہونچا، خوب گلے ملے اور گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں - یہاں سید ابو طاہر صاحب بھی ملے اور میرے دو اور شاگرد علی عباس اور احترام بھی، میں نے رضا کو ہمیشہ ایک ذہین، جذباتی اور مخلص انسان سمجھا تھا، یہاں بمبئی کے قیام اور فلمی دنیا کی زندگی نے ان خصوصیات میں اور اضافہ کر دیا ہے، حالانکہ بمبئی ایک تجارتی شہر ہے اور یہاں محبت کا مر جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے (میں فلموں میں محبت کے پیدا ہونے اور مر جانے کی بات نہیں کر رہا ہوں) لیکن رضا مجھ سے مل کر بیحد خوش ہیں - اسی سے ملا ہوا ساغر نظامی کا مکان ہے وہ بھی آ گئے - اور اُن کے ساتھ اُٹھ کر ان کے فلیٹ پر چلا گیا - ساغر کے یہاں ذوقی بھی تھے تین سال کے بعد ملے، تو باتوں میں اُس کی کمی

پوری کرلی ساغر نظامی کی بیگم محترمہ ذکیہ ساغر اور ان کے بچوں میں تھوڑی دیر
وقت اچھا کٹا ـــ یہاں گفتگو اُردو کے حال اور مستقبل کی تھی۔ کافی پی اور رخصت!
سب حیرت کر رہے ہیں کہ یہ شخص کیسے اور کیوں جا رہا ہے!

مجھے بمبئی میں کئی اور حضرات سے ملنا تھا لیکن دو بج چکے تھے ہوٹل واپس
آیا۔ پانچ بجے علی رضا پھر نازل ہوگئے اور مجھ پر اس طرح قابض ہوگئے کہ میں پھر
کہیں نہ جا سکا۔ لکھنؤ سے بھائی کا تار اور خط مل گیا تھا اس لئے کسی قدر اطمینان تھا
میں نے بھی لوگوں سے ملنے جلنے کا خیال ترک کر کے خود کو ان کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر
شرد کمار پانچ بجے کے بعد سے مسلسل میرے ساتھ ہی رہے۔ میرین ڈرائیو پر
کافی چہل قدمی کرنے کے بعد پھر ٹیکسی میں بیٹھ گئے، رضا میرین ڈرائیو پر
ایکٹروں، ایکٹرسوں اور ڈائرکٹروں کے مکانات دکھاتے رہے اور ہم چرچ گیٹ
اسٹیشن کے قریب ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ یہیں سرِ راہ مجروح سلطانپوری
سے ملاقات ہوگئی انھوں نے راجندر سنگھ بیدی کو ساتھ لے کر ملنے کا وعدہ کیا۔
رضا نے کہا چلئے اپنے ایک بہت ہی عزیز دوست سے ملا دوں۔ یہ مقری صاحب کا
مکان تھا، صورت دیکھ کر شک سا ہوا کہ کہیں دیکھا ہے، اجنبی سا نام سُن کر تعجب ہوا،
مل کر معلوم ہوا کہ یہ مزاحیہ ایکٹر ہیں۔ فلموں میں دیکھا ہوگا۔ عربی النسل ہیں، بمبئی کے
قریب ہی سمندری علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں، خلیق، مہماں نواز اور سادہ دل ہیں۔
معلوم نہیں رضا سے اُن سے کیا باتیں ہوئیں ہم لوگ اب ٹیکسی کے بجائے مقری صاحب
کی کار میں بیٹھے اور نامعلوم منزل کے لئے روانہ ہوگئے۔ پھر میرین ڈرائیو، اپالو،
انڈیا گیٹ اور نہ جانے کون کون سی جگہیں نظر کے سامنے آئیں ایک ہوٹل میں

ضرورت اور ہمت سے زیادہ کھانا کھایا گیا۔ ابھی دو دن پہلے تک میں سخت پرہیز کر رہا تھا اب بالکل اس کا عکس تھا۔ لیکن لوگ محبت اور خلوص سے مرغ، تیتر اور انڈے کھلائیں تو صحت کے لئے بہت دُور مستقبل میں نگاہ رکھنا کہاں کی احتیاط پسندی ہے! کھانا کسی قدر تیزی سے کھایا گیا کیونکہ ۹ بج رہے تھے اور ہمیں بمبئی کے خوبصورت سینما ہاؤس لبرٹی میں آن دیکھنا تھا۔

لبرٹی سینما ہاؤس خاص ذوق سے بنوایا گیا ہے، اس کی ساخت، آرائش، روشنی سبھی چیزیں قابل دید ہیں۔ میں اس سے پہلے جب بمبئی آیا تھا تو عصمت چغتائی، شاہد لطیف اور ضیا سرحدی کے ساتھ اسی سینما ہال میں ہم لوگ دیکھ چکا تھا۔ آن ہندوستان کی پہلی رنگین تصویر ہے، علی رضا نے اس کا مکالمہ وغیرہ قلمبند کیا ہے اس لئے مجھے اُس کو دیکھنے کا خیال بھی تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ مُقری صاحب، جنھوں نے اس فلم میں بہت سے تماشے دکھائے ہیں اور بڑی چابکدستی سے اپنے فرائض انجام دئے ہیں بہ نفس نفیس ہم لوگوں کے ساتھ موجود تھے۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے، انٹرول میں، اور کھیل ختم ہونے کے بعد بہت سے لوگوں کی نگاہیں انھیں پر جمی ہوئی تھیں۔

آن کے متعلق زیادہ لکھنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ کہانی اچھی ہوتی تو شائد فلم بھی اچھا بن جاتا لیکن اسے محض رنگ اور حرکت وعمل کے بھروسہ پر کامیاب بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دلیپ کمار بہت اچھا ہے۔ نمی کسی قدر OVER ACTING کرتی ہے اور نادرہ میرے خیال میں اپنے فرائض بڑی

خوبی سے انجام دیتی ہے یوں کھیل بے معنی سا ہے، پھر بھی اُس کے بعض نقوش ذہن میں بس کر رہ جاتے ہیں۔

۱۲ستمبر جمعہ دوپہر - ابھی صبح کے سات بجے ہوں گے کہ علی عباس، جن سے میری ایک ماموں زاد بہن منسوب ہے مع بیوی بچوں کے آ گئے۔ انھیں لکھنؤ سے میرے بمبئی جانے کی اطلاع ملی تھی۔ بے حد خوشی ہوئی کیونکہ مجھے اُن سے ملنا بھی تھا اور مکان بھی معلوم نہیں تھا۔ انھیں کے ذریعہ میں نے برادرم سبط حسن خیال ماہلی کو اطلاع کرادی کہ میں معلوم نہیں یہاں سے نکل سکوں یا نہ نکل سکوں مجھ سے ہوٹل ہی میں مل لیں۔ موصوف دس بجے پہونچ گئے۔ بیدی اور مجروح کا انتظار کر کے ہم تاج محل ہوٹل روانہ ہوئے کہ ڈاکٹر واٹسن کا پتہ لگائیں اور جانے کے متعلق آخری معلومات فراہم کر لیں - ہوٹل دو بجے چھوڑنا تھا، پہلے یہ طے ہوا تھا کہ اسباب خواجہ احمد عباس کے یہاں رکھیں گے لیکن اب یہ طے ہوا کہ تاج محل ہوٹل ہی میں TWA والوں کے پاس رکھوا دیں گے ابھی چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ ایک کار رُکی اور اُس میں سے ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ اُترے۔ سبط حسن بھائی نے اُن سے تعارف کرایا، خاں صاحب کا بہت بڑا کارخانہ بمبئی میں ہے۔ لکھ پتی ہیں، جہازوں کی مرمت کے ماہر ہیں اور بہت نیچی سطح سے اس حیثیت تک پہونچے ہیں۔ انھیں کے کار میں تاج پہونچے، ڈاکٹر واٹسن وہاں سے نکل چکے تھے اور معلوم ہوا کہ آتے ہی ہم لوگوں کو دریافت کیا۔ وہاں سے خاں صاحب اپنے خوبصورت فلیٹ پر لے گئے، خاطر تواضع کی اور اپنے کارخانہ جانے میں ہم لوگوں کی وجہ سے دیر کی۔ سبط حسن بھائی کا

بہت خیال کرتے ہیں اُنھیں کے تعلق سے ہم پر بے حد مہربان تھے۔ اپنے ساتھ اپنے کارخانہ میں لے گئے اور جہازوں کے پُرزوں کی مرمت ہوتے ہوئے دکھایا۔ اپنے ایک عزیز کے نام امریکہ میں ایک تعارفی خط بھی دیا ہے ؎

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے   ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

۱۳ ستمبر صبح جہاز میں - کل ایک بجے کے بعد لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ جہاز میں اتنا سکون، لطف اور آرام ہے کہ اِسے پورا کئے دیتا ہوں۔ اس وقت میری گھڑی میں دس بجے ہیں مگر حقیقتاً کیا وقت ہے معلوم نہیں۔

کل ابھی لنچ سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ علی رضا آ گئے۔ اس درمیان میں میں نے چند لمحے نکال کر دو دو سطریں لکھ کر بعض عزیزوں اور دوستوں کو الوداع کہا تھا۔ کھا پی کر نکلے تو تین بج رہے تھے۔ اسباب ٹیکسی میں لاد کر تاج محل ہوٹل پہونچے۔ ڈاکٹر والٹسن پھر کہیں جا چکے تھے، کارڈ چھوڑا، اسباب چھوڑا اور نکل کھڑے ہوئے۔ ہمیں ساڑھے آٹھ بجے پھر یہاں پہونچ کر TWA کے اسٹیشن ویگن میں ہوائی اڈے سانٹا کرز روانہ ہونا تھا۔ ساڑھے تین بجے کے بعد ٹیکسی تھی اور ہم اور بمبئی کی سڑکوں کی سیر، میں نہیں کہہ سکتا ہم کتنی دور چلے، کہاں کہاں سے گذرے، تھوڑی دیر کے بعد میرین ڈرائیو پر ضرور پہونچ جاتے تھے۔ پانچ بجے کے قریب چوپاٹی کے قریب مچھلیوں کے عجائب خانے TARAPOREWALA AQUAREUM سے گذرے تو خیال ہوا کہ دیکھ لیں۔ چھوٹی سی خوبصورت عمارت میں مچھلیوں، سمندری سانپوں، کیڑوں، مکوڑوں، سیپ، موتی مونگا وغیرہ کے نادر نمونے رکھے ہوئے ہیں۔ خوبصورت،

عجیب اور اپنے غرور میں پانی کے اندر تیرتی، رقص کرتی ہوئی مچھلیاں۔ تھوڑی دیر دل بہلانے کے لئے بہت اچھی جگہ ہے۔

وہاں سے مالا بار ہل پہونچ گئے۔ یہ دولت مندوں کی دنیا ہے، خوبصورت اور شاندار محل، پہاڑیوں کی بلندی پر رکھی ہوئی حسین وجمیل عمارتیں یہیں رضا نے آغا جانی کاشمیری صاحب سے ملایا۔ فلمی دنیا میں بڑی شہرت رکھتے ہیں، اپنے رکھ رکھاؤ، اہلیت اور اخلاق کی وجہ سے اس دنیا میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، جہاں پریم چند کو بے عزتی کا سامنا ہوا۔ فلمی دنیا کے ادیبوں کی زندگی اور بے قدری پر افسردہ ہیں۔ دیر تک باتیں ہوئیں اور موصوف سے مل کر خوشی ہوئی۔ وہاں سے نکل کر پھر "ناز" پہونچ گئے۔ اِس کیفے سے بمبئی کا بڑا حصہ صاف نظر آتا ہے کچھ وقت وہاں گذار کر HANGING GARDEN (باغ معلق) میں چہل قدمی کرتے رہے۔ یہ باغ تالاب کے اوپر بنا ہوا ہے، سمندر کا نظارہ یہاں سے خوب ہوتا ہے۔

سات بجے میرین ڈرائیو پر ہم لوگوں کو چھوڑ کر علی رضا چلے گئے کہ میں ابھی آتا ہوں۔ بندۂ خدا نے یہ بھی نہیں بتایا کہ رات کو مقری صاحب کے یہاں کھانا کھانا ہے۔ ساڑھے سات بجے علی رضا کے بجائے مقری صاحب میرین ڈرائیو سے آکر ہمیں لے گئے۔ الجھن یہ تھی کہ کھانا کھانے کی سکت نہ تھی اور ساڑھے آٹھ بجے تاج محل ہوٹل پہونچ جانا چاہتے تھے۔ مقری صاحب اور رضا کی خواہش یہ تھی کہ ہم TWA کی کار کے بجائے ان کے ساتھ اطمینان سے چلیں، اسباب ایروڈروم بھیج دیں۔ لیکن یہ بات کچھ مناسب نہیں معلوم ہوئی۔ مقری صاحب کے یہاں

جوس توں کافی کھالیا اور تاج محل پہونچ گئے۔ ڈاکٹر واٹسن پھر نہیں ملے اور طے یہی ہوا کہ اب موصوف سے ایرڈوروم ہی پر ملیں گے۔ میں نے سبط بھائی کو اصرار کرکے رخصت کردیا لیکن مقری صاحب، رضا، عباس اور احترام مع ہار اور کیمرہ کے سانٹاکروز چلنے اور باقاعدہ رخصت کرنے پر مُصر تھے، چارہ ہی کیا تھا۔ میں اور ڈاکٹر شرد کمار اور لوگوں کے ساتھ TWA کار میں اور یہ لوگ مقری صاحب کی موٹر میں سانٹاکروز روانہ ہوگئے۔

صبح ہم لوگوں نے سفر کی بیماری سے بچنے کے لئے AVOMINE کی ایک گولی کھالی تھی اور دوسری جہاز چھوٹنے سے ایک گھنٹہ پہلے کھائی۔ میرے لئے پہلا ہوائی سفر تھا، معمولی سی ذہنی اُلجھن ضرور تھی مگر بہت سے لوگوں کو یہ ظاہر بے فکر دیکھ کر میری پریشانی میں کمی تھی۔ ایروڈروم روشنیوں سے جگمگا رہا تھا، کئی جہاز کھڑے تھے، سامنے ہمارا چار انجنوں والا TWA CONSTELLATION کا STAR OF IOWA نامی جہاز تیار تھا۔ وہاں پہونچتے ہی ڈاکٹر واٹسن سے ملاقات ہوئی، اس محبّت اور بزرگانہ شفقت سے ملے کہ دل خوش ہوگیا۔ اپنے لڑکے سے ملایا، معمولی باتیں کرنے کے بعد اسباب کا وزن پوچھا۔ اس سفر میں ہر شخص صرف ۶۶ پونڈ سامان لے جاسکتا ہے۔ بہت سی کتابیں اور کچھ کپڑے بھیج دینے کے بعد بھی میرا سامان ۹۰ پونڈ نکلا، میں نے بتایا اور انھوں نے انتظام کردیا، بہرحال سامان تولا گیا، ٹکٹ چیک ہوا اور سب کسٹم کے لئے بھیجے گئے۔ کسٹم افسر نے ازراہ مہربانی مجھے بکس بھی کھولنے نہیں دیا اور ہنس کر کہا آپ پڑھنے پڑھانے جارہے ہیں آپ کے پاس کیا ہوگا! غالب کا شعر یاد آگیا ؎

ہے اعتبار مرے بخت خفتہ پر کیا کیا ۔ وگرنہ ہم کہاں چشم پاسباں کے لئے

پھر پاسپورٹ چیک ہوا، صحت کے کاغذات دیکھے گئے اور اب ہم لوگ جہاز کے چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ اسی درمیان میں موقع نکال کر مقری صاحب اور رضا وغیرہ نے ہار پہنا کر ہم لوگوں کے ساتھ تصویر کھنچوائی جب گیارہ بجنے میں سات آٹھ منٹ رہ گئے اُس وقت اعلان ہوا کہ اب اس جہاز سے جانے والے سوار ہوں۔ سب سے رخصت ہوکر ہم لوگ جہاز کے اندر پہونچے۔ ساٹھ مسافر لے جانے والا جہاز ہے، اندر بڑی وسعت ہے، ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں، کرسیاں آرام دِہ ہیں جنھیں نیم دراز ہونے کے لئے نیچے اوپر بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے رخصت ہوتے ہوئے ڈاکٹر واٹسن نے بعض ضروری ہدایتیں کی تھیں کیونکہ ہم لوگ نیویارک اتوار کے دن پہونچ رہے ہیں۔ جہاز کے اندر اس وقت جہاز کے افسر اور میزبان فِضا AIR HOSTESS کے علاوہ صرف بیس مسافر تھے۔ جس نے جو جگہ پسند کی وہاں بیٹھ گیا۔ جہاز کے ریڈیو نے اعلان کیا کہ سفر شروع ہوتا ہے لوگ اپنی پیٹیاں کس لیں اور ہوشیار ہوجائیں، گھبرائیں نہیں ہم ایک مبارک سفر پر روانہ ہورہے ہیں۔ انجن گونجا اور جہاز ایروڈروم کی زمین پر دوڑنے لگا۔ ہماری سیٹوں کے سامنے جہاز اور سفر کے متعلق ضروری معلومات وغیرہ کے کچھ کاغذات لگے ہوئے تھے، انھیں اٹھا کر دیکھنے لگے۔ جہاز راں کمپنی کے دئے ہوئے بیگ میں میں نے بعض کتابیں بھی رکھ لی تھیں اور لکھنے کے کاغذات بھی۔ جہاز اوپر اُٹھا تو حرکت کا معمولی سا اندازہ ہوا اور جب فضا میں تیرنے لگا تو یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ ہم چل رہے ہیں یا ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مجھے نہ جانے کیوں یک گونہ مسرّت اور لُطف کا احساس ہوا لیکن

بمبئی سے باہر نکل کر جہاز اندھیری رات میں گم ہوگیا۔

چند لمحوں کے بعد میزبان فضا نے پیپرمنٹ وغیرہ کی چند ٹکیاں وقت گذاری اور چکّر سے بچنے کے لئے دیں، لوگ دھیرے دھیرے روشنیاں گُل کرکے سوگئے، کسی نے اپنے اوپر کمبل ڈال لیا کوئی یونہی۔ ہمارے ساتھ جو مسافر ہیں اُن میں کچھ قاہرہ جارہے ہیں، کچھ روم اور کچھ پیرس، چند نیویارک کے ہیں۔ ہندوستانی پانچ چھ ہیں جن میں سے ایک مدراسی خاتون اکیلی اپنے شوہر کے پاس امریکہ جارہی ہیں۔ اُن کے جو عزیز پہونچانے آئے تھے ہم سے خیال رکھنے کو کہہ گئے ہیں تا بعض اپنے خرچ سے تعلیم حاصل کرنے جارہے ہیں۔ میرے لئے ہوائی سفر کا یہ پہلا تجربہ لُطف انگیز ہے۔

قاہرہ سے نکل کر جہاز میں ۔ رات جب سفر شروع ہوا تو آسمان پر چاند بھی نہیں تھا، بمبئی کی روشنی نے کچھ دُور تک ساتھ دیا پھر خلا کے اندھیرے میں کسی روشنی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میری بھی آنکھ لگنے لگی۔ میں نے اپنے اوپر کمبل ڈال لیا اور سوتا جاگتا رہا۔ بحیرۂ عرب، بحرِ ہند، بحیرۂ فارس سے ہم کب گذرے خبر نہیں۔ چار بجے صبح کو کریو (یعنی جہاز میں کام کرنے والے) نے آکر جگایا کہ ظہران آگیا اور ہم سعودی عرب کے ہوائی مستقر پر اتر رہے ہیں۔ پٹّیاں کس لی گئیں اور جہاز ظہران کی طیرگاہ پر منڈلانے لگا۔ نیچے روشنی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے ذرّے چمک رہے ہوں۔ یہ سعودی عرب کا کوئی بڑا شہر نہیں ہے میں نے اس کا نام پہلی دفعہ سُنا ہے۔ مٹّی کے تیل کے قرب کی وجہ سے اہمیت اختیار کررہا ہے، یہاں امریکی فوجی اڈّا ہے اور امریکہ ہی نے اس مستقر کو تیار کیا ہے۔

رات ختم کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ صاف شفاف آسمان پر تقریباً چوتھائی چاند لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا کہ جہاز زمین پر اُترا۔ جہاز کے پہیوں کے زمین پر چھونے کا ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا اور بس۔ اپنے اپنے پاسپورٹ لیکر ہم جہاز سے باہر آئے۔ ہوا گرم تھی اور مستقر کی عمارتوں اور دو چار جہازوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ تھوڑی دیر ہم لوگ اڈے کی آرام گاہ میں بیٹھے رہے مسافروں میں آپس میں جیسی باتیں ہوتی ہیں ہوتی رہیں تقریباً پچاس منٹ کے بعد اطلاع دی گئی کہ جہاز میں سوار ہو جائیے۔ جہاز کی سیڑھیوں پر پاسپورٹ واپس ملا جس پر سعودی عرب حکومت نے اپنی مُہر لگا دی تھی۔ میں نے اپنی گھڑی دیکھی چھ بج چکے تھے مگر ابھی رات کافی تھی، کریو نے اپنی گھڑی دیکھ کر بتایا چار بج کر ۲۰ منٹ ہوئے ہیں۔ کمریں پھر کس لی گئیں جہاز نے پھر میدان میں چکر لگائے، اوپر اُٹھا اور چل کھڑا ہوا۔ کدھر؟ کچھ نہیں معلوم، نیچے کیا ہے؟ کچھ نہیں معلوم۔

ذرا سی پھر آنکھ جھپک گئی۔ مگر میری روح سرزمینِ عرب کی صبح دیکھنے کے لئے بے چین تھی اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا اور صبح کی نمود کے آثار شروع ہو رہے تھے۔ گھور گھور کر زمین کی طرف نگاہ کی تو پہاڑوں اور چٹانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ ذرا اور روشنی ہوئی، صرف پہاڑ، ہر طرف پہاڑ، نہ سبزہ، نہ درخت، نہ برگِ نخیل، نہ آبادی، نہ چشمے، صرف پہاڑ۔ غالباً ہم عرب کی حدوں کو پار کر رہے تھے۔ جہاز اٹھارہ ہزار فٹ کی اونچائی پر پرواز کر رہا تھا اور ہمارا رُخ قاہرہ کی طرف تھا۔

میزبانِ فضا اور کریو ہمہ تن اخلاق ہیں، سب کی ضرورتیں پوچھ رہے ہیں،

سب سے مُسکرا رہے ہیں، اُن کی چُست وردیاں، پھرتی اور ہمدردانہ سرگرمی سے صبح بارونق معلوم ہو رہی ہے، نیچے پہاڑوں کے سوا کچھ نہیں۔ اب ناشتہ آیا۔ کرسی کے پیچھے سے لوہے کی ایک چھوٹی سی میز نکال کر سامنے کرسی میں فٹ کر دی گئی۔ میزبان فضا نے ایک کشتی میں بہت سا سامان لا کر رکھ دیا۔ انڈے، بسکٹ، مکھن، جلی، توس، دو بڑے بسکٹ، کافی، پھلوں کی ملی جلی میٹھی سلاد، دُودھ، سب چیزیں چھوٹے چھوٹے کاغذ کے گلاسوں اور لفافوں میں نمک، مرچ اور شکر کے خوبصورت لفافے۔ ہلکی پھلکی چیزیں مگر کافی۔ مُنہ بھی نہیں دھویا اور ان نعمتوں سے لُطف اُٹھا لیا۔ اِدھر اُدھر پہاڑ ہیں اور ریگزار۔ جہاز کے ریڈیو نے اعلان کیا کہ اب عقبہ کی سرزمین آ رہی ہے۔ ایک کریو نے نقشہ لا کر دکھایا کہ ہم یہاں سے گذر رہے ہیں۔ ہمارے اور زمین کے درمیان کہیں کہیں بادل حائل ہو جاتے ہیں اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کم سے کم مجھے عقبہ نظر نہیں آتا۔ جب میری گھڑی میں دس بجنے کے قریب تھے، سمندر نظر آیا، پھر خشکی، پھر سمندر، پھر خشکی۔ شائد ہم مصر میں داخل ہو رہے تھے۔ کتنی منزلیں قدم اُٹھائے بغیر طے ہو گئی تھیں اور قاہرہ قریب تھا۔ ایک کریو کی گھڑی دیکھی تو اُس میں سات بج رہے تھے۔ ریڈیو نے اعلان کیا کہ قاہرہ ایرہ ڈورم قریب ہے، پیٹیاں کس لی جائیں۔ لیجئے! فراعنہ مصر کی پُراسرار سرزمین آ گئی۔ وادیٔ نیل کے قریب جگہ جگہ سبزہ نظر آنے لگا، پھر آبادیاں دکھائی دیں، پھر کھیت اور نہریں، کھجور کے باغ، سڑکیں۔ مگر ابھی جہاز بہت اوپر ہے زمین اور آبادیوں کی وسعت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ جہاز نیچا ہوا، منڈلایا

اور قاہرہ کے بین الاقوامی ہوائی مستقر پر اُتر پڑا۔ یہاں بہت سے اور جہاز کھڑے ہوئے ہیں۔ بہت وسیع مستقر ہے، قریب ہی مصری فوج کے ہوائی جہاز بے ترتیب حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ قاہرہ پہونچ گئے مگر کیا دیکھا، کچھ بھی نہیں۔ نہ قاہرہ کا شہر، نہ اہرام، نہ مصر کی بدلی ہوئی حالت۔

نیچے اُترے، پاسپورٹ لے لئے گئے، اُترنے کا ایک کارڈ دے دیا گیا اور ہم رِسٹراں میں چلے گئے۔ بہت کھلا ہوا صاف سُتھرا رِسٹراں ہے۔ اِس مستقر کا نام فاروق ایرفیلڈ ہے، غالباً بدلا جائے گا یا شائد نہ بدلا جائے۔ یہاں ایک گھنٹہ ٹھہرنا ہے۔ اِس رِسٹراں کے باہر کہیں آ جا نہیں سکتے۔ انگریزی کا کوئی اخبار دکھائی نہیں دیتا۔ جیب میں ۱۵۰ ڈالر کے چکوں کے سوا اور کچھ نہیں، مصری نمونے اور وضع کی کچھ چیزیں بک رہی ہیں، قیمتیں بھی نہیں پوچھیں، پوچھ کر کیا ہوگا۔ میرے ساتھی شرد کمار کو سفر سے کچھ تکلیف ہے۔ میں عام دنوں سے بھی زیادہ چاق چوبند ہوں، زیادہ حرکت اور قوت کا احساس کر رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ یہاں کے متعلق کچھ جانوں، کچھ سمجھوں مگر کس طرح؟ افسوس ہے مجھے عربی نہیں آتی تاہم میں نے ایک مصری بیرے سے الٹی سیدھی باتیں کیں۔ سامنے ایک شہر ہے اُس کا نام حلبیہ ہے اُس کے پیچھے قاہرہ ہے، کچھ آگے بڑھ کر مشہور اہرام اور ابوالہول ہیں۔ اِدھر وادیٔ نیل ہے اور اُس کے آگے اسکندریہ — کوئی نقشہ بھی نہیں کہ سمتوں کا اندازہ لگا سکوں۔ مسافروں سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں، وہ بھی کچھ نہیں جانتے — ایک گھنٹہ گذر جاتا ہے، پاسپورٹ واپس ملتے ہیں،

جہاز میں سوار ہونے کا اعلان ہوتا ہے، پیٹیاں کسی جاتی ہیں۔ ریڈیو اعلان کرتا ہے کہ ہم قاہرہ کے اوپر اُڑیں گے، وادیٔ نیل سے گذر کر اسکندریہ پار کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی زرخیز سرزمین مجھے کہیں اور نظر نہیں آئی، کھیت چوکور اور صاف ستھرے ہیں، باغ ترتیب سے ہیں۔ مکانات چھوٹے چھوٹے گھروندے اور دھبے سے نظر آتے ہیں لیکن سبزے کی فراوانی ہے۔ نیل اور اس کی شاخوں میں کشتیاں تیر رہی ہیں جیسے بچّوں کی کاغذ کی ناؤ۔ مصری سیاست بھی اسی طرح ڈانوا ڈول ہو رہی ہے۔ نیچے شہر آتے ہیں، آبادیاں آتی ہیں، صحرائے اعظم آتا ہے اور ہم بحیرہ رُوم کے اوپر پہونچ جاتے ہیں۔ بحیرہ روم سے ملا ہوا اسکندریہ کا شہر خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے برّاعظم دس گیارہ گھنٹوں میں پار ہو گئے۔ اب جہاز کا رُخ روم کی طرف ہے میں نے اپنی گھڑی قاہرہ کے وقت سے ملالی ہے، آگے بڑھ کر جہاں کا جو وقت ہوگا وہاں سے ملالوں گا۔

روم کے راستہ میں۔ بحیرۂ روم کے پانی اور آسمان کے رنگ میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ نیچے اور اوپر ایک ہی رنگ ہے، نیلا۔ صرف افق کے قریب ہلکے سے بادل دھوئیں کی طرح ایک سفید یا مٹیالی سی لکیر کھینچ رہے ہیں ورنہ کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم کہیں کہیں ساڑھے سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہونچ جاتے ہیں۔ ہماری میزبان فضا رسائل اور میگزین لئے آتی ہے، پھر کافی، بسکٹ، مکھن اور جلی لاتی ہے۔ کافی اِس وقت لُطف دے گئی۔ باہر کیا دیکھوں ایک ہی منظر ہے نیچے اور اوپر نیلا رنگ۔

قاہرہ سے کچھ مصری مرد اور خواتین سوار ہوئے ہیں۔ اُن کی وضع قطع، چال ڈھال ہر چیز سے گہرا یورپی اثر نمایاں ہے، عورتیں بے باک ہیں مرد پرشور۔ اور مسافر خاموش کچھ پڑھ رہے ہیں، اونگھ رہے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں، ہنس رہے ہیں، تصویر کھینچ رہے ہیں اور ہر طرف آجا رہے ہیں۔ مناظر دیکھنے کا لطف نہیں، میں بھی باتھ روم میں جاکر خط بنانے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ گیارہ بجے کے قریب ریڈیو نے اعلان کیا کہ داہنے ہاتھ کی طرف جزیرۂ کریٹ نظر آ رہا ہے۔ میں بائیں جانب بیٹھا ہوں اُٹھ کر داہنی طرف چلا جاتا ہوں۔ پہاڑوں اور وادیوں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ ابھی روم تقریباً ڈھائی گھنٹے میں پہونچنا ہے۔ اس خیال سے اُلجھن ہونے لگتی ہے مگر غالباً کچھ دیر میں منظر بدلے گا اور ہم اٹلی کے اوپر اُڑ رہے ہوں گے۔ اب تک ہم نہ جانے کتنے میل چل چکے۔ بمبئی سے ظہران ۱۹۶۱ میل، ظہران سے قاہرہ ۹۸۵ میل، قاہرہ سے روم ۱۳۳۹ میل۔ روم پہونچتے پہونچتے تقریباً پندرہ گھنٹے اور ساڑھے تین ہزار میل ہو جائیں گے۔ اس جہاز کی عام رفتار تین سَو میل فی گھنٹہ ہے۔

روم سے آگے نکل کر۔ جہاز اٹلی کے اوپر سے گذر کر اٹلی کے جنوبی مغربی کنارے کے متوازی اُڑتا رہا۔ داہنی طرف اٹلی کے مناظر نظر آ رہے تھے اور جہاز نیپلس کے قریب پہونچ رہا تھا۔ داہنی جانب پہاڑ اور وادیاں، بائیں جانب بحیرۂ رُوم، اسی جگہ بائیں جانب کیپری کا وہ جزیرہ ہے جہاں شاہ فاروق، سابق والی مصر اب بھی دادِ عیش دے رہے ہیں۔ گھڑی میں سوا بجے تھے کہ

ہماری میزبان نے آہستہ سے شانے پر ہاتھ رکھا، شائد میری آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ لنچ لئے کھڑی تھی۔ میز کرسی میں لگا دیا گیا اور کھانا اُسی اہتمام اور خوبصورتی سے ایک کشتی میں سجا ہوا آگیا جیسے ناشتہ آیا تھا۔ دو انڈے تقریباً اُبلے ہوئے، کولڈ میٹ، سلاد، بسکٹ، مکھن، SNACK، سُوپ، کیلا، وغیرہ اور بعد میں کافی۔ میں نے کچھ کھایا کچھ چھوڑا اور روم پہونچنے کا انتظار کرنے لگا۔ اب سمندر کی سطح پر بادل محیط ہیں۔ ریڈیو نے اعلان کیا ہے کہ کپریؔ کا جزیرہ آگیا۔ مصری مرد اور عورتیں خاص انداز سے اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ ہم بادلوں کے بیچ میں پرواز کر رہے ہیں، کچھ صاف نظر نہیں آتا لیکن کپریؔ کا جزیرہ سمندر میں رکھا ہوا نظر آرہا ہے۔ داہنی جانب مناظر بے حد دلربا ہیں۔ شہر اور قصبے، سڑکیں، بل کھاتی ہوئی ندیاں، کھیت، پہاڑ اور وادیاں بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں، ندیاں سمندر میں گر رہی ہیں، میں کبھی اُٹھ کر اِدھر جاتا ہوں کبھی اُدھر، نہ جانے لوگ اپنے دل میں کیا سوچتے ہوں گے۔ ابھی ریڈیو نے اعلان کیا کہ ہم تقریباً بیس منٹ میں رومؔ کے کیمپیا نو ایر فیلڈ پر اُتریں گے۔ میری گھڑی میں قاہرہ کا وقت ہے غالباً روم میں بدلنا ہوگا، اب روم نظر آرہا ہے۔ مناظر کی خوبصورتی ناقابل بیان ہے۔ ترشے ہوئے کھیت اور سڑکیں، نہریں، آبادیاں ہمارے دونوں طرف ہیں۔ اُن کے حُسن کی مرقع کشی مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ فطرت کی فیاضی اور انسان کی صدیوں کی محنت نے اِس علاقہ کے حُسن و جمال میں برابر اضافہ کیا ہے۔ ہزاروں مربع میل میں پھیلے ہوئے بڑے بڑے کھیت، فارم، سڑکیں، چمن، نہریں، دریا۔ یہاں کیا نہیں ہے! پھر روم کا وسیع شہر، جس کا نظارہ دُور سے

بھی دل و دماغ کو مسحور کر لیتا ہے۔ شائد امریکہ سے واپسی میں یہ شہر دیکھنے کا موقع ملے۔

ہمارا جہاز روم کے کیمپیانو ہوائی اڈے پر اُترا۔ وہاں تقریباً ہر ملک کے جہاز کھڑے نظر آئے۔ ایک گھنٹہ کے قیام میں رسٹراں کے اندر لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ آج پہلی دفعہ ایک ہی مقام پر کثرت سے اطالوی مرد اور عورت نظر آئے۔ ان کے رنگ تُونسے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں قاہرہ والی پارٹی اُتر گئی۔ ہمارا سفر سب سے طویل ہے اس لئے ہم جہاز میں طرح طرح کے لوگوں کو آتے جاتے دیکھتے رہے۔ میرا خیال ہے اگر زبان نہ آتی ہو تو کسی ملک کا پورا لطف نہیں اُٹھایا جا سکتا ہر شخص انگریزی نہیں جانتا۔ اٹلی سے جہاز روانہ ہوتے ہوئے کیمپٹن نے ریڈیو سے کہا کہ ہم پیرس روانہ ہو رہے ہیں ساڑھے سترہ ہزار فٹ کی بلندی سے گذریں گے۔ پیسا، میلان، آلپس اور برن ہو کر پیرس پہونچیں گے۔ موسم اچھا ہے، آلپس کے مناظر پُر لطف ہوں گے۔ اب جہاں تک مناظر کے دیکھنے کا تعلق ہے ہم پیرس ہی تک لطف بھی اُٹھا سکتے ہیں اُس کے بعد رات ہو جائے گی اور صرف اتلانٹک کے اوپر اُڑتے ہوئے صبح کو نیویارک پہونچ جائیں گے۔ روم میں جب جہاز اُتر رہا تھا تو سر چکرا رہا تھا، میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی حد کر دی ہے۔ تھکا ہوا ہوں پھر بھی باہر دیکھے جا رہا ہوں۔ فی الحال لکھنے میں جی نہیں لگ رہا ہے۔ ہماری میزبان کافی لا رہی ہے۔ یہ تھکتی نہیں، کیا محض تنخواہ کے لئے دوڑ رہی ہے یا اس میں خدمت کا جذبہ بھی کسی قدر بیدار ہے؟ مجھے دوسری بات کا شائبہ بھی نظر آ رہا ہے۔ اب پیرس سے باہر نکل کر آگے کی داستان لکھوں گا۔

پیرس اور شینن کے درمیان — روم سے ۱۷ میل شمال مغرب کی طرف چل کر پیسا کا

ساحلی شہر بِلا اور تھوڑی ہی دیر میں نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ وہاں کا مشہور جھکا ہوا مینار مجھے نہیں دکھائی دیا۔ مناظر وہی ہیں جو اٹلی میں داخل ہوتے ہوئے نظر آئے تھے بلکہ کسی حد تک اُن میں اور مصری مناظر میں بھی یکسانیت ہے۔ پھر بِلان کا شہر آیا اور اُس کے ختم ہوتے ہی آلپس کا سلسلۂ کوہ شروع ہوگیا۔ آلپس میلوں تک ایک حصار بنا کھڑا ہے، اُس کی سفید چوٹیاں ایک دوسرے کے مقابل سینہ تانے کھڑی نظر آتی ہیں۔ سورج کی تیز روشنی میں آلپس کا جلال وجمال خیرہ کن اور ہوش رُبا ہے۔ اگر اس کی یہ عظمت ہے تو ہمالیہ کی کیا ہوگی! آلپس پر برف سفید رنگ کے چمکدار پاؤڈر کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ اُس کی چوٹیوں کے نشیب و فراز دیکھ کر غالب کے "جوہر تیغ کہسار" کی یاد آتی ہے اور یہ بلند وبالا مانٹ بلانک، یورپ کا سب سے اونچا پہاڑ! بادل اس کی گود میں سوئے ہوئے ہیں اور حضرتِ انسان نے اُس کی وادیوں میں بھی گھر بنا لئے ہیں۔ جہاز تو اوپر سے گذر جاتا ہے انیسویں صدی کی ابتداء میں نپولین کی فوجوں نے اُسے کس طرح پار کیا ہوگا؟ مگر انسان کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں! آلپس یقیناً دنیا کے حسین ترین کوہستانوں میں سے ہے۔ جہاز میں جس کے پاس اچھے کیمرے تھے انھوں نے اس کے جلال وجمال کو قید کرنے کی کوشش کی ہے، میں اس قدر حیرت زدہ ہوں کہ لفظوں میں اِسے قید نہیں کر سکتا۔

آلپس پیچھے چھوٹ گیا اب ہم غالباً اٹلی کے باہر ہوگئے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دُور پر شہر اور قصبے، ندیاں اور کھیت نظر آجاتے ہیں۔ آگے سوئزرلینڈ ہے۔ سفید دودھ کی طرح، روئی کے دھنکے ہوئے گالوں کی طرح بادل فضا میں تیر رہے ہیں

اور ہم ان کے اوپر پرواز کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے نیچے کے شہروں میں بادل گھرے ہوں گے ممکن ہے بارش بھی ہو رہی ہو، ہم البتہ سورج کی تیز روشنی میں ہیں۔ بادلوں کی وجہ سے جہاز کو اوپر رکھنا پڑتا ہوگا کہ کہیں بادلوں میں چھپی ہوئی پہاڑ کی کوئی چوٹی نہ ہو! بھولے بھٹکے کہیں کہیں نیچے شہر، قصبے اور سڑکیں نظر آجاتی ہیں۔ پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوا تو جہاز کچھ نیچے آیا ——اب زمین ہموار ہے اور سبزے سے بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے، مکانات اور عمارات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کیا ہم پیرس میں ہیں؟ اور کیپٹن نے ریڈیو سے کہا کہ پیٹیاں کس لیجئے، ہم چند لمحوں میں پیرس کے ہوائی اڈے آرلی پر اُتر رہے ہیں۔ نظارہ کی ساری طاقت سمیٹ کر میں نے پیرس کو دیکھا۔ اُس کی وسعت کا اندازہ لگانا مشکل ہے، ہر طرف عمارتیں، مکانات، باغات، سیدھی خوبصورت سڑکیں۔ جن عمارتوں کی تصویر سے نگاہ آشنا ہے اِس بلندی سے وہ بھی پہچانی نہ جاسکیں۔ سین ندی البتہ چھپنے والی چیز نہیں تھی۔ اوپر سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک شہر نہیں کئی شہروں کا مجموعہ پیش نظر ہے۔ آسمان صاف تھا اور پیرس سورج کی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ چکر لگا کر جہاز آرلی کے ہوائی مستقر پر اُترا اور ہم کہنے ہی کو سہی اِس نشاط آور خوابوں اور خوشبوؤں کی بستی میں پہونچ گئے۔ شام ہو رہی تھی، باہر ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ ہوائی اڈے کی عمارت سادہ اور پرکار ہے، تحائف کی دوکانیں رنگ و بو کا خزانہ معلوم ہوتی ہیں۔ ہزارہا آدمی آجا رہے ہیں اور درجنوں جہاز زمین اور آسمان کی حدیں ملا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیرس کا ہوائی اڈہ شہر سے کچھ بہت دُور نہیں ہے، سامنے عمارتیں

اور سڑکیں نظر آ رہی ہیں۔ کیسے پیرس کو دیکھ لوں؟ امریکہ کی واپسی میں ضرور آؤں گا۔

تقریباً ایک گھنٹہ کے قیام کے بعد پھر کوچ کا نقارہ بجا۔ جہاز وہی ہے لیکن سارے کریو بدل دئے گئے ہیں، میزبان فضا بھی دوسری ہے، اتنی جاذب نگاہ نہیں جتنی پہلی تھی۔ کچھ مسافر چلے گئے ہیں بلکہ پانچ چھ کے سوا سب نئے ہیں، جہاز پورا بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیپٹن نے اعلان کیا ہے کہ جہاز شینن میں بھی ٹھہرے گا۔ پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ پیرس سے سیدھے نیو یارک جائے گا۔ جان نکلی ہوئی تھی کہ تقریباً ساڑھے تین ہزار میل کا مسلسل سفر کیا حالت کر دے گا۔ میں واقعتاً ۲۸ اگست سے اور ذہنی طور پر شروع جولائی سے سفر میں ہوں، اب طبیعت اکتا رہی ہے۔ فرانس سے باہر نکلتے ہوئے سورج ڈوب چکا تھا اور فرانس اندھیرے میں نہا رہا تھا لیکن افق پر خوبصورت سرخی باقی تھی۔ ہم بات کی بات میں رُودبار انگلستان سے گذر گئے اور انگلستان کی سرزمین آ گئی۔ کپتان نے آٹھ بجے کے قریب اعلان کیا کہ دُور پر لندن کی جھلک دیکھ لیجئے۔ واقعی یہ محض جھلک ہی تھی۔ لندن اپنی وسعت اور روشنی کا رعب ڈال کر او جھل ہو گیا مگر اس کے بعد سے جو روشنی کا سلسلہ شروع ہوا ہے وہ اُس وقت تک رہا جب تک کہ ہم انگلستان پار نہیں کر گئے۔ نیچے جہاں تک نگاہ جاتی تھی بجلی کے قمقموں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ چپّہ چپّہ پر نور کا جال سا بنا ہوا۔ سبز، نیلے، سُرخ ہر رنگ کے قمقمے، ان کی سیدھی اور بل کھائی ہوئی قطاریں۔ ظاہر ہے کہ یہ روشنیاں صرف سڑکوں ہی کی ہوں گی، شہروں اور قصبوں کی عمارتوں کے اندر کیا حال ہو گا! غالباً نور کے بڑے بڑے مرکز

ساؤتھمپٹن ، برائٹن ، سیلسبری ، برسٹل ، کارڈف اور سوان سی رہے ہوں گے اور باقی قصبے اور گاؤں۔ انگلستان کے اوپر سے گذر گئے تو گویا اٹلانٹک کے حدود میں داخل ہوگئے۔ اب پھر سمندر ہے اور اندھیرا۔ نو بجنے کے قریب ہیں لیکن مغربی افق پر اب بھی سرخی باقی ہے۔ دور پر پھر برقی قمقمے نظر آنے لگے ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہم آئرلینڈ میں ہیں اور شینن بالکل قریب ہے۔ ابھی کھانا کھایا ہے۔ شینن بھی گذر لے تو سونے کی فکر ہوگی۔ میں نے کہہ تو دیا کہ نو بجنے کے قریب ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے وقت کا صحیح اندازہ نہیں، گھڑی مجھ سے برابر جھوٹ بول رہی ہے۔ ایک امریکی جو میرے پاس بیٹھا ہے گھوڑ دوڑ کا رسیا ہے، آغاخان کی ایک سوانح عمری پڑھ رہا ہے اور مجھ سے اُن کے متعلق پوچھ رہا ہے۔ اُسے حیرت ہے کہ نہ میں اُن کا مقلد اور پیرو ہوں اور نہ اُن سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں۔ جیسے اُن کی نگاہیں کہہ رہی ہوں "احمق کہیں کے"۔

شینن سے نیویارک ۔ شینن آئرلینڈ کے جنوبی مغربی حصے میں ہے۔ یہاں بھی ہوائی اڈے کی عمارت خوبصورت اور آراستہ ہے، کتابوں اور دوسری چیزوں کے اسٹال سے کسی قدر آئرش قومی تعصب کا پتہ چلتا ہے۔ گو یہ بات تو ہر جگہ ہوتی ہے کہ دوکانوں پر وہیں کی خصوصیات سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہوتی ہیں لیکن یہاں یہ بات کچھ زیادہ نمایاں تھی۔ بمبئی میں قیام گاہ وغیرہ کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، خبر نہیں وہاں کیا حالت ہے۔ شینن کے ہوائی مستقر میں ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ایک طرف سے اپنی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ڈی این مزمدار آتے ہوئے دکھائی دئے، حیرت اور خوشی سے ملے۔ انھیں

خیال تھا کہ میں آخر ستمبر میں پہونچوں گا، میں سمجھتا تھا کہ وہ پہونچ چکے ہوں گے۔ جو چیزیں میرے ذمّہ کر آئے تھے اُن کی خیریت پوچھنے لگے، میں نے کہا اپنی چیزیں چھوڑ کر انھیں ساتھ لایا ہوں، بہت خوش ہوئے۔ اب نیویارک ہی میں ان کی امانت انھیں کل لوٹا دوں گا۔ کوچ کا اعلان ہوا پہلے وہ اپنے جہاز میں اور پھر میں اپنے جہاز میں۔

جہاز میں بیٹھ کر معلوم ہوا تھا کہ ہم گینڈر کے ہوائی اڈّے پر بھی اُتریں گے۔ گینڈر نیویارک سے تقریباً گیارہ سَو میل کی دُوری پر جزیرہ نیو فاؤنڈلینڈ میں ہے۔ سوتے جاگتے ہم نے اتلانٹک پار کرلیا اور گینڈر کی گھڑیوں کے حساب سے دو بجے رات کو وہاں پہونچ گئے۔ اور جگہوں کے مقابلے میں یہاں کچھ ٹھنڈک تھی، بوندیں بھی تیز پڑ رہی تھیں۔ یہاں بہت ذرا دیر قیام رہا، صرف صحت کا سرٹیفکٹ دیکھا گیا اور ہم چار گھنٹہ کے سفر پر نیویارک روانہ ہوگئے۔ ہاں ایک بات اور یاد آئی جب شینن سے جہاز روانہ ہو رہا تھا تو کیپٹن نے ریڈیو سے لائف بلیٹ کے استعمال کے طریقے سمجھائے تھے۔ اُس کا استعمال خطرے کی اس حالت میں ہوتا ہے جب جہاز سے کودنا پڑے۔ میں سوچتا رہا کہ اگر اس کی ضرورت پڑی بھی تو اتلانٹک میں کہاں کودیں گے اور کہاں جائیں گے شینن ہی سے نکل کر امریکی کسٹم کے فارم کی خانہ پُری بھی کرائی گئی۔

۱۴ ستمبر اتوار۔ گینڈر سے نیویارک جاتے ہوئے زیادہ تر اندھیرا ہے، کسی جانب کچھ نظر نہیں آتا اور گیارہ سَو میل کا سفر درپیش ہے۔ جہاز کناڈا کے مشرقی حصوں کے اوپر سے ہو کر گذر رہا ہوگا۔

کچھ دیر کے بعد صبح کے ہلکے ہلکے آثار دکھائی دینے لگے لیکن نیچے صاف کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر ہے اور کبھی بادل۔ روشنی بہت آہستہ آہستہ پھیل رہی ہے۔ صبح ہو چکی ہے مگر کہر اور بادل نے سب کچھ چھپا رکھا ہے۔ ناشتہ ہو گیا اور پیٹیاں کسنے کا حکم بھی ہو گیا، سورج ذرا سا دکھائی دیا پھر غائب ہو گیا، اب ہمارا جہاز نیچے اُترنے کے لئے منڈلا رہا ہے اور بادلوں میں سے ہو کر نیچے آتا جا رہا ہے، بادل کے اُس پار ہوتے ہی زمین دکھائی دی اور یقین ہو گیا کہ ہم نیویارک میں ہیں۔ ہوائی اڈے کی روشنیاں، عمارتیں، جہاز سب دکھائی دے رہے ہیں۔ بلا مبالغہ پچاسوں جہاز سامنے ہیں اور ہزاروں موٹریں، ہزارہا انسان — یہی ہماری منزل ہے۔ ایروڈروم کے دفتر میں پاسپورٹ، ویزا، صحت کے سرٹیفکٹ، کسٹم وغیرہ کی اچھی خاصی جانچ ہوتی ہے لیکن غالباً ایک صاحب کی وجہ سے جو ڈاکٹر واٹسن کے لڑکے کو لینے آئے تھے، کچھ آسانی ہو گئی۔ بات کی بات میں ہمیں چھٹکارا مل گیا۔ ایروڈروم ہی پر میرے اور ڈاکٹر شرد کمار کے نام فاؤنڈیشن کا خط ملا کہ ہم لوگوں کے ٹھہرنے کا انتظام ولنگٹن ہوٹل میں کیا گیا ہے۔ اسباب لدوا کر انھیں صاحب کے ساتھ ہوٹل پہونچے۔ فاصلہ بہت تھا لیکن ٹریفک کا ایسا انتظام ہے کہ دشواری نہیں ہوئی۔ یہاں موٹریں وغیرہ داہنی طرف چلتی ہیں، ہارن کوئی نہیں بجاتا اور سب تیز چلاتے ہیں۔ راستہ میں شہر کا جو حصّہ پڑا وہ حیرت میں ڈالتا گیا۔ یہ ہوٹل نافِ شہر میں براڈوے کے قریب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب سے بارونق اور حسین خطّہ ہے۔ یہاں کی عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور انسان کی مادّی ترقّی کا افسانہ سُناتی ہیں۔

جس کے آنکھیں ہوں وہ دیکھے اور جس کے کان ہوں وہ سُنے۔ دیکھوں میری ان سے کیسی نبھتی ہے۔

منزل مقصود پر پہونچ گیا لیکن ابھی مجھے اندازہ نہیں ہوتا کہ میں مطمئن ہوں، اُلجھ رہا ہوں یا حیرت زدہ!

نئی دُنیا

ہوٹل ولنگٹن ۱۰ بجے رات⁽¹⁾ ۔ ساڑھے دس بجے نہا دھو کر نیچے رسٹراں میں بریک فاسٹ کے لئے گئے ۔ مینو (MENU) سامنے رکھا گیا، کیا کھانا چاہئے کیا نہیں، کھانوں کے فرانسیسی اور امریکی نام، بہت ہمت کر کے بعض چیزوں کا آرڈر دیا، کچھ کھایا کچھ نہیں کھایا چونکہ اسی ہوٹل میں مقیم تھے، بل پر دستخط کر کے باہر نکلے ۔ یہاں ہر موقع پر خدمت کرنے والوں کو بخشش یعنی "ٹپ" دینا لازمی ہے جتنے کا بل ہو تقریباً اُس کا دس فیصدی، لوگ زیادہ بھی دیتے ہیں۔ ٹیکسی والے کو کرایہ کے ساتھ بخشش، حمّال کو مزدوری کے ساتھ یہ بھی گویا خرچ کا جزو ہے ۔ غیر ملکی لوگوں کو یہ بات کسی قدر اُلجھن میں بھی ڈالتی ہے اور بھول چوک بھی ہو سکتی ہے ۔ باہر نکل کر خیال ہوا کہ کوئی اخبار لیں۔ نیویارک ٹائمز کا بہت نام سُنا تھا ۔ آج اتوار کی وجہ سے سنڈے اڈیشن تھا جس کے دو ڈھائی سو صفحات تھے اور بیس سنٹ قیمت (ایک روپیہ کے قریب) اس اخبار کو کون پڑھ سکتا ہے! یہ چھپا کس طرح ہو گا! کچھ حصّہ تو پہلے ہی چھپ چکا ہو گا لیکن بیشتر صفحات پر ۱۳ ؍ کی خبریں ہیں ۔ میرے ساتھی شرد کمار کی طبیعت ابھی بحال نہیں،

ان کی تجویز تھی کہ کچھ دیر آرام کیا جائے۔ کمرے میں واپس آکر لیٹے، سوتے جاگتے، پڑھتے لکھتے پانچ بج گئے۔ میں نے دیر میں ناشتہ کرنے کی وجہ سے لنچ نہیں کھایا۔ پانچ بجے کے قریب کافی پی۔

ساڑھے پانچ بجے نیویارک دیکھنے نکلے۔ اتوار کی وجہ سے بے رونقی ہے لیکن اس بے رونقی میں بھی رونق ہے۔ صبح دیکھا تھا تو کچھ اور تھا اب تو روشنی کی فراوانی سے اُس کی صورت ہی پہچانی نہیں جاتی۔ یہ حصّہ بے حد بارونق ہے۔ ہم ساتویں آوینیو پر ہیں اور راک فیلر فاؤنڈیشن پانچویں اوینیو پر۔ کل وہاں جانا ہی ہے، ہم نے کہا اسی وقت چلیں دیکھ لیں، سیر بھی ہو جائے گی اور کام بھی۔ مجھے اپنے کمرے ہی میں لکھنے کی میز پر نیویارک کا ایک بہت ہی اچھا نقشہ مل گیا تھا اور میں نے لیٹے لیٹے اُس پر خوب غور کیا تھا۔ بعض باتیں سمجھ میں بھی آرہی تھیں مگر ابھی سمتوں کا اندازہ نہ تھا۔ خیر میں نے نقشہ جیب میں رکھا اور اندازے سے چلا۔ راک فیلر پہونچ گیا، یہ بہتر منزلی عمارت بھلا کہاں چھپ سکتی ہے۔ اس کی اپنی ایک الگ دنیا ہے، ہزارہا مرد، عورت، بچّے اسے دیکھنے اور تفریح کرنے آتے ہیں، خاص انداز کے مجسمے اور فوارے ہیں، ریسٹران ہے، لوگ کبوتروں کو دانہ کھلا رہے ہیں، کچھ بنچوں پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ہم بھی تھوڑی دیر مسحور رہے۔ اب میں نے ذرا نقشہ نکال کر سمتوں کا اندازہ لگایا تو کچھ باتیں اور سمجھ میں آگئیں۔ یہ اوینیو بالعموم شمال و جنوب میں پھیلے ہوئے ہیں اور سڑکیں مشرق و مغرب میں۔ چوتھے اوینیو سے مشرق و مغرب الگ ہو جاتے ہیں، ایک طرف کی سڑکیں مغربی اور ایک طرف کی مشرقی کہلاتی ہیں۔ اجنبی تھوڑی سی ذہانت سے کام لے تو ہر قدم پر

لوگوں سے پوچھے بغیر ان باتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ نقشہ ہی میں دیکھ کر ہم جنوب کی طرف سنٹرل پارک دیکھنے کے لئے بڑھے۔ شہر کی ان اونچی عمارتوں اور ہنگاموں میں یہ ایک سکون کی جگہ ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے تالاب اور ایک جھیل ہے، سڑکیں اونچی نیچی، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں تراش کر بنائی گئی ہیں، اندر ایک چھوٹا سا کلب بھی ہے۔ بنچوں پر لوگ بیٹھے پڑھ رہے ہیں یا اپنی محبوباؤں کو پیار کر رہے ہیں۔ میں سُرد کمار کو ساتھ لئے ہوئے اس طرح بے تکلفی سے پھر رہا ہوں گویا سب کچھ پہلے سے جانتا ہوں، وہ گھبرا رہے ہیں لیکن میں نے اُنھیں ایک لمبے چکر میں پانچویں، چھٹے اور ساتویں اوینو کے علاوہ براڈوے کی بھی سیر کرا دی۔

حیرت اور لاعلمی کی وجہ سے یہاں بالکل خارجی اندازِ نظر اختیار کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے چند دنوں کے بعد میری رائے بدلے، اس وقت تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں عام ہندوستانی کا دم گھٹ جائے اگر دو ایک ملنے والے نہ ہوں، یہ جگہ دیکھنے اور سیر کرنے کی ہے، قیام کی نہیں ہے۔ یہاں زندگی کی رفتار بہت تیز ہے اور بڑے پیمانے پر کوئی شکل اختیار کر رہی ہے جسے میں سمجھ نہیں رہا ہوں۔ یہاں چیزوں کی فراوانی اور دولت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ناممکن ہے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاءالدین کے چراغ سے پیدا ہونے والے دیوزادوں نے رات کی تاریکی میں یہ عمارتیں، بھاری بھرکم اور پُراسرار عمارتیں کھڑی کر دی ہوں گی!

۱۸ استمبر دوشنبہ ۔ رات نیند بہت کم آئی، یہاں ہوٹلوں کے کمرے عجیب اندھے اندھے سے ہوتے ہیں، کہنے کو AIR CONDITIONED ہیں مگر گرمی معلوم ہوتی ہے، باہر ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے کمروں کے اندر گرم۔ یوں آرام دہ ہونے کے

نقطۂ نظر سے کمرے میں آرام کا ہر سامان موجود ہے۔ سرہانے ٹیلیفون تک رکھا ہوا ہے، ٹیلیفون کی میز کے نچلے حصّے میں ڈائرکٹری اور انجیل مقدس رکھی ہوئی رہیں۔ مسہری میں بلب لگا ہوا ہے، غسل خانہ بہت اچھا ہے، گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل ہیں، وارڈروب ہے، ڈریسنگ ٹیبل ہے، لکھنے کی میز ہے، ہر چیز آراستہ اور حسین ہے لیکن اس کمرے میں نیند نہیں ہے۔ ذرا ذرا دیر کے بعد آنکھ کھل جاتی تھی آخر چھ بجے میں اُٹھ ہی بیٹھا، لکھنؤ ایک خط لکھا اور باہر نکلنے کے لئے تیار رہا۔ آج راک فیلر فاؤنڈیشن کے دفتر جاکر مستقبل کا پروگرام طے کرنا تھا۔ میں اور ڈاکٹر کمار ناشتہ کرکے ٹھیک سوا نو بجے وہاں پہونچ گئے، مجھے مسٹر گل پیٹرک سے ملنا تھا اور اُنھیں ڈاکٹر اُڈلیو رسے۔ ان کے کمرے پچپنویں منزل پر ہیں۔ راک فیلر سنٹر کے اندر خود ایک شہر آباد ہے، دوکانیں، ہوٹل، سینما، ادارے، ہر چیز۔ ایکسپرس لفٹ میں کھڑے ہوکر ہم اس منزل پر بات کی بات میں پہونچ گئے۔ یہ لفٹ صرف پچاس منزل کے بعد کے لئے ہے۔ سامنے ہی ایک صاف ستھرے کمرے میں نُو واردوں کا استقبال کرنے والی خوش شکل سکریٹری بیٹھی ہوئی تھی، مسکراکر بہت اخلاق سے پیش آئی، جو اُس کی عادت ہوگی۔ اُس نے نام نوٹ کئے، ٹیلیفون کیا اور تین چار منٹ کے بعد مسٹر گل پیٹرک کی سکریٹری آکر اُن کے کمرے میں لے گئی۔ گل پیٹرک مجھے امریکہ میں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے، کوئی دو گھنٹے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور یہ طے ہوا کہ میں شروع ہی میں کم سے کم ایک مہینہ نیویارک میں رہوں میں نے بے تکلف کہا کہ مجھے اس بڑے اور قیمتی ہوٹل سے نکالئے۔

خود انھیں اس بات کا احساس تھا کہ کام کرنے والے کے لئے یہ ہوٹل مناسب نہیں۔ کیا کام کرنا ہوگا، کس طرح کرنا ہوگا اِس کے متعلق کچھ غیر واضح باتیں ہوئیں وہ جس طرح لکھنؤ میں ملے تھے اور جس طرح یہاں ملے، اُس نے مجھے بے حد متاثر کیا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص کچھ سمجھنا اور کچھ کرنا چاہتا ہے، اس کے پاس کچھ خیالات ہیں۔ دلّی میں مجھ سے خواجہ غلام السیّدین نے بھی کہا تھا کہ اب تک جتنے امریکیوں سے ملاقات ہوئی ہے اُس میں گل پیٹرک سب سے زیادہ ہوشمند نظر آتا ہے۔ کئی اور دوست بھی اسی خیال کا اظہار کر چکے ہیں۔ پرسوں ملنے کے وعدے پر اُن سے رخصت ہوا اور مسٹر فلائڈ لائٹل کے پاس آیا، جو سفر خرچ وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔ وہ بہت مصروف تھے، مجھے بھی کوئی جلدی نہیں تھی اس لئے میں اُنھیں کل کا وقت دے کر چلا آیا۔ چلے آنے کی دو وجہیں تھیں، ڈاکٹر شرد کمار کو آج ہی تین بجے یوٹا یونیورسٹی چلا جانا تھا، یہ یونیورسٹی مشرقی حصے میں یہاں سے تقریباً ڈھائی ہزار میل کے فاصلہ پر ہے، اُنھیں رخصت کرنا تھا اور دو بجے ڈاکٹر مزمدار نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہوٹل پہونچ کر لنچ کھایا، ڈاکٹر مزمدار آ گئے، تھوڑی دیر رہے، پھر ڈاکٹر شرد کمار چل کھڑے ہوئے۔ اب میں بالکل تنہا ہوں، ضرور تھوڑی بہت گھبراہٹ ہوگی۔ چنانچہ میں بھی کچھ ضروری چیزیں خریدنے اور گھومنے کے بہانے نکل کھڑا ہوا اور ساڑھے پانچ بجے واپس آیا، بوندیں پڑ رہی ہیں، ہوا تیز ہے، اب کون نکلے، تھکن بھی معلوم ہو رہی ہے۔ اور ابھی نہ تو نیویارک دیکھا ہے اور نہ سمجھ میں آتا ہے کہ کیسے دیکھوں!

۱۶ ستمبر منگل ۔ ایسا ماحول ہے کہ رات بھر نیند بہت کم آئی، گرمی، اُلجھن، اور تنہائی کا احساس۔ نو بجے کے قریب نکلا انھیں جانی پہچانی سڑکوں پر چلتا رہا، ساڑھے دس بجے کے قریب راک فیلر فاؤنڈیشن کے آفس پہونچا اور مسٹر لائل سے ملنے چلا آفس سکریٹری نے دیکھتے ہی کہا ہلو مسٹر حُسین! مجھے حیرت ہوگئی، یہ لوگ کام کرنے کا طریقہ جانتے ہیں۔ مسٹر لائل کے یہاں پہونچ کر سفر اور سفر خرچ وغیرہ کے متعلق باتیں ہوئیں۔ انگریزوں اور امریکیوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی (SURNAME) کے بغیر کیسے ہوسکتا ہے، میں نے انھیں مثالیں دے کر سمجھایا۔ بہر حال اِس سلسلہ میں کئی حضرات سے ملنا ہوا، سب خاص جوش اور انہماک سے ملتے ہیں۔ یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کس حد تک ہکانکی ہے۔ کچھ دنوں میں زیادہ سمجھ میں آنے لگے گا۔ ہر کام جلد اور صفائی سے ہوجاتا ہے، کہیں بیکار بیٹھنا نہیں پڑتا، اگر بیٹھنا بھی پڑے تو بہت سے رسائل اُسی جگہ ہوتے ہیں، انسان وقت گذاری کرسکتا ہے۔ دفتر اطلاعات، گل پیٹرک، آلیور، لائل سب کے دفتر میں عورتیں ہی سکریٹری کا کام کرتی ہیں، ان میں بلا کی تیزی، چابکدستی اور خوش مزاجی ہے۔

وہاں سے نکل کر کچھ چیزیں خریدتا، گھومتا پھرتا دو بجے ہوٹل پہونچا۔ کھانے کے کمرے میں ایک صاحب ہندوستانی شکل صورت کے پہلے سے بیٹھے تھے، کھانا ختم کرکے میرے پاس آئے۔ پاکستان سے طب کی تعلیم حاصل کرنے راک فیلر ہی کے وظیفہ پر آئے ہیں، لاہور کے رہنے والے ہیں۔ آج صبح پہونچے ہیں اور نیویارک سے اِس قدر گھبرا رہے ہیں کہ آج ہی بوسٹن بھاگ جانا چاہتے ہیں

جہاں اُنھیں لکچروں میں شرکت کرنا ہے۔ ہوٹل میں جو کتابوں کی دوکان ہے اُن سے ڈاک خانے کا پتہ پوچھ کر میں ڈاک خانے چل دیا، وہاں سے نکلا تو ایک نئے راستے پر ہولیا اور بھٹک گیا، ایک گھنٹہ چکّر کھا کر واپس آیا۔ تھوڑی سی خریداری کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہاں ہر چیز مہنگی بھی مل سکتی ہے اور سستی بھی۔ دوکانوں پر بہت سی جگہ SALE لگے ہوئے ہیں۔ چمڑے کی چیزیں گراں ہیں۔ دوکاندار بالعموم خوش اخلاق ہیں، ہر چیز بہت اچھے پیکیٹ بنا کر دیتے ہیں اور شکریہ ادا کرتے ہیں۔ بعض کتابوں کی دوکانوں پر بھی گیا۔ قیمتی سے قیمتی کتابیں جن کی مانگ زیادہ نہیں ہے چھپنے کے سال بھر کے اندر تہائی چوتھائی قیمت پر بکنے لگتی ہیں۔ بہت سی کتابیں خریدنے کو جی چاہتا ہے مگر میں اُنھیں لئے لئے کہاں پھروں گا!

ہر سڑک پر لاکھوں مرد اور عورت خریداری کرتے نظر آتے ہیں، ریستراں اور بار بھرے ہوئے ہیں اشتہار دینے اور لوگوں کو متوجہ کرنے کے عجیب عجیب طریقے ہیں۔ اکثر ہوٹلوں نے ٹیلی ویژن لگا رکھے ہیں خود میرے ہوٹل میں ہے۔ راک فیلر کی عمارت میں اس کی سب سے بڑی دوکان اور نمائش خانہ ہے۔ ٹیلی ویژن کے کام کرنے کے طریقے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ نمونہ کے طور پر وہاں چار ٹیلی ویژنوں کے سیٹ پر ایک منظر دکھا رہے تھے۔ افسوس ہے کہ میں اس کی بناوٹ نہیں سمجھتا۔

میں نے اِس تین دن میں کئی اخبارات لئے تاکہ یہاں کے حالات کا کچھ اندازہ لگا سکوں سب نہیں مگر زیادہ تر اخبارات ڈاکہ، چوری، قتل، زناکاری، ہنی مون، شادی وغیرہ کی خبروں کو "سنسنی خیز" انداز میں پہلے صفحہ پر جگہ

دیتے ہیں۔ اخبارات بھاری بھر کم ہوتے ہیں، لاکھوں کی تعداد میں اور کئی بار چھپتے ہیں، تصویروں، اشتہاروں اور تفریحی باتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ اس وقت جہاں تک سیاسی خبروں کا تعلق ہے یہاں سب سے زیادہ صدر کے انتخاب کا ذکر ہوتا ہے، میں نے جو بعض بڑے بڑے اخبار مثلاً نیویارک ٹائمز ہیرلڈ ٹریبیون وغیرہ دیکھے وہ سب کے سب جنرل آئزن ہاور کی تائید کر رہے ہیں، نیویارک میں پتہ نہیں چلتا کہ الکشن ہے بھی یا نہیں، یہاں یونہی زندگی رواں دواں اور پُرشور ہے، یا ممکن ہے جلسے وغیرہ ہوتے ہوں مجھے پتہ نہیں چلتا۔

۱۷ ستمبر بدھ ـــ دس بجے ہوٹل سے نکلا اور ٹہلتا ہوا راک فیلر پلازا پہونچ گیا، کچھ تفریح میں وقت گذرا اور جب گیارہ بجنے کے قریب ہوئے تو گل پیٹرک سے ملنے گیا۔ دیر تک ہندوستانی ادب اور ہندوستانی ادیبوں کی تنظیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، آج کچھ مسائل واضح ہوئے ہیں کہ مجھے کس نقطۂ نظر سے مسائل کو دیکھنا ہے۔ ظاہر ہے یہ محض علمی خدمت کا مسئلہ نہیں ہے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء تک فاؤنڈیشن والے انگلستان کے ہونہار ادیبوں اور شاعروں کو برمنگھم یونیورسٹی کے ذریعہ چھپن ۵۶ ہزار ڈالر دے چکے ہیں۔ ان میں کوئی مشہور ادیب نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ وہی لکھنے والے ہیں جو ذہین اور طبّاع ضرور ہیں لیکن اپنی ہی انفرادی دنیا کے ترجمان ہیں۔ غالباً ہندوستانی ادیبوں کی مدد بھی یہ لوگ کریں گے، ابھی یہ بات واضح نہیں ہے۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ امریکی ادیب اور دانشور جو ہندوستان کی زندگی اور ادب میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں

اس کی حقیقت کیا ہے ۔ مصر، ترکی، ایران اور ڈنمارک سے بھی ایسے ہی کام کرنے والے آئے ہوئے ہیں، مجھ سے کہیں نہ کہیں ان لوگوں سے ملاقات ہوگی ۔ میں ذرا اندازہ لگا رہا ہوں کہ ہندوستانی ادب اور ادیبوں کے بارے میں یہ واقعی کیا جاننے کے خواہاں ہیں ۔ انگریزی میں لکھی ہوئی کتابیں چھاپنا اور بعض کتابوں کا ترجمہ بھی کرانا چاہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بھی کتابیں شائع کرائیں شائد اس کا دار مدار تھوڑا بہت میری رپورٹ پر ہوگا ۔ دیکھوں میں کیا نتیجے نکالتا ہوں!

یہ بات طے ہوگئی کہ مجھے بہت سے ادیبوں سے ملنا ہے، لائبریریوں میں جانا ہے، سارے امریکہ میں گھومنا ہے لیکن مجھے تو اُلجھن ہو رہی ہے ۔ سب سے بڑی اُلجھن یہ ہے کہ کہاں رہوں ۔ یہ ہوٹل تو بہت مہنگا ہے ۔ آج شام کو کولمبیا یونیورسٹی سے متعلق انٹرنیشنل ہاؤس گیا تھا لیکن وہاں رہنے میں دشواریاں معلوم ہوتی ہیں، کل وائی ایم سی اے میں کوشش کروں گا ۔ یہاں کس سے مشورہ لوں یہ اچھی خاصی پریشانی ہے! دُور سے کولمبیا یونیورسٹی کی مختلف عمارتوں کی جھلک دیکھی، کسی دن اطمینان سے دیکھوں گا ۔ نیویارک سے نکلنا ہو تو ہارورڈ، پرنسٹن اور شکاگو جاؤں گا ۔ یہ عجیب مزا ہے کہ گھبرا بھی رہا ہوں اور گھومنا بھی چاہتا ہوں غالباً لوگوں سے ملنے لگوں گا تو یہ تنہائی کا احساس دُور ہوگا ۔

آج میں یہاں بس میں سوار ہوا ۔ صرف ڈرائیور رہتا ہے اور سارا کام تیزی سے اور مشین کی صحت کے ساتھ ہوتا ہے ۔ بس رُکی، ڈرائیور نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے دروازہ کھول دیا آپ نے داخل ہوتے ہی دس سنٹ کا سکّہ (جیسے

ڈائم کہتے ہیں) ڈال دیا، نہ ٹکٹ نہ کوئی کنڈکٹر۔ اگر آپ کو اس بس کو کچھ
دُور پر چھوڑ کر دوسری بس لینا ہے تو ڈرائیور سے کہہ دیجئے وہ آپ کو ایک
پاس دے دیگا اور دوسری بس میں آپ بغیر ڈائم دیئے ہوئے سوار ہو سکیں گے۔
میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ قاعدہ کتنی دُور تک کے لئے ہے۔ شہر
کے نیچے نیچے بھی SUBWAYS کا جال بچھا ہوا ہے لیکن مجھے ابھی اُن میں
سوار ہونے کا موقع نہیں ملا ہے۔

آج کئی دنوں کے انتظار کے بعد بیوی کا خط ملا، سب ٹھیک ہیں لیکن
اس سے پہلے بل بھی کیسے سکتا تھا۔ غالباً میرے یہاں پہونچنے کا کیبل بھی لکھنؤ
پہونچ گیا ہوگا۔ مجھے بہت سے لوگوں کو خطوط لکھنے ہیں لیکن ذرا سکون ہولے تو لکھوں۔

آج زیادہ گھوما پھرا نہیں بلکہ سوچتا رہا ہوں کہ کیا کرنا چاہئے۔ کل دس بجے
ہندوستانی قونصل خانہ جانے کا ارادہ ہے وہاں کونسل کے علاوہ مسٹر بال چندر
راجن سے ملنا ہے۔ یہ انگریزی کے بہت اچھے ہندوستانی ادیب ہیں اور یو۔ان۔او
ڈیلیگیشن کے ساتھ ہیں۔ گل پیٹرک نے اُن سے میرا ذکر کیا تھا، یہی ملنے کی
صورت ہے۔

میں نہ سیاح ہوں نہ سیاست داں، نہ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں،
نہ محض گھوم پھر کر واپس جانے۔ اِس لئے بات بن نہیں رہی ہے نیویارک اور
یہاں کی زندگی کو دیکھنے کو ذہن میں پہلی جگہ دوں یا اُن لوگوں کی تلاش شروع
کردوں جن سے ملنا ہے۔

۱۸ ستمبر جمعرات۔ رات دیر تک اخبار دیکھتا رہا۔ نیویارک شہر میں جنسی جرائم

بڑھ رہے ہیں اور یہاں کے اخباروں کو دلچسپ مواد مل رہا ہے۔ اغوا، قتل، بھری سڑکوں سے اٹھا لے جانا، کوئی بات ہی نہیں۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی تھوڑے ہی دنوں کے اندر ہوئی ہے۔ سُرنگوں کے اندر پولیس اور بدمعاشوں میں باقاعدہ گولیاں چلتی ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا زیادہ تر الزام نیگروؤں پر رکھا جاتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک یہ بات صحیح ہے، ممکن ہے انھیں دنیا کی نظروں میں ذلیل دکھانے کے لئے ایسا کیا جا رہا ہو۔ نیگرو بڑی تعداد میں ہر جگہ نظر آرہے ہیں۔ ہوٹلوں میں، دکانوں میں، سڑکوں پر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں، نیگرو لڑکیاں لفٹ پر کام کرتی ہیں۔ اکثر اچھے کپڑے پہنے موٹروں میں اور بڑی دوکانوں پر بھی نظر آتے ہیں لیکن عام طور سے وہ کسی ذمّہ دار جگہ پر دکھائی نہیں دیتے۔ جس ہوٹل میں ہوں اُس میں کم از کم پچاس نیگرو مرد اور عورت مختلف کاموں پر نوکر ہوں گے۔ میرے لئے گنجائش نہیں معلوم ہوتی کہ اس مسئلہ کا مطالعہ کر سکوں، شائد نیویارک سے باہر نکل کر کوئی ایسا ادیب مل جائے جس سے اس مسئلہ پر گفتگو ہو سکے۔

صبح اُٹھا تو کچھ دھوپ سی تھی مگر ذرا ہی دیر میں بادل چھا گئے۔ میں نو بجے کے بعد ہوٹل سے نکلا ہندوستانی کونسلیٹ کے محل وقوع کا کچھ اندازہ نقشہ سے ہو گیا تھا میں وہاں پونے نو بجے پہونچ گیا۔ میرا خیال تھا شائد عمارت پر ہندوستانی جھنڈا لہرا رہا ہو گا اس سے پہچاننے میں آسانی ہو گی لیکن کوئی جھنڈا نہیں تھا، ہاں دروازے پر نیو انڈیا ہاؤس لکھا ہوا تھا۔ اندر گیا بڑی شاندار عمارت ہے۔ بڑے بڑے کمرے، اونچی چھتیں، بڑے دروازے، خوبصورت دیواریں

معلوم ہوا کہ کسی قدیم دولت مند خاندان کی ملکیت ہے۔ کچھ دیر ڈاکٹر راجن کا انتظار کرنا پڑا وہ بہت دور پہ رہتے ہیں اس لئے ذرا دیر میں پہونچے۔ اُن کے ساتھ ان کے کمرے میں گیا اور کوئی گھنٹہ بھر باتیں ہوتی رہیں۔ خوبصورت، نوجوان اور پڑھے لکھے ہندوستانی ہیں۔ ڈیلیگیشن کے فرسٹ سکریٹری ہیں میں نے ان کے مرتب کردہ دو مجموعے FOCUS کے نام سے کبھی دیکھے تھے ایک ناول کے متعلق دوسرا ٹی ایس ایلیٹ کے۔ اُن کا ذکر کرکے کم سے کم یہ ظاہر کرنے میں آسانی ہوئی کہ میں اُن سے واقف ہوں۔ یہ بات ایک شخص میں خود پسندی کے جذبے کو ضرور جگا دیتی ہے۔ یوں بھی ان کی گفتگو میں "میں" کا استعمال ضرورت سے زیادہ تھا۔ باتیں اچھی کرتے ہیں اور انگریزی خوب بولتے ہیں۔ کم آمیز، خود پسند اور کسی قدر اُلجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نیویارک سے خوش نہیں۔ امریکیوں کو (خاص کر نیویارک والوں کو) مغرور اور تاجرانہ ذہنیت رکھنے والا سمجھتے ہیں۔ تھوڑی بہت ہندوستانی فلسفہ اور ادب پر بھی باتیں ہوئیں، کچھ اِس زندگی پر جو وہ اب گذار رہے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کے شوقین ہیں، حکومت ہند کے محکمہ خارجہ میں کیا خوش رہ سکتے ہیں! کہہ رہے تھے کہ کام بہت ہے بالکل موقع نہیں ملتا کہ کچھ لکھوں پڑھوں۔

دفتر کے بعض اور ہندوستانیوں سے ملاقات ہوئی اکثر نے دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ میں نے سوچا لگے ہاتھوں کونسل جنرل مسٹر آر تھر لال سے بھی مل لینا چاہئے بعض لوگوں سے معلوم ہوا تھا کہ پڑھنے لکھنے سے دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اُن کے پاس ہندوستان کے بعض "بڑے لوگ" آ گئے اور انھوں نے

خود آکر مجھ سے معذرت کی کہ بہت مصروف ہوں، کل گیارہ بجے فرصت ہو تو آئیے۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد مسٹر بھنڈاری وائس کونسل سے ملا، نوجوان آدمی ہیں اِدھر اُدھر کی دلچسپ باتیں کرتے رہے نیویارک اُنھیں بھی پسند نہیں آیا۔

میں نے وہیں سے کاظم ظہیر (علی ظہیر صاحب کے چھوٹے بیٹے) کو فون کیا۔ وہ انجینیری کے اعلیٰ امتحانات پاس کر کے یہیں ایک کمپنی میں ملازم ہیں۔ میں نے انھیں بچپن میں دیکھا تھا، چھ سال سے تو وہ ہندوستان سے باہر ہی ہیں۔ انھوں نے وعدہ لیا کہ شام کو کھانا انھیں کے ساتھ کھاؤں اور یہ بھی طے ہوا کہ وہ خود آکر مجھے لے جائیں گے۔ چھ بجے شام کو وہ ہوٹل آکر مجھے لے گئے۔ ریورسائڈ ڈرائیو پر ایک مکان کے حصہ میں وہ اور ایک سیلونی جوان مسٹر دھن پال ساتھ رہتے ہیں، اس وقت ایک اور ہندوستانی مسٹر برج بھوشن بھی موجود تھے جو سرکاری وظیفے پر یو این او اور امریکی کانگریس وغیرہ کے طریق کار کا مطالعہ کرنے آئے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے مل کر بہت اچھا کھانا پکایا تھا بعض ہندوستانی چیزیں کئی دن کے بعد کھائیں۔ تھوڑی دیر کے لئے طبیعت بہت خوش رہی۔ ساری دنیا کی باتیں ہوتی رہیں۔ دھن پال جنھوں نے عمرانیات میں کولمبیا یونیورسٹی سے ایم اے کیا ہے یو این او میں ملازم ہیں۔ پڑھے لکھے اور ہوشیار معلوم ہوتے ہیں۔ برج بھوشن بھی عام معلومات کے لحاظ سے بہت واقف کار نظر آتے ہیں۔ کل واشنگٹن چلے جائیں گے، ان سے وعدہ ہے وہاں جاؤں گا تو ملوں گا۔ کاظم ظہیر خلیق اور ملنسار ہیں عزیزوں کی طرح ملے

غالباً نومبر تک ہندوستان واپس جائیں گے۔

کاظم ظہیر ہی کے یہاں دو نوجوان اور آ گئے۔ ایک امریکی اور ایک سندھی دونوں نے انجینیری کے مختلف امتحانات پاس کیے ہیں۔ بے تکلفی ہونے کی وجہ سے ہندوستانی امریکی پر چوٹیں بھی کر رہے تھے اور وہ چونکہ ایسے مذاق کا عادی معلوم ہوتا تھا اس لئے کبھی جواب دیتا تھا اور کبھی ہنس کر رہ جاتا تھا۔ میں طبعاً ان لوگوں کے درمیان میں کم بولتا ہوں جن سے بے تکلفی نہ ہو اس لئے میں نے معمولی حد تک گفتگو میں شرکت کی لیکن ان لوگوں کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ نیویارک کی ساخت وغیرہ کے متعلق گفتگو تھی اِس سلسلہ میں یہ معلوم ہوا کہ یہ جزیرہ جسے (MANHATTAN) کہا جاتا ہے اور جس پر اصل نیویارک آباد ہے یہاں کے ابتدائی بسنے والوں سے صرف پچیس ڈالر میں خریدا گیا تھا۔ چونکہ وہ لوگ توہم پرست تھے اور اس لفظ کے معنی اُن لوگوں کی زبان میں اُس جگہ کے ہوتے ہیں جہاں مُردے جلائے جاتے ہوں، اِس لئے انھوں نے اِسے خوشی سے بیچ دیا (غالباً میں نے کسی کتاب میں بھی یہ بات پڑھی تھی) یہ بالکل پہاڑیوں سے بھرا ہوا ہے اور مضبوط قسم کی چٹان اندر دُور تک ہے۔ اسی وجہ سے یہاں سَو منزلی عمارتیں بنائی جا سکتی ہیں۔ ایک طرف چٹان نے بنیاد کا کام دیا، دوسری طرف ان سے جو پتھر حاصل ہوئے وہ عمارتیں بنانے کے کام آئے۔ اکثر عمارتیں نہایت مضبوط پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ بہت سی عمارتیں ایسی بنیاد پر بنائی گئی ہیں کہ ان پر زلزلہ کا اثر نہیں ہو سکتا۔ شہر کا اوپری حصہ تو خیر جیسا ہے وہ ہے نیچے کا حصہ بھی سڑکوں، سُرنگوں، پائپوں، بجلی کے تاروں وغیرہ سے بھرا ہوا ہے۔

بعض بعض جگہوں پر تو کئی راستے اور کئی پائپ ایک دوسرے کے نیچے اوپر ہوتے ہوئے گذر گئے ہیں - میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن کم و بیش یہی حالت لندن، پیرس اور ماسکو کی بھی ہوگی - یہاں ہر چیز کو تجارتی حیثیت سے مفید بنانے کی کوشش ہوتی ہے اس لئے زمین کے اندر اندر بھی جگہ خالی نہیں چھوڑی جا رہی ہے - یہی نہیں بلکہ اگر کوئی عمارت پندرہ منزلہ ہے اور بے حد مضبوط ہے اور اُس کا مالک یہ سمجھتا ہے کہ اسے بیس منزلہ بنانے میں گرانے اور نئی عمارت بنانے کا خرچ آسانی سے نکل آئے گا اور نفع بھی ہوگا تو وہ اس بنی بنائی مضبوط عمارت کو گرا دیتا ہے -

ساڑھے نو بجے رات کو کاظم ظہیر مجھے لاکر ہوٹل میں چھوڑ گئے -

۱۹ ستمبر جمعہ - رات ہی طے کر لیا تھا کہ وائی ایم سی اے کا پتہ لگاؤں کیونکہ ہوٹل بڑا مہنگا پڑ رہا ہے - اِس کا صرف روزانہ کمرے کا کرایہ ساڑھے پانچ ڈالر (یعنی تقریباً ستائیس روپیہ) ہے - جگہ کا اندازہ لگا لیا تھا اِس لئے کچھ بس سے چل کر اور کچھ دُور پیدل کر کوئی ساڑھے نو بجے چونتیسویں سڑک پر وائی ایم سی اے پہونچ گیا معلوم ہوا کہ آج ایک بجے کمرے تقسیم ہوں گے - کیو میں کھڑا ہونا پڑے گا - مجھے گیارہ بجے انڈین کونسلیٹ پہونچنا تھا، وہاں چلا گیا - آج بھی مسٹر آرتھر لال کونسل جنرل کو "بڑے لوگ" جیسے سر شانتی سروپ بھٹناگر، ہومی بھابھا، مسٹر بی کے نہرو گھیرے ہوئے تھے لیکن پندرہ منٹ کے بعد مسٹر لال ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کر کے خود آکر مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور بڑے اخلاق سے پیش آئے - میں جب تک رہا پڑھنے ہی لکھنے کی باتیں کرتے رہے - بھگوت گیتا کے

انگریزی ترجمہ کی جلدیں خرید رہے تھے کہ امریکہ کے دوستوں کو تحفہ دیں گے۔ یہیں معلوم ہوا کہ کرسٹوفر اشروڈ نے ایک سوامی جی کے ساتھ مل کر گیتا کا بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔ اس پر آلڈوس ہکسلے کا مقدمہ ہے۔ یہ بات خاص طور سے غور کرنے کی ہے کہ ہندوستانی فلسفہ کا اتنا گہرا اثر جو انگریز اور امریکی مصنفوں پر ہو رہا ہے، اُس کا اصل سبب کیا ہے؟ صرف بھگوت گیتا کی بات نہیں، یہ تو ایک بڑی اہم علمی اور فلسفیانہ کتاب ہے اور اس سے آج بھی دلچسپی کی جاسکتی ہے لیکن عام طور پر جو یوگ وغیرہ کی طرف لوگ متوجہ ہو رہے ہیں، کیا یہ سرمایہ دارانہ تہذیب کے زوال کی نشانی ہے؟ کیا اس دور کا انسان مادّی آسودگی سے گھبرا کر روحانی آسودگی کی تلاش میں ہے؟ مسٹر لال نے یہاں کے ادیبوں اور ناشروں سے بھی کچھ ربط قائم کر لیا ہے اور اِس سلسلہ میں مجھے مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ انگریزی میں شاعری کرتے اور کہانیاں لکھتے ہیں، مجھ سے کہا ہے کہ اپنی کسی کہانی اور نظم کا ترجمہ کر کے انھیں دوں۔ میرے پاس نہ یہاں کہانی ہے نہ نظم اور ہوتی بھی تو میں سوچتا کہ میری نظم اور کہانیوں سے کسے دلچسپی ہو گی! پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

وہاں سے نکلا تو بارہ بج چکے تھے۔ ساڑھے بارہ بجے والی ایم سی اے میں کمرے کے لئے کیو میں کھڑا ہونا تھا۔ بارش تیز ہونے لگی اور ایک جگہ ٹھہر جانا پڑا اچھی خاصی بارش ہوئی اور میں بھیگ گیا لیکن کام ضروری تھا اس لئے ٹیکسی کر کے ایک بجے پہونچ گیا۔ بڑی لمبی قطار لگی ہوئی تھی، زیادہ تر فوجی تھے، ہندوستانی کوئی نہیں تھا خیر دو بجے کے قریب معلوم ہوا کہ مجھے کمرہ مل سکتا ہے،

میں نے اُسی کو غنیمت سمجھا، کرایہ داخل کرکے کنجی لی اور چوتھی منزل پر آکر کمرہ دیکھا تو ہوٹل والے کمرے اور اُس میں زمین آسمان کا فرق معلوم ہوا۔ آخر ارزاں بہ علت کے بھی تو کچھ معنی ہیں۔ خیر چودہ دن یہ تجربہ بھی سہی! یہاں ایک آسانی ضرور ہے کہ لانڈری، ریسٹران، اخباروں کا اسٹال وغیرہ اسی کے اندر ہیں۔ یہ چودہ منزلہ عمارت باہر سے تو بہت اچھی نہیں معلوم ہوتی لیکن اندر بڑی جگہ ہے۔ یہاں ایسے کئی وائی ایم سی اے ہیں لیکن اسے سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے۔

کمرہ ریزرو کراکے اپنے ہوٹل گیا، وہاں حساب بیباق کیا اور اسباب لے کر وائی ایم سی اے میں آگیا۔ معلوم نہیں پندرہ دن یہاں کیسے گذریں گے۔ شاید جلد ہی کہیں چلا جاؤں۔ مجھے سال بھر یوں ہی اِدھر اُدھر رہنا ہے اور اُلجھن کا یہ حال ہے کہ خدا کی پناہ! میرا خیال ہے کہ اگر رہنے کا قرینہ سے انتظام ہو تو اتنی پریشانی نہ ہو، کیا ہندوستان کی حکومت اِس سلسلہ میں کچھ نہیں کرسکتی؟ یا پھر جو ہندوستانی یہاں مستقل یا نیم مستقل طور پر رہتے ہیں وہی کوئی ایسوسی ایشن بناکر کم سے کم نیویارک، شکاگو، واشنگٹن وغیرہ میں اس کا انتظام کردیں تو بہت اچھا ہو۔

رات کو ذرا دیر کے لئے ٹہلنے نکلا، کچھ عجیب بے کیفی ہے، اس سفر کا کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔ دو تجربے البتہ کسی قدر دلچسپ ہوئے۔ جب سڑک پر ٹہل رہا تھا تو ایک نیگرو نوجوان نے تیزی سے سامنے آکر کچھ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا، میں نے بھی ہاتھ بڑھا کے ہلا تو لیا لیکن فوراً ہی اندازہ ہوا کہ مدہوش ہے وہ ہاتھ پکڑے کچھ کہے جا رہا تھا میں نے ذرا سختی سے ڈانٹا اور آگے بڑھ گیا۔

راستہ بھی کچھ سنسان سا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت کم تھی۔ دوسرا لطیفہ یہ ہوا کہ میرے کمرے کی کنجی کمرے کے اندر بند ہوگئی۔ اُس کے لئے وائی ایم سی اے کے دفتر میں کئی جگہ لکھوانا پڑا، کئی حضرات سے ملنا پڑا تب دوسری کنجی سے کمرہ کھولا گیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ غلطی برابر لوگوں سے ہوتی ہوگی یا ہوسکتی ہے کیونکہ ہوٹلوں وغیرہ کے کمرے زیادہ تر باہر سے بغیر کنجی کے نہیں کھلتے اندر سے کھل جاتے ہیں اس لئے اگر کنجی کمرے کے اندر چھوڑ کر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی ضرورت سے باہر نکلئے اور کنجی ساتھ نہ لیجئے تو وہ لامحالہ اندر بند ہو جائے گی۔ کیونکہ دروازے آپ ہی آپ بند ہو جاتے ہیں۔ خیر اب اس بات کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑے گا۔

۳۰ ستمبر سنیچر۔ آج کوئی کام پیش نظر نہیں تھا، یہ خیال تھا کہ کمرے ہی میں بیٹھ کر ذرا پروگرام بناؤں گا، حالانکہ پروگرام کیا بناؤں ابھی کچھ ٹھیک ہی نہیں، نہ یہ خبر ہے کہ نیویارک میں کب تک رہوں گا، نہ یہ معلوم ہے کہ کہاں کہاں جاؤں گا! یہ ساری باتیں مسٹر کل پیٹرک سے طے کرنے کی ہیں۔ نو بجے کے قریب یہاں سے نکلا تو گھومتا پھرتا وہیں راک فیلر سنٹر کے پاس پہونچ گیا، نہ جانے کتنی دوکانوں کے سامنے رُکا، کتنی کتابوں کی دوکانوں میں گیا۔ اب تو سبھی سڑکیں یکساں سی معلوم ہو رہی ہیں۔ ویسے یہاں دیکھنے کی بہت سی چیزیں ہیں لیکن ابھی میں نے نہیں دیکھیں، آہستہ آہستہ کچھ چیزیں دیکھ لوں گا سب کا دیکھنا مجھے ضروری بھی نہیں معلوم ہوتا۔ بارہ بجے کے قریب نیویارک پبلک لائبریری کے پاس سے گذرا تو خیال ہوا کہ اسے دیکھ لینا چاہئے۔ بہت بڑی عمارت ہے

اور کئی منزلیں ہیں ۔ میں نے اندر پہونچ کر ذرا اُس کے قواعد وغیرہ دیکھے، عمارت کے نقشہ میں کمروں کا پتہ لگایا اور یہ خیال کر کے کہ یہاں بیٹھ کے کچھ پڑھنا تو ہے نہیں، صرف دیکھ لینے کے خیال سے اندر قدم رکھا۔ اورنٹیل لائبریری کی فہرست کتب دیکھی ۔ عربی کی بہت کتابیں ہیں فارسی کی کم ہیں اور اُردو کی اِس سے بھی کم ۔ ہاں مشرق کے متعلق مختلف زبانوں میں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے ہندی کی کتابیں میں تلاش کرتا رہا مجھے فہرست میں نہیں ملیں ۔ اُردو کی کچھ تو بہت معمولی کتابیں ہیں، آج کل کے چھپے ہوئے معمولی ناول اور افسانوں کے مجموعے ، معلوم نہیں یہ یہاں کیسے پہونچ گئے ہیں بعض کتابیں مولانا شبلی وغیرہ کی بھی ہیں ، وزٹ ولیم کالج کی چیزیں بھی موجود ہیں یوروپینوں کے مرتب کردہ لغات اور ہندوستانی بول چال سے متعلق کئی کتابیں ہیں ۔ سب ملاکر دو تین سو کے درمیان میں ہوں گی ۔ دواوین میں میرؔ اور غالبؔ اور جانؔ صاحب کے دیوان ہیں ، احمد ندیم قاسمی کا مجموعہ جلال وجمال ہے اور بعض معمولی مجموعے ہیں ۔ ایک کتاب خاص طور سے نکلوا کر دیکھی ، یہ امانت کی اندر سبھا کا جرمنی ترجمہ تھا جو لائپزش سے ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا تھا ، اُس کے ساتھ بمبئی کے مطبع صفدری کا چھپا ہوا ایک اُردو نسخہ بھی ہے ، ترجمہ اُسی پر مبنی ہے ۔ اچھا خاصا طویل مقدمہ ہے ۔ یہ ٹھیک طور پر پتہ نہ چل سکا کہ قلمی کتابیں بھی ہیں یا نہیں ۔ قلمی کتابوں کا کمرہ الگ ہے ۔ وہاں جانے کے لئے خاص پاس کی ضرورت ہے ، کسی اور دن دیکھوں گا ۔ پھر میں اُسی لائبریری کے اندر ہونے والی ایک نمائش دیکھنے چلا گیا ۔ یہ

انگلستان کی ملکہ این کے زمانہ سے متعلق ہے، اُس وقت کی کتابوں اور تصویروں کی نمائش ہے۔ اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر وغیرہ کے پہلے نمبر دیکھے اور بہت سی دلچسپ تصویریں۔ خود لائبریری کی دیواروں پر بہت اچھی اچھی تصویریں بنی ہوئی ہیں اور کہیں کہیں الگ سے بھی لگی ہوئی ہیں۔ لائبریری ہی میں ایک لکچر ہال ہے جس میں علمی تقریریں ہوتی ہیں۔ فہرست کتب کا عام کمرہ ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں دو درجن سے زیادہ ملازم لوگوں کی مدد کر رہے ہیں۔ اب کسی دن آؤں گا تو قلمی کتابوں کا پتہ لگاؤں گا اور پرانی کتابوں اور اخباروں کے مائکرو فلم دیکھوں گا۔ اس کے لائبریرین مسٹر ہارٹ وِل چند دن پہلے کہیں اور چلے گئے ورنہ مسٹر گِل پیٹرک نے کہا تھا کہ اُن سے ملا دوں گا۔ وہ دس سال ہندستان میں رہ چکے ہیں اور انھیں مجھ سے بڑی دلچسپی ہوگی۔ تین بجے کے قریب لائبریری سے واپس آگیا۔

لیٹا اخبار دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہاں کے اخباروں میں ہندستان کی مشکل ہی سے کوئی خبر ہوتی ہے۔ کبھی چوتھائی کالم، کبھی آدھا کالم۔ پرسوں نہرو جی کی کمیونسٹوں سے ناراضگی کی خبر تھی، کل امریکہ کے روپیہ سے جو پچپن[۵۵] مرکزوں میں کمیونٹی پروجکٹ کے مطابق کام ہو رہا ہے اُس کا ذکر تھا آج ہندوستانی امن کمیٹی کے جو نمائندے چین جا رہے ہیں جا رہے ہیں ان کے متعلق خبر تھی مگر اصل زور اس پر تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو پنڈت نہرو کے مخالف ہیں۔ زیادہ تر خبریں صدر کے انتخاب کے متعلق ہوتی ہیں، بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ کیا ہوگا، امریکہ کی بعض ریاستیں آئزن ہاور کی مدد کر رہی ہیں بعض

اسٹیونسن کی ۔ مگر مجھے کیا فکر ہے۔ مارا چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت۔ کوئی بھی ہو جائے۔ خیال ہوتا ہے کہ اسٹیونسن ہو جائے تو شائد "کمتر خطرہ" کی صورت ہوگی ۔

۲۱ ستمبر اتوار ۔ وائی ایم سی اے میں برابر کچھ نہ کچھ دلچسپیاں رہتی ہیں، خاص کر اتوار کو۔ خیال ہوا کہ جب دو ہفتے یہاں رہنا ہی ہے تو اس سے لطف لینا چاہیئے ورنہ طبیعت اور گھبرائے گی چنانچہ پروگرام دیکھ کر میں نے دو باتیں طے کرلیں ایک لکچر میں شریک ہونا اور "مجسمہ آزادی" (STATUE OF LIBERTY) دیکھنے جانا۔ آج تہران یونیورسٹی کے ڈکٹر رضا زادہ شفق کا لکچر تھا، موضوع تھا "بین مذہبی مفاہمت"۔ یہ گویا عیسائی عبادت کا ایک حصہ تھا ۳۵ سنٹ کا ٹکٹ بریک فاسٹ کے لئے تھا۔ میں نے ڈاکٹر شفق سے ملاقات کرنے کے خیال سے شرکت کی ۔ وہ اس وقت کولمبیا یونیورسٹی میں ایرانی زبان کے "مدعو پروفیسر" ہیں اور اچھے عالم سمجھے جاتے ہیں۔ ایران کی طرف سے ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کا منشور مرتب کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری برلن یونیورسٹی سے حاصل کی ہے۔ پچپن ۵۵ سال کے قریب عمر ہوگی۔ صاف ستھری انگریزی میں آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ جیسا موضوع تھا ویسی ہی تقریر تھی وہی عام باتیں جو کہی جاتی ہیں انھوں نے بھی کہیں اور مادیت پر یہ کہہ کر اعتراض کیا کہ یہ انسان کو فطرتاً خونخوار اور ایک دوسرے سے برسرپیکار بناتی ہے یہ عام غلطی یا تو لوگ، جان بوجھ کر کرتے ہیں یا پھر فکر سے کام نہیں لیتے۔ بہر حال تقریر پسند کی گئی۔ میں نے بعد میں ملاقات کی اور یہ طے ہوا کہ کسی دن

پھر اُن سے مل کر ایرانی ادب کے متعلق گفتگو کروں گا۔ اِس سلسلہ میں ایک اور ایرانی پروفیسر آقائے دانشور سے ملاقات ہوئی، وہ تبریز میں انگریزی پڑھاتے ہیں، ہندوستان ہو آئے ہیں اور پھر جانا چاہتے ہیں، انھیں یہ سُن کر نہ جانے کیوں حیرت ہوئی کہ ہندوستان میں اب بھی فارسی سے دلچسپی لی جارہی ہے۔ اس حلقہ کے بانی اور سکریٹری مسٹر ولسن سے یہیں ملاقات ہوئی، وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں، کچھ دن لاہور میں رہے ہیں، ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتے ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ میں بھی یہاں کوئی تقریر کروں لیکن میں اس جھگڑے میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ پونا کے ایک ڈاکٹر، بمبئی اور دہلی کے دو طالب علم اور سیلون کے دو پڑھے لکھے لوگوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔

سوا بجے ایک ٹولی وائی ایم سی اے ہی کے اہتمام میں "مجسمہ آزادی" دیکھنے والی تھی، میں نے اپنا نام ستر سنٹ دے کر درج کرالیا۔ وائی ایم سی اے سے کچھ دُور چل کر سرنگوں میں چلنے والی ٹرین کا اسٹیشن ہے، وہاں پہونچے۔ میرے لئے یہ پہلا اتفاق تھا۔ دس سنٹ کا سکہ ڈائم ایک مشین میں ڈال کر اندر داخل ہو جائیے۔ اچھا خاصا پلیٹ فارم ہے، روشنی اور چہل پہل ہے۔ پہونچے ہی تھے کہ تیزی سے ٹرین آگئی دروازے کھُلے، بند ہوئے اور بات کی بات میں ٹرین چل دی۔ بعض جگہ یہ سُرنگیں اتنی چوڑی ہیں کہ تین گاڑیاں ایک دوسرے کے پاس سے گذر جاتی ہیں، شور زیادہ ہوتا ہے، اندر کسی قدر گرمی بھی ہوتی ہے اور گاڑیاں ہلتی بہت ہیں۔ ساری گاڑی کے اندر اشتہار لگے ہوتے ہیں۔ دس منٹ میں ایک شخص اچھا خاصا سفر کر سکتا ہے۔ ایک جگہ باہر نکلے تو

وال اسٹریٹ پر تھے۔ یہ اس وقت دنیا کے اسٹاک ایکسچینج اور بینکنگ کا مرکز ہے، یہاں ہر لمحہ اربوں کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے، ذرا سی تبدیلی ہو جائے تو پل بھر کے اندر دنیا کے سارے بازار متاثر ہو جائیں۔ بینکوں کی اتنی بڑی اور مضبوط عمارتیں ہیں کہ خدا کی پناہ۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں ہے۔ آج اتوار کا دن تھا ورنہ معلوم ہوا کہ غضب کی بھیڑ ہوتی ہے۔ یہ عمارتیں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بے رحمی سے انسان کو دبائے دے رہی ہیں، یہیں سے براڈوے کی مشہور سڑک شروع ہوتی ہے۔ ایک آدھ اٹھارھویں صدی کے انگریزی اور ولندیزی مکانات نمونہ کے طور پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ ایک تاریخی گرجا گھر بھی ہے اور نیویارک کے خزانہ کا دفتر بھی۔ اس کے سامنے ہی امریکہ کے پہلے صدر واشنگٹن کا مجسمہ نصب ہے۔ یعلوم ہوا کہ جنگ کے دوران میں فوجوں کے بڑے بڑے مظاہرے یہیں ہوئے۔ یہاں جگہ بالکل نہیں ہے میرا خیال ہے کہ تبرکاً اس جگہ کئے گئے ہوں گے۔ وال اسٹریٹ کے ختم ہوتے ہی سامنے سمندر نظر آنے لگتا ہے کچھ پارک ہیں، کچھ خاص طرح کی عمارتیں۔ سمندر کا کنارہ چھوٹے چھوٹے جہازوں سے بھرا ہوا ہے اور اتوار کی وجہ سے آج یہاں تفریح کرنے والوں کی غیر معمولی بھیڑ ہے۔ میں کبھی کبھی دونوں سیلونیوں اور پونا کے ڈاکٹر صاحب سے باتیں کر لیتا ہوں۔ پچانوے فیصدی لوگوں کے ہاتھ میں کیمرہ یا دُوربین ہے۔ ہم لوگ ایک چھوٹے سے تفریحی جہاز پر سوار ہوئے اس میں بھی کم سے کم پانچ سو آدمی رہے ہوں گے اور تقریباً ایسے ہی بیس جہاز تفریح کرنے والوں کو جزیرہ بڈلو کی طرف لیے جا رہے تھے جس پر مجسمہ آزادی نصب ہے۔ یہ جزیرہ ساحل سے

ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ جزیرہ پر کوئی آبادی نہیں ہے، پہلے کوئی چھوٹا سا قلعہ تھا اور فوج رہا کرتی تھی اب نہیں ہے۔

ہم مجسمہ آزادی کے پاس پہونچ گئے۔ تصویروں میں دیکھ کر اس کی جسامت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ مجسمہ ایک سو باون ۱۵۲ فٹ اونچا ہے اور جس پلیٹ فارم پر ہے وہ بھی ایک سو پچاس ۱۵۰ فیٹ اونچا ہے، اس طرح جزیرہ کی سطح سے تقریباً تین سو ۳۰۰ فیٹ اونچائی ہو جاتی ہے۔ مجسمہ تانبے کی موٹی چادر کا بنا ہوا ہے اور لوہے کی بہت سی مضبوط سلاخوں پر کھڑا ہوا ہے۔ اس پر سبز رنگ کی پالش ہے آزادی ایک عورت کے روپ میں دکھائی گئی ہے جس کے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں ایک تختی ہے۔ جس پر ۴ جولائی ۱۷۷۶ء لکھا ہوا ہے۔ یہی امریکہ کی آزادی کی تاریخ ہے۔ یہ مجسمہ ۱۸۸۵ء میں فرانس نے امریکہ کو ایک دوستانہ تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ اس کے بننے، لائے جانے اور نصب کئے جانے کی داستان بھی دلچسپ ہے اور اکثر امریکی تاریخوں میں مل جاتی ہے۔ مشعل رات کو روشن کر دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی روشنی مکمل چاندنی رات سے ڈھائی ہزار گنا زیادہ ہوتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں بھی مجسمہ کے اندر گیا۔ کچھ دور لفٹ سے جا سکتے ہیں لیکن اوپر کی ۱۶۸ سیڑھیاں چڑھنی ہی پڑتی ہیں۔ سر کے اندر چالیس آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ جھروکے بنا دئے گئے ہیں اور وہاں سے نیویارک شہر پر نگاہ ڈالی جا سکتی ہے۔

آج میں بالکل تھک گیا لیکن دن اچھا خاصا کٹ گیا۔ دونوں سیلونیوں کے اصرار پر میں نے بھی ان کے ساتھ وہیں تصویر کھنچوائی جو پندرہ منٹ میں

مل گئی اچھی نہیں آئی ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے جب عزیزوں کو خط لکھ رہا تھا تو خیال آیا کہ آج وہاں محرم کی پہلی تاریخ ہوگی اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

۲۲ ستمبر دوشنبہ ۔ طے کیا تھا کہ آج کاظم ظہیر کو ٹیلیفون کر کے پوچھوں گا کہ اُن سے پھر کب ملاقات ہوگی اور دن کے کسی حصّہ میں اقوام متحدہ کی عمارت دیکھنے جاؤں گا، اگر ہو سکا تو وہاں کے کسی جلسہ میں شریک ہونے کے لئے پاس بھی لاؤں گا لیکن صبح کو ٹہلنے نکلا تو نہ جانے کہاں کہاں چلا گیا۔ ایک چھوٹے سے نیوز پیپر اسٹال پہ یہاں کا مشہور ترقی پسند رسالہ "ماسز اینڈ مین اسٹریم" نظر پڑا۔ خرید لیا اور سڑک کے کنارے ہی کھڑا اُس کے اوراق اُلٹتا پلٹتا رہا۔ پھر اُس کے پتہ کے حساب سے چلا۔ چلتا گیا چلتا گیا، یہاں تک کہ براڈوے پر اُس جگہ پہونچ گیا جو پتہ میں درج تھی۔ ہر طرف نگاہ دوڑائی کہیں سائن بورڈ وغیرہ کچھ نہیں۔ اشتہاروں کے اس شہر میں یہ کیا! کسی سے پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا مایوس ہو کر پلٹ آیا اور بے ارادہ چکر کھاتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر وہیں پہونچا اور ایک زینہ دکھائی دے رہا تھا وہاں داخل ہوا، اُس جگہ پتہ ملا کہ دفتر نویں منزل پر ہے۔ نویں منزل پر پہونچا، نہ جانے کیوں خیال تھا کہ یہاں ہاورڈ فاسٹ، پال رابسن، ہوورڈ سِل سیم سے ملاقات ہو جائے گی۔ ایک نیگرو لڑکی بیٹھی ہوئی دفتر کا کام کر رہی تھی اُس نے کہا ہم یہاں کتابیں نہیں رکھتے یہ تو محض دفتر ہے، میں نے پوچھا رسالہ کے اڈیٹر صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے اُس نے دوسری طرف اشارہ کر دیا، وہاں ایک صاحب نظر آئے

انھوں نے کھڑے کھڑے دیر تک باتیں کیں۔ امریکہ کے الکشن کا ذکر، پارٹی کا ذکر، ترقی پسندوں کی دشواریاں، کئی موضوعات پر باتیں ہوئیں، یہ رسالہ کے ایک سب اڈیٹر تھے، میرے پوچھنے پر انھوں نے کہا ہاورڈ فاسٹ وغیرہ کبھی بھولے بھٹکے یہاں آجاتے ہیں۔ ترقی پسند کتابوں کے لئے کہا کہ بڑی دوکان والے ہماری کتاب نہیں رکھتے، پھر کچھ دوکانوں کے پتے دئے۔ کمیونسٹ پارٹی کا اخبار ڈیلی ورکر نکلتا ہے مگر مجھے شہر میں کہیں نظر نہ آیا۔ شوقِ پیہم کی خلش اب بھی نہیں مٹی تھی اور میں اُس دوکان پر پہونچا جس کا پتہ دیا گیا تھا۔ اچھی خاصی بڑی دوکان تھی، ترقی پسند کتابیں بڑی تعداد میں تھیں، کمیونسٹ پارٹی کا سارا لٹریچر تھا، اخبارات اور رسائل تھے لیکن سناٹا تھا۔ اس سے امریکہ میں ہواؤں کے رُخ کا پتہ لگایا جا سکتا ہے، اتنی بڑی دوکان میں مَیں تنہا ایک شخص تھا جو کتابیں دیکھ رہا تھا۔

۲۳ ستمبر منگل:۔ صبح بارش ہو رہی تھی اور کسی کسی وقت تیز ہو جاتی تھی۔ مجھے گیارہ بجے راک فیلر سنٹر پہونچ کر مسٹر گل پیٹرک سے ملنا تھا، دس بجے کے بعد بارش کچھ کم ہوئی تو میں نکل کھڑا ہوا۔ خیال ہوا کہ شائد گھر سے کوئی خط آیا ہو، کوئی نہیں تھا۔ مسٹر گل پیٹرک سے اپنے کام، اُس سے متعلق مسائل اور آئندہ پروگرام کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ ہندوستانی فلسفہ، امریکی ادب، نہ جانے کتنی باتوں کا ذکر آیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ تاریخی تجزیہ، سماجی تحلیل، سیاسی پس منظر ہر چیز کو نظر انداز کر کے خالص ادبی نقطۂ نظر سے چیزوں کو دیکھنا چاہتے ہیں یا ان باتوں کا تذکرہ کم چاہتے ہیں، اس سے ان کی مصلحت پوری

ہوتی ہو تو ہو انھیں کبھی صحیح حالات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک طرح کی خود فریبی ہے کہ ہندوستانی ذہن کو نظر انداز کر کے اُس کے موجودہ مسائل کو سمجھا جا سکتا ہے، لطف یہ ہے کہ اس بات کو بہت صاف صاف کہتے بھی نہیں۔ خیر میں ایک آدھ چیزیں لکھوں گا اور اُس میں ان باتوں کو اس طرح لاؤں گا کہ انھیں اُس کی اہمیت کا اندازہ ہو۔ اور نہ ہو تو مجھے کیا!

آج کچھ نام معلوم ہوئے جن سے مجھے نیویارک میں ملنا ہے۔ آٹھ دس دن کے بعد پرنسٹن، فلاڈلفیا اور واشنگٹن کی یونیورسٹیوں میں جانا ہے۔ میرا مرکز نیویارک ہی رہے گا، یہیں سے ہر طرف جاؤں گا۔ مجھے تین چار باتوں کی اُلجھن ہے۔ مسلسل سفر، طرح طرح کے لوگوں سے ملنا، کچھ سمجھانا سمجھنا، لکھنے پڑھنے کا موقع نہ ملنا، تنہائی اور وطن سے خطوں کے ملنے میں دشواری۔ سبھی باتیں پریشان کُن ہیں۔ مسٹر گل پیٹرک سے کل شام کو پھر ملنا ہے۔ اُس وقت وہ مجھے دو تین آدمیوں سے ملائیں گے۔ بعض مضامین پڑھنے کو دیے ہیں اور ان پر رائے مانگی ہے۔ یہ مضامین عام طور سے اُن لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جن کو راک فیلر سے وظیفہ ملا تھا کہ وہ ہندوستان اور جنوبی مشرقی ایشیا کی ادبی صورت حال کا مطالعہ کر کے رپورٹ دیں۔ مضامین عام طور سے سطحی اور سرسری ہیں اور چند کتابوں، چند ملاقاتوں کا نتیجہ ہیں۔ ان میں خاص طور سے ملک کے عام حالات اور ترقی پسند تصورات کو نظر انداز کیا گیا ہے میں اپنی رائے میں اس بات کا ضرور اظہار کروں گا۔

جب میں لکھنؤ میں تھا تو ڈاکٹر وحید مرزا صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی نے

اپنے ایک عزیز کا پتہ دیا تھا، محمد کاظم صاحب نام، ۳۳ سال سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ میں نے چند دن ہوئے انھیں ایک خط لکھا کہ ملنا چاہتا ہوں لیکن آپ کا دولتکدہ ڈھونڈھنا مشکل ہے، خط میں ڈاکٹر وحید مرزا کا حوالہ دیا۔ رات کو دس بجے کے قریب اُن کا ٹیلیفون آیا کہ میرا مکان آپ کو مشکل سے ملے گا، جہاں آپ ہیں وہاں سے تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلہ پر ہے میں کل تین بجے ملوں گا۔ چنانچہ آج موصوف تشریف لائے۔ معقول شکل وصورت، عمر تقریباً ۵۵ سال، دہلی کے مشہور ومعروف لوہارو خاندان کی ایک فرد، علی گڈھ میں تعلیم حاصل کی۔ اکاؤنٹنگ کی تعلیم حاصل کرنے آئے اور ۳۳ سال کا عرصہ گذرا یہیں کے ہو گئے۔ جب سے دُو بار ہندوستان گئے ہیں، آخری دفعہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک رہے۔ نیویارک سے اِتنا واقف ہیں جتنا میں لکھنؤ کی گلیوں سے واقف نہیں۔ یہاں دکالت کے ساتھ ساتھ اور بہت سے امتحانات پاس کئے، ہوٹلوں میں برتن دھوئے، سڑکوں پر جھاڑو دی، لفٹ چلانے کی نوکری کی، دوکانوں پر حساب کتاب رکھا، غرض کہ ۱۹۲۰ء تک یہی کرتے رہے۔ یہیں ایک یہودی خاتون سے شادی کر لی، مختلف قسم کی درآمد برآمد کی تجارت کرتے ہیں، تمام دنیا کا چکّر لگا آئے ہیں، مکان خرید لیا ہے، موٹر ہے اور سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر ان کی زندگی کے حالات تفصیل سے لکھے جائیں تو بڑی دلچسپ داستان بن سکتی ہے۔ مذہبی جذبہ شدید ہے، کہنے لگے کہ سید صاحب! اسلام کی قدر یہاں آکر ہوئی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ غلام ہندوستان میں نہیں رہوں گا۔ یہاں بھیک مانگوں گا اور میں نے یہی کیا۔ باتیں بہت کرتے ہیں مگر دلچسپ۔ اُن کا ساتھ چھ گھنٹہ رہا

اور اِس عرصہ میں ہم نہ جانے کتنی جگہ گئے اور کتنی باتیں ہوتی رہیں۔ ہر مسئلہ پر شدت کے ساتھ جذباتی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ مجھ سے ایسی ہمدردی کی کہ مجھے تقویت ہوگئی، بس افسوس یہ ہے کہ بہت دُور رہتے ہیں۔

باتوں باتوں میں امریکیوں کی ہندوستان کے متعلق لاعلمی کا ذکر آگیا تو ایک بہت اچھا لطیفہ انھوں نے سُنایا ابھی کچھ دن پہلے جب ہندوستان میں شعراء کی تصویر والے ٹکٹ چھپنے کی خبریں اخباروں میں نکلیں تو امریکہ کے سب سے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز نے بھی اس خبر کو تفصیل سے چھاپا مگر غالب کا نام بھی غلط لکھا اور اُن کو بھی ہندو لکھ دیا۔ کاظم صاحب نے اڈیٹر کو ایک خط لکھا کہ یہ غلط ہے اس کی تردید کر دیجئے۔ وہاں سے بڑی ناخوشی کا خط آیا کہ آپ کو اعتراض نہیں کرنا چاہیئے تھا، آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ غالب مسلمان تھے۔ خیر انھوں نے کچھ ثبوت جو سمجھ میں آئے لکھ بھیجے مگر اڈیٹر صاحب نے تردید شائع نہیں کی۔ ہاں کچھ دنوں کے بعد ایک دوسری خبر دیتے ہوئے صرف اتنا کیا کہ غالب کا نام صحیح شائع کیا۔

جو ہندوستانی نیویارک میں آباد ہوگئے ہیں یا جو آتے رہتے ہیں اُن کے متعلق بہت سی باتیں بتاتے رہے کچھ بنگالی مسلمان، کچھ سکھ یہاں تجارت کرتے ہیں، جہازوں وغیرہ میں کام کرتے کرتے یہیں رہ گئے، محنت مزدوری کی اور پھر دوکانیں وغیرہ کھول لیں، حبشی عورتوں سے شادیاں کر لیں اور اب امریکی ہیں۔ مجھے شہر کے شمالی حصہ میں دُور ایک ریسٹران میں لے گئے، نام ہے پاکستان انڈیا ریسٹران۔ ایک بنگالی مسلمان چلاتا ہے۔ وہاں مرغ اور پراٹھا

کھایا گیا۔ جس حصّہ میں یہ ریسٹراں ہے اُسے ہارلم کہا جاتا ہے یہاں نوّے فیصدی حبشی آباد ہیں، اِس ریسٹراں میں بھی وہی آتے ہیں۔ مجھے تو نو بجے رات کو اِس جگہ وحشت سی ہو رہی تھی لیکن وہ بے فکر تھے۔ انھوں نے حبشیوں کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔ نیویارک میں اور مقامات کے مقابلہ میں مساوات ہے اس لئے جنوب کی طرف سے بہت سے حبشی نیویارک ہی میں چلے آئے ہیں اور بعض وکیل، ڈاکٹر، تاجر، اکاؤنٹنٹ وغیرہ ہیں، گورنمنٹ ملازمتوں میں بھی بعض اچھی جگہوں پر ہیں، ناچنے گانے کے ماہر ہیں اس لئے تھیٹروں وغیرہ میں بہت کماتے ہیں۔ جُوا، شراب، زناکاری، لُوٹ مار، قتل میں ان کا نام بہت آتا ہے۔ توہم پرست ہیں، اِن کی عورتیں اپنی آمدنی کا بڑا حصہ صرف خوبصورت بننے اور بالوں کی ژولیدگی نکالنے پر خرچ کرتی ہیں۔ مرد بے حد بدصورت بھدّے ہوتے ہیں عورتیں کبھی کبھی جاذب توجہ ہوتی ہیں یہ حبشی لاکھ ترقی کر گئے ہیں مگر اب بھی انھیں مساوی حقوق حاصل نہیں، اس لئے وہ خود بھی احساس کمتری کا شکار ہیں کبھی کبھی اب بھی ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں گھُسنے نہیں پاتے۔ بہرحال کاظم صاحب نے اُن کے بہت سے قصے اور لطیفے بتائے۔ وعدہ تھا کہ آج ہی کوئینس[1] میں جاکر اُن کا مکان بھی دیکھ لوں گا لیکن ساڑھے نو بج چکے تھے پروگرام ملتوی ہو گیا۔ موصوف سے پھر ملاقات ہوگی۔ بے حد مہربان اور ہمدرد ہیں۔ انھیں سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ یہاں آیا ہوں تو کچھ ایسا کروں کہ یہاں سے کچھ کمانے کا سلسلہ بھی رہے۔ اس موضوع پر پھر باتیں کرنے کو کہہ گئے ہیں۔ میں

---

[1] نیویارک کے کئی حصّوں میں سے ایک حصّہ کوئینس بھی ہے۔

ایسا ہوں کہ سود و زیاں کے جھگڑے میری سمجھ ہی میں نہیں آئے۔

۲۴ ستمبر بدھ ۔ رات ساڑھے بارہ بجے تک پڑھتا لکھتا رہا، پھر جو لیٹا تو نیند نہیں آئی، طبیعت سُست سی ہے، گھر یاد آرہا ہے ۔ ایک خط کے بعد پھر گھر والوں کا کوئی خط نہیں آیا ۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ میں مسلسل سفر میں رہوں گا اُن لوگوں کے خطوط مجھے جلد کیسے ملیں گے ۔ اور میں نیویارک کے علاوہ اور کہیں پتہ پر خط منگا بھی تو نہیں سکتا، نہ معلوم کتنے دن کہاں رہوں ۔ یہ خیال پریشان کُن ہے ۔ بھائی اور بیوی دونوں کو بیمار چھوڑ کر آیا ہوں جی چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے خط برابر آتے رہیں کسی یونیورسٹی میں ایک جگہ رہ کر کسی پروفیسر کے ساتھ کام کرنا ہوتا تو آسانی ہوتی، میرا کام تو طرح طرح کے لوگوں سے ملنا ہے، بہت ہوشیاری سے باتیں کرنا ہیں ۔ ہر روز کنواں کھودنا اور پانی پینا ۔ پھر معلوم نہیں ہر کنویں میں پانی ملے گا یا نہیں اور ملے بھی تو وہ میری ذہنی اور جذباتی صحت کے لئے کیسا ہو!

طبیعت سُست تھی پھر بھی پڑا پڑا کیا کرتا، نکلا تو پبلک لائبریری چلا گیا ۔ اتنی بڑی لائبریری میں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا پڑھنا چاہیے، کوئی خاص موضوع یا کتاب بھی ذہن میں نہیں ۔ لائبریری میں لوگ بڑی تعداد میں پڑھنے آتے ہیں، کچھ طلباء بھی معلوم ہوتے ہیں، عورتیں مردوں سے کم نہیں ہوتیں، محض نمائشیں اور فہرستیں دیکھتا رہا ایک بجے واپس آیا، جو مضامین رات پڑھے تھے اُن کے متعلق مسٹر گل پیٹرک کے لئے دو تین صفحے لکھے ۔ ساڑھے تین بجے راک فیلر سنٹر چل دیا ۔

دو ادیبوں سے ملنے کا پروگرام تھا مسٹر رچرڈ لوئس اور مسٹر ولیم کلفرڈ لیکن صرف مسٹر لوئس سے ملاقات ہوئی۔ نوجوان آدمی ہیں، پرنسٹن یونیورسٹی میں انگریزی ادب پڑھاتے ہیں۔ ایک ہفتہ بعد پرنسٹن میں ان سے ملنے کا وعدہ ہے، اُسی وقت اُن کے خیالات کا صحیح اندازہ ہوگا۔ مسٹر گل پیٹرک بہت ہمدردی کرتے ہیں لیکن میرا جی لگ نہیں رہا ہے۔ واپس ہوتے ہوئے نیویارک کی سب سے اونچی عمارت ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ دیکھی۔ ایک سَو دو منزلوں کی عمارت ہے اوپر ریڈیو اسٹیشن ہے۔ معلوم ہوا کہ کچھ دن پہلے اوپر کے حصّہ سے ہوائی جہاز ٹکرا گیا تھا۔ لوگ سیر کے لئے آتے ہیں اور ٹور کرانے والوں کا ایک دفتر ہے جو اوپر رصدگاہ (OBSERVATORY) تک لے جاتا ہے۔ میں بالکل اوپر تک نہیں گیا۔

۲۵ ستمبر جمعرات ۔ پہلے بھی دیکھ چکا تھا آج بھی اخباروں میں دیکھا کہ امریکہ کا ایف بی آئی (فیڈرل بیورو آف انوسٹیگیشن) کمیونسٹوں کے شکار میں مصروف ہے۔ آج یہاں کچھ لوگ پکڑے گئے کل وہاں۔ کہیں سے کوئی احتجاج نہیں ہوتا۔ آج کئی کالموں میں یہ خبر ہے کہ نیویارک کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان کی تلاش جاری رہی۔ بہت سے شُبہ میں پکڑ لئے گئے، سوال جواب ہوئے، کچھ چھوٹے کچھ گرفتار ہوئے۔ بعضوں پر یہ الزام ہے کہ وہ طلباء سے ایسی کتابیں پڑھنے کو کہتے ہیں جو انقلابی تعلیم دیتی ہیں۔

کئی دن سے خیال تھا کہ پاکستان ہاؤس جا کر احمد شاہ بخاری صاحب (کبھی کے پطرس) سے ملوں گا چنانچہ آج گیارہ بجے وہاں پہونچ گیا۔ دلّی اور

کراچی میں فاصلہ بہت ہے لیکن یہاں نیو انڈیا ہاؤس اور پاکستان ہاؤس کے درمیان صرف ایک سڑک کا فاصلہ حائل ہے۔ وائس کونسل سعد خیری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بڑے اخلاق سے ملے۔ ذہین ہیں اور اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں مختلف ادبی، سیاسی اور علمی مسائل پر باتیں ہوئیں۔ علامہ راشد الخیری مرحوم کی کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کا ذکر بھی آیا اور ہندوستان پاکستان میں عام اُردو ادب کی ترویج و اشاعت کا بھی۔ پطرس صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے ملاقات نہیں ہوئی۔ خیری صاحب نے اصرار کرکے دوپہر کا کھانا کھلایا اور میں تقریباً تین بجے واپس آیا۔

یہاں آئے ہوئے تقریباً دو ہفتہ ہو گیا لیکن کسی کسی وقت طبیعت بہت گھبراتی ہے ابھی واپسی میں تقریباً سال بھر کا وقفہ ہے لیکن ذہن ابھی سے اسکیمیں بنایا کرتا ہے۔ ففتھ ایوینو سے گذر رہا تھا کہ ٹامس کوک کا دفتر دکھائی دیا، میں اندر چلا گیا اور مئی جون ۱۹۵۳ء میں نیویارک سے یورپ جانے والے جہازوں کی فہرست لایا۔ بہت سے لوگوں کے پروگرام تو سال بھر پہلے ہی بن جاتے ہیں، اُس وقت کے ٹکٹ بکنے لگے ہیں لیکن میں اپنی اُلجھن کو سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ قید میں نہیں ہوں لیکن غالب کا شعر یاد آتا ہے ؎

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

۲۶ ستمبر جمعہ۔ پرسوں طے ہوا تھا کہ جمعہ کو گیارہ بجے مسز ویرا ڈین سے ملوں گا وہ فارن پالیسی ایسوسی ایشن کی نائب صدر ہیں چنانچہ آج صبح اِسی نیت سے نکلا اور میڈیسن ایونیو پر موصوفہ کے دفتر پہونچ گیا۔ اطلاع کرائی ذرا دیر کے بعد

خود ہی باہر تشریف لائیں اور اپنے ساتھ لائبریری کے کمرے میں لے گئیں۔
کرسیوں اور میزوں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہیں ان کے ایسوسی ایشن کے
جلسے، سیمینار اور مباحثے بھی ہوتے ہیں۔ مسز ڈین ادھیڑ عمر کی باوقار، وجیہ
اور دلکش شخصیت رکھنے والی خاتون ہیں اور امریکہ میں عزت کی نظر سے دیکھی
جاتی ہیں۔ اُن کی گفتگو میں جاذبیت، کشش اور گہرائی ہے۔ ہندوستان سے
دلچسپی ہے۔ اسی لئے انھوں نے زیادہ تر ہندوستان کے سیاسی اور معاشی
حالات کے متعلق باتیں کیں، میں نے ان سے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ میں ان
مسائل پر کوئی عالمانہ رائے نہیں دے سکتا اور نہ کسی جماعت کی نمائندگی
کرسکتا ہوں تاہم ہندوستان کے ایک پڑھے لکھے، محب وطن اور بہی خواہ
شہری کی حیثیت سے جو کچھ سمجھتا ہوں، وہ ضرور عرض کردوں گا۔ ہندوستان
میں بائیں بازو کے مستقبل اور کانگریس کی موجودہ حالت کے متعلق بہت سی
باتیں ہوئیں۔ آخر نومبر اور دسمبر میں ان کے ایسوسی ایشن کی سرکردگی میں
ہندوستانی مسائل کے متعلق لکچروں کے ذریعہ ایک کورس پڑھایا جائے گا،
موصوفہ کی خواہش ہے کہ میں بھی تین لکچر دوں۔ میں نے وعدہ نہیں کیا ہے لیکن
اگر ان کا زیادہ اصرار ہوا تو میں ہندوستانی تہذیب اور ادب کے متعلق کچھ خیالات
ظاہر کردوں گا۔ ظاہر ہے کہ بہت محتاط الفاظ میں اظہار خیال کرنا ہے۔ پھر ملنے
کے وعدے پر مسز ڈین سے رخصت ہوا، انھوں نے اپنے یہاں کے کئی پمفلٹ
مجھے دیے۔

جب میں مسز ڈین سے باتیں کر رہا تھا تو اُن کا پُروقار اور بزرگانہ چہرہ

دیکھ کر میرا خیال اور سمتوں میں بھی گیا۔ کئی دن سے یہاں کے طبقۂ نسواں کے متعلق کچھ مبہم سی باتیں ذہن میں آ رہی تھیں وہ کسی قدر واضح ہونے لگیں۔ مجھے برابر یہ احساس ہوا کہ یہاں کی جوان عورتوں کے چہرے، خط و خال، رفتار و گفتار میں وہ دلکشی نہیں ہے جس کی آرزو کی جاتی ہے۔ کبھی بھولے بھٹکے کوئی چہرہ ایسا نظر آ جاتا ہے جسے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہو ورنہ عام طور پر نہ تو وہ معصومیت ہے جو متوجہ کرے نہ وہ چال ہے جس میں شراب کی مستی ہو، نہ آنکھوں میں وہ رس ہے جو انسان کو مدہوش بناتا ہے، نہ تبسّم میں وہ دلکشی ہے جو نشتر کا کام دے، نہ انداز میں وہ جلال ہے جو شہزادیوں کے استغنا اور غرور کی یاد دلائے۔ عورتیں بس عورتیں ہیں شعر و شراب نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے چہروں میں جنسی کشش کا زمانہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ اور وہ وہی ہے جب جوانی طفلی سے گلے ملتی ہے۔ بچیوں کے چہروں میں معصومیت، دلکشی اور حسن، عمر رسیدہ خواتین کے یہاں نسوانی وقار، سنجیدگی اور کشش کا احساس ہوتا ہے مگر وہی بوتلیں خالی ہیں جن میں شراب دو آتشہ کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ مگر کیا خبر، یہ میری غلط بینی ہو اور آئندہ میری رائے بدل لے!

اس دفعہ تو زیادہ تر سوالات مسز ڈین ہی نے پوچھے اب ملاقات ہوگی تو کچھ میں بھی پوچھوں گا۔ میں نے ان کے پمفلٹ کے کچھ حصے آج دیکھ ڈالے، وہ اچھے خاصے رواداراں انداز میں امریکہ کے متعلق دوسرے ملکوں کے ردِ عمل پہ نگاہ ڈالتی ہیں لیکن موجودہ حاکم طبقہ کے اس جرم کو نظر انداز کرتی ہیں کہ وہ امریکہ کی سرمایہ داری کے تحفظ کے لئے اربوں ڈالر خرچ کر کے دُنیا کو جنگ کی

کلنٹی میں جھونکنا چاہتا ہے۔

مسٹر ڈین کے دفتر سے نکلا تو ایک بجنے کے قریب تھا تھوڑی دور آگے بڑھ کر اقوام متحدہ کی نئی عمارت ہے، میں نے سوچا وہ بھی دیکھ لوں۔ اِس میں شک نہیں کہ دریا کے کنارے یہ اونچی شاندار عمارت بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے فیصلے جو کچھ بھی ہوں، انسانوں کی ایک ساتھ مل بیٹھنے اور اپنے مسائل حل کرنے کی خواہش کا پتہ تو اِس سے چلتا ہے! اِس پر عمل ہو یا نہ ہو یہاں انسانوں کے بنیادی حقوق کا منشور تو تیار ہوتا ہے! یہاں ہر ملک کے لوگ دکھائی دیے، جن میں کچھ تماشائی تھے اور کچھ کام کرنے والے۔ یہاں کے بعض اجلاسوں میں شرکت بھی کی جا سکتی ہے آج تو محض اس کی جھلک دیکھی ہے پھر کسی دن یہاں وقت گزاروں گا۔

شام کو کاظم ظہیر نے آنے کا وعدہ کیا تھا اُن کا انتظار کرتا رہا۔ وہ آئے تو اُن کے ساتھ اُن کے گھر اور وہاں سے انٹرنیشنل ہاؤس گیا۔ یہاں کئی ہندوستانی طالب علموں سے ملاقات ہوئی اور سب سے دلچسپ بات یہ ہوئی کہ میرا وہ اٹیچی مجھے مل گیا جو میں نے بمبئی ہی میں اسباب کی زیادتی کی وجہ سے ایک اور صاحب کے سپرد کر دیا تھا، نیویارک میں وہ اُن کے ساتھ چلا گیا اُن کا نام تو یاد نہیں، بہار کے رہنے والے کوئی مسٹر جھا تھے، صورت، بات چیت اور چال ڈھال سے کچھ یونہی سے معلوم ہوتے تھے، امریکہ میں پڑھنے کے لئے آئے تھے، یہاں پہونچ کر اس قدر دہشت زدہ ہوئے کہ لوگوں کے سمجھانے کے باوجود دو ہی تین دن میں ہندوستان کا ٹکٹ خرید لیا، میرا اٹیچی ایک ہندوستانی کے پاس چھوڑ گئے کہ ملیں تو دیدینا۔

ایسے لوگ کیوں آتے ہیں پڑھنے کے لیے! اور لطف یہ ہے کہ اپنے خرچ سے آئے تھے۔

انٹرنیشنل ہاؤس سے کاظم ظہیر وغیرہ نے سیر کا پروگرام بنایا۔ چند اور ہندوستانی تھے، موٹر میں بیٹھ کر کم سے کم چھ گھنٹے ہم لوگ گھومتے پھرتے رہے، دو چار جگہ رُکے بھی، ایک جگہ جسے کونی آئی لینڈ کہا جاتا ہے، بہت بڑی مستقل تفریح گاہ ہے، بہت ہی بڑا کارنیوال، اُس کی رونق سردی کی وجہ سے کم تھی مگر اب بھی یہاں ایک دنیا آباد ہے۔ حیرت یہ ہے کہ جتنی دُور بھی گئے نیویارک کی روشنی، ٹریفک، چہل پہل میں کمی نظر نہیں آئی۔ اس وقت واپس ہوا ہوں تو رات کے دو بجے ہیں۔

۲۷ ستمبر سنیچر ۔ آج کی سب سے بڑی خبر یہ ہے کہ لکھنؤ سے خط آیا، بیوی، بچوں اور عزیزوں کا حال معلوم ہوا کسی قدر اُلجھن کم ہوئی، ذمہ داری کا احساس یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ خاندانی زندگی کا یہ پہلو دلچسپ نفسیاتی نوعیت رکھتا ہے جس دن گھر سے چلا ہوں ایک بچّہ صرف آٹھ دن کا تھا بیوی کو کمزور اور بیمار چھوڑ کر آیا ہوں، چھوٹا بھائی اقتدار بیمار تھا، ان خیالات کو کہاں لے جاؤں میں خود کو کسی چیز میں بالکل کھو بھی تو نہیں سکتا!

یہ طے ہو گیا کہ تین چار دن میں مجھے نیویارک سے نکلنا ہے۔ مرکز تو نیویارک ہی رہے گا لیکن میں یہاں کی سبھی اہم یونیورسٹیوں اور شہروں میں جاؤں گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ امریکہ نیویارک کے باہر ہے، باہر بھی دیکھوں گا۔ پہلی اکتوبر کو نکلنے کا خیال ہے۔ پہلے پرنسٹن، پھر فلاڈلفیا اور پھر واشنگٹن۔

۲۸ ستمبر اتوار ۔ چند دن ہوئے آرتھر کوسلر کی نئی کتاب ARROW IN THE BLUE نکلی ہے ۔ یہ اُس کی خود نوشت سوانح عمری کا پہلا حصہ ہے اور یہاں ہر رسالہ میں اُس پر تبصرہ شائع ہو رہا ہے ۔ سارے تبصروں سے صرف ایک بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ اسے فنِ سوانح نگاری کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ رہے ہیں ۔ بلکہ کوسلر کی ساری اہمیت یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنی تصانیف میں بڑی تفصیل سے کمیونسٹ پارٹیوں کی اندرونی کمزوریوں، بددیانتیوں اور غلطیوں کا تذکرہ کیا ہے اور مدت تک کمیونسٹ رہنے کے بعد پارٹی سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس پروپیگنڈے سے اپنی شہرت میں اضافہ کیا ہے ۔ کوسلر کی مغربی اَدب میں ایک اہم جگہ بن گئی ہے اس لئے اُس کی کتاب لوگوں کو بہت متاثر کرے گی ۔ ابھی کچھ دن پہلے اسٹیفن اسپنڈر نے اپنی سوانح عمری شائع کی تھی ، اُس میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار تھا ، اور سرمایہ دار یا قدامت پرست پریس نے اُس کا بھی شاندار خیر مقدم کیا تھا ۔ مجھے ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ سارے نقاد اُن کی کتابوں کی تبلیغی اہمیت ہی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں ' یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی ادبی حیثیت کیا ہے ۔ یعنی جو الزام مارکسی نقادوں پر لگاتے ہیں اُس کا شکار آپ ہیں ۔ دونوں نے اپنی سوانح عمریاں ہوا کا رُخ دیکھ کر لکھی ہیں ، اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ۔ کوسلر نے تو خیر زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں ، بہت سے تجربے کئے ہیں لیکن اسپنڈر کے یہاں ایک قسم کی داخلی دُنیا کی ترجمانی کے سوا اور کیا ہے ! اُڑنے کی کوشش اور گر پڑنے کی داستان !

اِس سلسلہ میں اس کتاب کا بھی خیال آگیا GOD THAT FAILED جو مدراس میں پڑھی تھی - اس میں بھی کوسٹلر ہی کا مضمون سب سے اہم ہے۔ اس کا موضوع دلچسپ ہے - چھ اہم لکھنے والوں - کوسٹلر، سِلونے، رچرڈ رائٹ، ژید، لوئی فشر اور اسپنڈر ـــــ نے کمیونزم سے اپنی علیحدگی کی داستانیں بیان کی ہیں اور ایک ساتویں نے اُنھیں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ میرے خیال میں صرف کوسٹلر اور ژید کے مضامین اہم ہیں، بعض حصے سِلونے اور فشر کے بھی غور طلب ہیں - اس کتاب کے متعلق بعض خیالات برابر ذہن میں آتے رہے ہیں اُنھیں کیوں نہ لکھ دوں - آج اور کچھ نہیں لکھنا ہے۔

آرتھر کوسٹلر نے اپنے مضمون کی ابتدا ہی میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس طرح محبت دلیل اور عقل کی مدد سے نہیں کی جا سکتی اُسی طرح سیاسی عقیدہ بھی شدید جذبہ کی پیداوار ہوتا ہے - میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں - اِسی طرح میں کوسٹلر کے اس خیال کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کہ ہمیشہ یوٹوپیا (خیالی مکمل اور آسودگی بخش دنیا) ہی کا تصور دُہرایا جاتا رہا ہے - اور مارکس وغیرہ نے بھی کمیونزم کی جو شکل بتائی ہے وہ آخر میں ابتدائی دَور تہذیب کی PRIMITIVE COMMUNISM ہو کر رہ جائے گی - میرا خیال ہے کہ کوسٹلر نے مارکس کے تاریخی تصور اور جدلیت کی جان بوجھ کر غلط تعبیر پیش کی ہے - جہاں تک مجھے یاد آتا ہے سائنٹیفک کمیونزم اور ابتدائی کمیونزم کے فرق پر لافاگ نے اپنے رسالہ EVOLUTION OF PRIVATE PROPERTY میں دلچسپ بحث کی ہے اور اینگلز نے تو اپنی مشہور کتاب میں یوٹوپیائی اور سائنٹیفک سوشلزم کا

فرق بڑے علمی انداز میں واضح کیا ہے۔ کوئسلر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ مغربی تہذیب اور جمہوریت کے کھوکھلے پن اور ذاتی زندگی کی کشمکش نے اُسے کمیونزم کی طرف متوجہ کیا وہ کئی جگہ انفرادیت کے تحفظ پر بھی زور دیتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت بحث طلب ہے اور یہاں اُسے چھیڑنے کا موقع نہیں کہ انفرادیت اور اُس کے تحفظ کا کیا مطلب ہے۔ سلونے، رائٹ، ژید اور اسپنڈر ہر ایک نے فرد کی آزادی کے سوال سے بحث کی ہے۔

کوئسلر کو کمیونسٹ پارٹی سے چند باتوں کی خاص شکایت ہے۔ مثلاً یہ کہ پارٹی کے بڑے لوگ مغرور اور دوسروں کے وقت کی طرف سے بے پرواہ ہوتے ہیں، لاکھ خلوص سے کام کرو اعتبار نہیں کرتے، پارٹی کے ممبروں کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ پالیسی کب اور کہاں بنتی ہے، مجھ سے صرف مخبری چاہتے تھے، لفظوں کے اُلٹ پھیر سے باتوں کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں، تنقید اور اختلاف رائے کو پارٹی سے غداری سمجھتے ہیں، دانشوروں اور فنکاروں سے نفرت کرتے ہیں اور انھیں کوئی اہم جگہ نہیں دینا چاہتے۔ اس طرح اُس نے ایک لمبی فہرست تیار کی ہے، یہی نہیں بلکہ روس پر یہ الزام لگایا ہے کہ جب وہ روس گیا تو وہاں اسے بڑی رقم کتاب لکھنے کے لئے پیشگی دی گئی — ایسے ہی چھوٹے بڑے بہت سے الزامات ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اعتراضات ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کی مختلف کمیونسٹ پارٹیوں پر ہیں اور یہ زمانہ یورپ کی تاریخ میں اتنا نازک رہا ہے کہ اگر کوئی کوئسلر اسے محض اپنے انفرادی مفاد اور وقار کی نظر سے دیکھنا چاہتا ہے تو یہ اُس کی بڑی غلطی ہے۔

اٹلی کے مشہور مصنف اگنیزیو سلونے جس کی مشہور کتاب فانتا مارا کا ترجمہ اُردو میں بھی ہو چکا ہے، کمیونسٹ پارٹی سے علیحدگی کے سلسلہ میں سب سے زیادہ زور اِس پر دیتا ہے کہ لینن، ٹراٹسکی، اسٹالین سب اپنی بات کے علاوہ کسی اور کی بات نہیں مانتے تھے اور ہر چیز کو محض روس کے مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ اُس نے بہت سے واقعات کی تفصیل دی ہے جب تک اُن کا علم نہ ہو اُس کے متعلق کوئی رائے نہیں دی جا سکتی۔ اُسے اِس بات پر بھی اعتراض ہے کہ کمیونسٹوں نے سوشلزم کو سائنس بنا دیا، یہ درست نہیں، تاریخی ارتقا میں قطعیت نہیں ہو سکتی۔

امریکہ کے نیگرو مصنف رچرڈ رائٹ کو دو خاص شکایتیں ہیں اوّل یہ کہ سفید فام کمیونسٹ بھی نیگرو کمیونسٹ سے نفرت کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ فن کار کی کوئی اہمیت پارٹی میں نہیں اور وہ اپنی بات کہنے کے لئے آزاد نہیں ہے۔

فرانس کے مشہور مصنف اور فلسفی آندرے ژید کے خیالات ایک فرانسیسی خاتون اسٹار کی نے ژید کے مشورہ سے اُس کی کتابوں سے اکٹھا کئے ہیں۔ ژید کا انداز بیان پر جوش بلکہ رومانی ہے وہ اپنی ابتدائی اور آخری تحریروں میں داخلیت پسندی کی حیثیت سے نمایاں ہوا ہے اُس نے روس کے متعلق بہت کچھ پڑھا اور سوچا تھا لیکن جب اُسے روس جانے کا موقع ملا اور وہاں اُس نے اپنے خوابوں کی تعبیر اُس شکل میں نہیں پائی جس میں وہ دیکھنا چاہتا تھا تو اُسے بہت تکلیف ہوئی اور اُس نے بڑے جذباتی انداز میں اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اُسے اس بات کا اعتراف ہے کہ پندرہ سولہ سال میں روس نے

جتنا کچھ کر لیا کوئی اور نہیں کر سکتا تھا لیکن اُسے شکایت یہ ہے کہ اس سے زیادہ بتایا کیوں گیا۔ ژید اس بات کا شاکی ہے کہ فن کار آزاد نہیں ہے، روس میں اب بھی عوام اور خواص ہیں اور بڑا فرق مراتب میں پایا جاتا ہے۔ لوئی فشر، جو امریکہ کا مشہور صحافی ہے اسٹالین کی حکومت سے خوش نہیں، اُس نے اس موضوع پر اور بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اسپنڈر کو اشتراکی تنقید نگاری سے شکایت ہے۔

اگر اس کتاب کو غور سے پڑھا جائے تو چند باتیں واضح ہوتی ہیں۔ یہ سب کے سب لکھنے والے مارکسزم کے فلسفہ اور اصول کو اپنے جذبات کا تابع بنانا چاہتے ہیں، یہ انفرادیت کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور انفرادی آزادی کے مفہوم اور حدود پر غور نہیں کرتے ایک سائے کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ ذاتی ناکامیوں، خلش اندوزیوں اور جذباتی ناآسودگیوں کی وجہ سے کمیونزم کی طرف گئے اور جب فوراً ان کے خیال کے مطابق نتائج نہیں نکلے تو وہ واپس چلے آئے۔ یہ کتاب کس مقصد سے مرتب کی گئی ہے یہ بحث الگ ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میں جو مسائل اٹھائے گئے ہیں ان پر علمی اور تشفی بخش انداز میں بحث کی جائے، صرف یہ کہہ کر نہ ٹال دیا جائے کہ یہ مخالفوں کا پروپیگنڈا ہے کیونکہ کوئسلر کو اس بات کی بھی شکایت ہے کہ کمیونسٹ اپنے سوا دوسروں کی چیز پڑھتے ہی نہیں۔

آج صبح ڈاکٹر رضا زادہ شفق سے ملنے کا وقت مقرر تھا، میں پہونچا تو وہ جا چکے تھے میرا خیال ہے کہ وقت کے معاملہ میں کچھ غلط فہمی ہوئی۔ آج ہی

نیویارک کی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے ہٹائی گئی ہیں، ہو سکتا ہے کہ انھوں نے
اس کا خیال نہ کیا ہو۔ امریکہ کے مختلف حصّوں میں مشرق سے مغرب تک
چار وقت رائج ہیں۔

۲۹ ستمبر دوشنبہ۔ اکتوبر کے فیلوشپ کا چک پرسوں ہی مل گیا تھا خیال ہوا کہ
آج ذرا یہاں کے بینکوں کی سیر کرنا چاہئے۔ ایک چک ایک دوسرے بینک کا تھا
دونوں بینک، جن میں جانا تھا۔ پاس ہی پاس تھے، اندر داخل ہوا، ایک شخص نے
بڑھ کر پوچھا، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟ میں نے اپنی ضرورت بتائی، وہ
ایک صاحب کے پاس لے گیا۔ انھوں نے پوچھا آپ کے پاس پاسپورٹ ہے،
میں ساتھ لیتا گیا تھا انھوں نے اپنے سامنے مجھ سے دستخط کرائے اور پھر اُسی
شخص کے ساتھ کاؤنٹر پر بھیج دیا، دو تین منٹ سے بھی کم وقت میں مجھے رقم
مل گئی۔ میں نے ایک آدھ بینک اور بھی دیکھے ان میں ایک وقت میں چند
آدمیوں سے زیادہ نہیں دکھائی دیتے، معلوم نہیں ایسا بینکوں کی زیادتی کی
وجہ سے ہے یا کام اتنی جلدی ہو جاتا ہے کہ بھیڑ نہیں ہوتی۔

مسٹر گل پیٹرک سے ملا، کام کے سلسلہ میں معمولی باتیں ہوئیں اور طے ہو گیا کہ
میں پہلے پرنسٹن پھر فلاڈلفیا (پن سِل وَینیا) اور بعد میں واشنگٹن جاؤں گا۔
وہیں بیٹھا تھا کہ ہندوستانی سفارت خانہ واشنگٹن کے شعبۂ تعلیم سے پروفیسر سُندرم
کا خط آیا۔ یہ میرے خط کے جواب میں تھا۔ انھوں نے واشنگٹن آنے پر زور دیا ہے۔

شام کے وقت مسٹر نارمن کزنس سے ملنے کا پروگرام تھا، نیویارک کے
مشہور ادبی ہفتہ وار SATUR DAY REVIEW OF LITERATURE کے

اڈیٹر ہیں۔ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ امریکہ میں ہندوستانی ادب سے جو دلچسپی لی جا رہی ہے اس کے متعلق باتیں ہوئیں، میں نے وہ اسباب بتائے جن کی وجہ سے ہندوستان کو امریکہ کی ہمدردی پر شک ہے۔ مسٹر نارمن کزنس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ہندوستانیوں کا خوفزدہ ہونا اور مشکوک نگاہوں سے دیکھنا تعجب کی بات نہیں لیکن امریکہ نے ابھی صرف پینتیس ۳۵ سال ہوئے اپنے خول سے باہر قدم نکالا ہے اور جس حد تک ہو سکا ہے بے غرضی کے ساتھ دنیا کی علمی، سائنٹیفک اور تعلیمی کوششوں میں مدد دی ہے۔ اُسے اپنے ہمدردی کے دعووں کو پورا کرنے کا موقع تو دینا چاہیئے! انھوں نے اِس بات پر بھی زور دیا کہ ہندوستان کے اچھے مصنفوں کی کتابیں امریکہ میں چھپنی چاہئیں، اِس سلسلہ میں وہ بہت مدد کر سکیں گے۔

آج بھی عادتاً کتابوں کی دوکانوں میں چکّر لگاتا رہا۔ بہت اعلیٰ درجہ کی تو نہیں مگر بعض اچھی کتابیں سستے داموں مل رہی ہیں، خرید لوں تو کروں گا کیا؟ کہاں رکھوں گا؟ چلتے وقت دیکھا جائے گا۔ بعض اخباروں کے اسٹالوں پر سوویٹ لٹریچر وغیرہ بھی نظر آئے۔ یہ نیوز اسٹال عام طور سے یہودیوں کے معلوم ہوتے ہیں۔

۳۰ ستمبر منگل --- چند دن ہوئے میں نے کاظم صاحب کو خط لکھا تھا کہ میں باہر جانے والا ہوں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ درحقیقت اس میں ایک غرض پوشیدہ تھی۔ میرے پاس ایک بکس ہے جو ضرورت سے زیادہ بڑا ہے۔ اُسے لے کر چلنا حماقت ہے۔ میں نے خیال کیا کہ ایک دوسرا چھوٹا بکس خرید لوں اور

اسے غیر ضروری سامانوں کے ساتھ کاظم صاحب کے یہاں رکھ دوں جب امریکہ سے جانے لگوں گا اُس وقت لے لوں گا۔ موصوف نے رات ٹیلیفون سے مطلع کیا تھا کہ صبح کو اپنی کار لے کر آئیں گے۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے وہ آ گئے اور ہم لوگ اُن کے مکان روانہ ہو گئے۔ راستہ کے بعض حصّے ایسے گنجان نہ تھے جن سے نیچ نیویارک میں سابقہ پڑتا ہے۔ کوئینس میں پہونچ کر رہنے کے چھوٹے چھوٹے مکان ملے، کاظم صاحب کا مکان مختصر سی جگہ میں ہے لیکن آسائش کا ہر پہلو اِس میں موجود ہے، بڑی خوبصورتی سے سجا ہوا ہے، فرنیچر اچھّا، صاف سُتھرا اور آرام دہ۔ یہاں مکان بنانے اور مکان میں رہنے کا سلیقہ بھی لوگوں کو آتا ہے، کوئی جگہ بیکار نہیں، پھر مشین ہر قسم کا کام کرنے کو موجود۔ کاظم صاحب نے مکان کا ہر حصّہ دکھایا اور گیس پلانٹ، کپڑا دھونے کی مشین، باورچی خانہ ہر چیز کے متعلق ضروری باتیں بتائیں۔ موصوف نے اپنی زندگی کے بہت سے واقعات، اپنے خاندان کے حالات بتائے اور اپنے خُلق سے مجھے شرمندہ کرتے رہے۔ وہ صرف پڑھے لکھے ہی نہیں تجربہ کار بھی ہیں۔ اُن کا دفتر اور فائلیں رکھنے کا طریقہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ بہت دیر تک اُن کے ساتھ وقت گذار کر واپس آیا۔

طبیعت تھکی تھکی سی تھی لیکن پھر بھی میں شام کے وقت نکل کھڑا ہوا ــــ پن سلوینیا اسٹیشن پر پہونچا کہ ٹرینوں کے متعلق دریافت کروں اور ٹکٹ خرید لوں۔ پن سلوینیا کا اسٹیشن بہت بڑا ہے، اونچے اونچے لوہے کے محراب اور شیشے کی چھتیں حیرت میں ڈالتی ہیں، میَں ایک دن کاظم صاحب کے ساتھ اسے اور نیویارک سنٹرل دونوں مشہور اسٹیشنوں کو دیکھ آیا تھا۔ گاڑی کا وقت معلوم کیا

ٹکٹ خریدا اور چلا آیا۔

یکم اکتوبر بدھ - آنکھ سویرے ہی کھل گئی، کوئی خلش ہو تو میرے ساتھ یہی ہوتا ہے اور سفر پر روانہ ہونا خلش ہی ہے - پھر اَن دیکھے راستوں پر، اَن دیکھی سمتوں اور اجنبی لوگوں میں جانے کا خیال اور اُلجھن پیدا کرتا ہے۔ خیریت یہ ہے کہ پرنسٹن یونیورسٹی کے انگریزی کے اُستاد مسٹر رچرڈ لوٹس سے پہلے ملاقات ہو چکی ہے۔

وائی ایم سی اے میں میں نے ۳؍ اکتوبر تک کا کرایہ جمع کر دیا تھا جب کنجی جمع کرنے گیا تو دو دن کا کرایہ واپس مل گیا، میں وقت سے پہلے ہی اسٹیشن پہونچ گیا - یہاں قلی کو بہت پیسے دینے پڑتے ہیں اس لئے زیادہ تر لوگ اپنا اسباب خود اٹھائے چلتے ہیں - اجنبیت کی وجہ سے میں نے قلی کر لیا، مگر وہ صرف اندر پہونچا کر چلا گیا - گو یا وہ باقاعدہ اسٹیشن کا پورٹر نہ تھا۔ وقت کافی تھا اپنی حیرت دُور کرنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا - یہ اسٹیشن ایک بڑا بازار ہے جس میں ہر چیز مل سکتی ہے۔ چھوٹی بڑی مشینیں رکھی ہوئی ہیں، پیسے ڈالئے اور چیز حاصل کر لیجئے - ایک مشین میں چار طرح کی شراب، ایک میں چار طرح کے پھلوں کا رس ہے، پیسے ڈالئے آپ جو چاہیں گے اُس کا گلاس نکل آئے گا۔ ایک مشین ہے جس میں آپ اپنی تصویر آپ کھینچ سکتے ہیں، آپ سامنے بیٹھ جائیے، پیسے ڈال کر، دستہ گھمائیے، چند لمحوں میں آپ کی تصویر نکل آئے گی -اِدھر بڑھئے ایک مشین گول سے مڈل پر آپ کا نام ابھی کھود کر دے دیگی -اُدھر نظر کیجئے یہ مشین آپ کی آواز کا ریکارڈ بنا کر آپ کے حوالے کر دے گی - سب

پیسے کا کھیل ہے دلچسپی کی کوئی کمی نہیں۔ مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے حیرت میں ڈالا وہ روشنی کی مدد سے دروازوں کا کھلنا تھا۔ بجلی کی ایک روشنی دروازے کے قریب پڑ رہی ہے جیسے ہی آپ کے قدم اُس روشنی کو کاٹتے ہیں دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے اور جیسے ہی آپ گذر جاتے ہیں وہ بند ہو جاتا ہے۔ مگر جس کے سر پر سفر سوار ہو اور اجنبی دیس میں تنہا ہو اُس کے لئے ان تفریحات میں زیادہ لُطف نہیں۔ اِس اسٹیشن سے سیکڑوں گاڑیاں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں اور کوئی گاڑی نظر کے سامنے نہیں، سب زمین کے اندر ہیں۔ گاڑی چھوٹنے سے صرف پانچ چھ منٹ پہلے ویٹنگ روم میں مائکروفون سے آواز آئے گی کہ فلاں جگہ جانے والی گاڑی فلاں نمبر کے پلیٹ فارم سے چھوٹ رہی ہے۔ اب اگر آپ نے پوری توجہ سے نہیں سُنا تو مصیبت ہے۔ اگر آپ نے ٹھیک سے سُن لیا تو اسباب اُٹھائیے اور چلئے۔ میرے ساتھ ایک بکس ایک اٹیچی اور ایک کاغذات رکھنے کا پورٹ فولیو ہے، اُسے لے کر نیچے اُترنا مصیبت ہو گیا، وہاں پہونچا تو کئی گاڑیاں نظر آئیں، ایک ریلوے آفسر دکھائی دیا اُس سے پوچھ کر ایک گاڑی میں گھس گیا۔ دو منٹ کے اندر گاڑی روانہ ہو گئی۔ یہاں ہر جگہ اطلاع حاصل کرنے کے اتنے ذرائع ہوتے ہیں کہ انسان بہت سی مصیبتوں سے بچ سکتا ہے مگر ہر وقت ہر بات کا پوچھنا بھی تو ایک مصیبت ہے۔

پرنسٹن نیویارک سے صرف اُنچاس میل کے فاصلے پر ہے لیکن ایک جگہ گاڑی بدلنا پڑتی ہے اور دونوں گاڑیوں کے پہونچنے اور چھوٹنے میں صرف ایک منٹ کا وقفہ ہوتا ہے۔ یہاں اسی جلدی اور تیزی کی وجہ سے لوگ کم اسباب

لے کر چلتے ہیں۔ میں نے کہیں بھی بستر وغیرہ کے قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی۔ گاڑیاں بڑی خوبصورت، آرام دہ اور تیز رفتار ہیں اور اسٹیشنوں پر ذرا دیر کے لئے رکتی ہیں۔ میرا سفر صرف ستاون منٹ کا تھا جب ٹرین نیو یارک سے روانہ ہوئی تو تھوڑی دیر تک تو زمین کے اندر ہی چلتی رہی، بعد میں کھلی ہوئی جگہ میں آ ئی۔ باہر مناظر دلچسپ تھے، ہری گھاس، سبز درخت، پھول، جھاڑیاں، جنگلی خود رو درخت سبھی چیزیں نظر آئیں۔ باہر نکل کر بڑی بڑی فیکٹریاں بھی ملیں۔ نیو یارک میں اور نیو یارک کے باہر پلوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ لوہے، پتھر، اینٹ، سیمنٹ اور گارے سے میلوں لمبے پل بنائے گئے ہیں۔ جن میں کئی درجے ہوتے ہیں۔

امریکہ کی گاڑیاں حکومت کی نہیں سرمایہ داروں کی ہیں اور طرح طرح کی ہیں۔ آپ آرام و آسائش کے جو طریقے سوچ سکتے ہیں سب ان میں موجود ہیں اور طویل سفر میں اُن کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ سفر مہنگے ضرور پڑتے ہیں مگر یہاں کا جو معیار زندگی ہے اُس کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوتی۔ چھوٹے سفر کے لئے آرام کرنے کی جگہ کی ضرورت ہی کہاں ہوتی ہے۔ میں نے آج جن گاڑیوں میں سفر کیا اُن میں صرف ایک درجہ تھا اور جگہ صرف بیٹھنے کے لئے تھی کبھی کبھی گارڈ یا ٹکٹ کلکٹر اسٹیشن کے قریب زور سے آواز دیتا ہے کہ کون سا اسٹیشن ہے۔ ٹکٹ سلسلہ وار خاموشی سے چیک کرتا ہے۔ خیر تو میں ستاون منٹ میں پرنسٹن پہونچ گیا۔ ٹیکسی میں بیٹھا اور ایک ہوٹل میں آ گیا۔ اس ہوٹل کا نام ہے، نیسا ؤ ینٹے وَرنَن ابھی اس کا تھوڑا سا ذکر کروں گا۔

پرنسٹن پہونچ کر دنیا ہی بدل گئی۔ نیو یارک سے کس قدر مختلف ہے

یہ جگہ! ایک چھوٹا سا، ہرا بھرا خوبصورت شہر ہے اور صرف یونیورسٹی کی وجہ سے اس کی یہ حیثیت ہے۔ اسے تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے کیونکہ جنگِ آزادی کے دوران میں واشنگٹن نے اپنی معرکہ خیز لڑائی یہیں لڑی تھی اور وہ میدان اب بھی موجود ہے۔ اس شہر کی تعمیر میں قدیم اور جدید کی آمیزش ہے اور یہ ہوٹل اس کا سب سے اچھا نمونہ ہے۔ دو سو سال پہلے یہ ایک سرائے تھی، اُس عہد کی یادگار بعض چیزیں اس میں اب بھی موجود ہیں نیچے کے حصہ میں اُس قدامت کا ماحول نظر آتا ہے اوپری حصہ بالکل جدید انداز کا ہے گویا اب یہ ایک بہت ہی خوبصورت آرام دِہ اور نیویارک کے ہوٹلوں کی طرح گراں ہوٹل ہے۔ کھانا اچھا اور محلِ وقوع مناسب ہے۔ سڑک کے اُس پار یونیورسٹی ہے جس کی عمارتیں گاتھک انداز میں بنائی گئی ہیں، بہت بڑی اور شاندار!

دو بجے مسٹر رچرڈ لوئس سے ملاقات ہوئی اور اُن کے ساتھ یونیورسٹی کے بعض حصے دیکھے۔ یہاں ایک طرح کی باہمدگر مخلوط اور خود مکتفی زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ لائبریری بہت بڑی، شاندار اور خوبصورت ہے۔ اُسی کے بعض کمروں میں پروفیسر بیٹھے ہیں۔ بہت سے شعبے اور بہت سے پروفیسر ہیں، جو اپنے کاموں میں منہمک نظر آتے ہیں۔ جرمنی کا مشہور یہودی سائنس داں آئن اسٹائن بھی یہیں اپنی تحقیقات میں مصروف ہے۔ ابھی کل تک یہاں مشرقی کتابوں، مخطوطوں، تصویروں اور قطعوں کی ایک نمائش ہو رہی تھی آج ختم ہو گئی لیکن لائبریری کے مشرقی شعبہ کے نگراں نے ازراہِ عنایت مجھے بہت سی چیزیں خاص طور سے دکھائیں۔ خطاطی کے بہت اچھے نمونے اور مغل، راجپوت

اور بیجا پور اسکول کی بہت سی تصاویر موجود ہیں قلمی کتابیں کم ہیں۔ قطعات میں عماد الحسینی کے بعض نوادر بھی ہیں۔ ہندی کا ایک قدیم مخطوطہ جس کی تاریخ کا اندازہ نہ ہوسکا مدھ مالتی کی کتھا کے نام سے موجود ہے ہندو اساطیری داستانوں کے بعض نقش لکڑی پر کھدے ہوئے موجود ہیں اور بہت اچھے ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کہاں کی چیزیں کہاں پہونچ جاتی ہیں۔ یہاں سے نکل کر پروفیسر جے اوٹس سے ملا جو یونانی اور قدیم کلاسکی شعبہ کے چیرمین ہیں بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ اپنے ایک سنسکرت کے پروفیسر کو ہندوستان بھیجنا چاہتے ہیں لائبریری کے اندر جو ریسٹراں ہے اُس میں لے جاکر کافی پلائی اور دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کا موضوع تھا عہد جدید میں کلاسکی ادب کی تعلیم کی ضرورت۔

رچرڈ لوئس کا اخلاق کچھ ہندوستانیوں کا سا ہے، وہ میرے ساتھ پانچ بجے تک پھرتے رہے اور اس وعدے پر رخصت ہوے کہ رات کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ چنانچہ میں نے اِدھر اُدھر پرنسٹن کے بازار میں وقت گذار کر کھانا اُنھیں کے گھر پر کھایا۔ خوشی ہوئی کہ سیاسی اور علمی دونوں معاملات میں قدرے آزاد خیال ہیں۔ سترھویں صدی کے انگریزی ادب پر کام کررہے ہیں۔ لیکن موجودہ رجحانات سے باخبر ہیں۔ بہت سے سیاسی اور علمی مسائل پر آزادانہ گفتگو ہوئی۔ ہندوستان کی اقتصادی بدحالی، تعلیم کی کمی، مذہبی اور جماعتی اختلافات، زبانوں کی کشمکش کے متعلق میں نے بہت سی باتیں کیں۔ گفتگو جب تنقیدی انداز اختیار کرلیتی تھی تو سوچتا تھا کیا حبِ وطن کا یہ تقاضہ نہیں ہے کہ میں ایک امریکی کے سامنے اپنے ملک کو جنت بناکر پیش کروں!

۲ر اکتوبر جمعرات - فواد یونیورسٹی مصر کے ایک انگریزی پروفیسر دو سال سے یہاں انگریزی ادب پر کام کر رہے ہیں، نام ہے لوئی عیوض - قبطی ہیں جو خود کو آل فرعون کہتے ہیں - اِس سال اُنھیں راک فیلر فاونڈیشن سے بھی مدد ملی ہے مسٹر گل پیٹرک نے مجھ سے ذکر کیا تھا، کل رچرڈ لوئس کے ساتھ ان کے جائے قیام پر بھی گیا تھا مگر ملاقات نہیں ہوئی تھی - آج ٹیلیفون سے گیارہ بجے ملنے کا وقت مقرر ہوا، میں اور مسٹر رچرڈ لوئس گیارہ بجے پہونچے - بڑی باتیں کرتے ہیں اور بہت گھبرائے ہوئے انداز میں مصر، یورپ، امریکہ، ہندوستان، پاکستان سب کی سیاست بحث مباحثہ میں آئی - ادبی باتیں کم ہوئیں - سوال پوچھتے ہیں اور جواب سُننے سے قبل پھر گفتگو شروع کر دیتے ہیں - انگریزی ادب پر اچھی نظر ہے - عام طور سے مصر کے قبطی دولت مند ہیں، ان کے پاس بھی کافی دولت معلوم ہوتی ہے - انگریزی ادب کا نایاب ذخیرہ جمع کر لیا ہے - کار ہے اور یہاں دوسرا سال گذار رہے ہیں - جنرل نجیب کے طاقت حاصل کرنے کو اچھا سمجھتے ہیں لیکن نجیب جو وفد پارٹی کو کچلنا چاہتا ہے اُس کے مخالف ہیں - باتوں سے انگریز دشمنی کا پتہ چلتا ہے - دو بجے ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا کیونکہ رچرڈ لوئس کو ایک اور کام تھا -

دو بجے میں پھر مسٹر عیوض کے یہاں پہونچ گیا - کہنے لگے چلئے آپ کو یونیورسٹی اور پرنسٹن شہر دکھا لاؤں - کار میں بیٹھ کر تقریباً دو گھنٹے اِدھر اُدھر گھومتے رہے، کار اُن کی فرانسیسی بیوی چلا رہی تھیں - یہاں غیر شادی شدہ لوگوں کے رہنے کے ہوسٹل الگ، وہ شادی شدہ جن کے بچے نہ ہوں

اُن کے لئے الگ اور شادی شدہ بچّے والوں کے لئے الگ بنے ہوئے ہیں۔
کھیل کا میدان اور اُس کا اسٹیڈیم دیکھا، بہت خوبصورت اور بڑا ہے۔ یونانی
کالوشیم کے انداز پر بنایا گیا ہے۔ تقریباً پچاس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ
ہے۔ کارنیگی فاؤنڈیشن نے طلبار کی کشتی رانی اور تفریح کے لئے ایک مصنوعی
جھیل اور نہر بنوادی ہے، نہایت تفریح کی جگہ ہے۔ جھیل کافی بڑی ہے۔
خزاں کی ابتدا ہو جانے کی وجہ سے ہوا تیز تھی، سوکھی ہوئی پتّیاں ہوا میں اُڑ رہی
تھیں مگر پھر بھی منظر میں شادابی تھی۔ نیویارک سے نکل کر یہاں عجیب طرح کا سکون
میسّر ہوا۔ کئی میل کے چکّر میں میں نے مصری ادب کے جدید رجحانات کے متعلق
بعض باتیں پوچھیں۔

چار بجے کے قریب جب واپس آئے تو میں نے پروفیسر فلپ ہٹی سے
ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ساڑھے چار بجے اُن کے کمرے میں داخل ہوئے۔
کتابوں میں گھرے ہوئے اپنے علمی کاموں میں مصروف تھے۔ مصری پروفیسر
سے عربی میں باتیں کرنے لگے اور مجھ سے پوچھا کیا آپ عربی جانتے ہیں، میں نے
کہا کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ برائے نام جانتا ہوں۔ میں نے تصانیف کے
متعلق دریافت کیا تو اپنی ضخیم تصنیف تاریخِ شام، لبنان و فلسطین دکھائی۔
یہ کتاب ابھی آخر ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ تاریخ عرب کے ترجمے کے متعلق
کہا کہ پہلے ایک صاحب نے لاہور سے اجازت مانگی، میں نے دے دی، پھر
جب انھوں نے کوئی خبر نہیں لی تو میں نے انجمن ترقی اُردو پاکستان کو اجازت
دے دی۔ مگر جب انھیں معلوم ہوا کہ لاہور کے ایک اور صاحب (غالباً شریف پنّی

نام ہے) ترجمہ تقریباً مکمل کر چکے ہیں تو انھوں نے انکار کر دیا، موصوف نے خواہش ظاہر کی دونوں مل کر ایک ہی ترجمہ تیار کرلیں مگر یہ نہ ہو سکا۔ اب پروفیسر ہٹی چاہتے ہیں کہ میں شریف بنّی صاحب کے ترجمہ پر نظر ثانی کر دوں۔ میں نے وقت کی تنگی کا عذر کیا لیکن پھر بھی وہ مُصر ہیں۔ ممکن ہے وہ چند صفحات اُن سے منگا کر مجھے دکھائیں۔ تاریخ عرب کے مختصر اڈیشن کا ترجمہ امریکی سفارت خانہ کراچی کرا رہا ہے۔ موصوف نے ازراہ شفقت مجھے اپنے کچھ مضامین دئے جو امریکی انسائیکلو پیڈیا کے لئے لکھے تھے۔ لائبریری، لکچر اور سمنار کے کمرے دکھائے اور کافی سے تواضع کی۔ موصوف سے اسلامی ممالک کی موجودہ سیاست پر بھی کافی باتیں ہوئیں۔ اُن کا خیال ہے کہ مسلمان ایک روحانی بحران میں مُبتلا ہیں، میں موصوف سے متفق نہ ہو سکا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق اور ہندوستان میں اسلامی علوم کی تعلیم کے متعلق بھی دریافت کرتے رہے۔

ابھی وہیں بیٹھے تھے کہ تیز ہوا چلنے لگی، بادل گھر آئے اور چمک گرج کے ساتھ سخت بارش شروع ہو گئی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں اُسی حالت میں اپنے ہوٹل پہونچ گیا۔

۳۱ اکتوبر جمعہ — اس وقت فلاڈلفیا کے ایک ہوٹل میں ہوں۔ پرسوں جب پرنسٹن کے ہوٹل میں قیام پذیر تھا تو اس کے منیجر نے کہا تھا کہ فی الحال ہم صرف دو دِن کے لئے جگہ دے سکتے ہیں جمعہ کو پھر دریافت کر لیجئے گا۔ دس بجے کے قریب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ بس اب جگہ نہیں ہے۔ سارے کمرے دو دن کے لئے پہلے ہی سے ریزرو ہیں کیوں کہ فٹ بال کا میچ ہونے والا ہے۔

پرنسٹن یونیورسٹی فٹ بال میں بہت اچھی سمجھی جاتی ہے۔ جب میچ ہوتا ہے تو دُور دُور سے لوگ دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ دو اور ہوٹلوں کا پتہ پوچھ کر وہاں گیا وہاں بھی یہی بات تھی۔ میرا خیال تھا کہ اتوار تک یہاں رکوں گا اور دوشنبہ کو فلاڈلفیا کی پن سلوینیا یونیورسٹی پہونچ جاؤں گا۔ لیکن اب پروگرام بدلنا پڑا۔ مصری پروفیسر سے اتوار کو ساتھ کھانے کا وعدہ تھا اُن سے معذرت کی اور مسٹر رچرڈ لوئیس کو اپنے نئے پروگرام سے مطلع کیا۔ پرنسٹن میں ایک ضروری پروگرام اور تھا اور وہ یونیورسٹی پریس کے منیجر مسٹر اسمتھ سے ملنا، وقت دو بجے تھا۔ اس لئے میں نے طے کیا کہ ساڑھے چار بجے کی ٹرین سے فلاڈلفیا چلا جاؤں گا۔

دُو بجے مسٹر اسمتھ سے ملاقات ہوئی۔ پریس اور کتابوں کی اشاعت کے کام سے بہت باخبر ہیں ہندوستان کے متعلق لکھی ہوئی کتابوں کے امریکہ میں شائع ہونے کے متعلق تجویزیں زیر غور ہیں امید ہے کہ وہ علمی کتابوں کی اشاعت میں مدد دے سکیں گے۔ چلتے وقت موصوف نے مجھے پرنسٹن یونیورسٹی پریس کی چھپی ہوئی کتاب LIRAN, PAST AND PRESENT یادگار کے طور پر دی۔ پرنسٹن میں انگریزی کے مشہور علماء، اڈمنڈ ولسن اور بلیک مور سے ملنے کا جذبہ لے کر آیا تھا لیکن دو حضرات میں سے کوئی بھی موجود نہیں، ولسن کسی اور یونیورسٹی میں چلے گئے اور بلیک مور ہفتہ بھر کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔

چار بجے اسٹیشن پہونچا اور چھ بجے کے قریب فلاڈلفیا۔ اسباب اسٹیشن پر چھوڑ کر ہوٹل کی تلاش میں نکلا، جو پہلا ہوٹل ملا اُسی میں چلا آیا ہوں۔ کچھ اُجڑا اُجڑا سا نظر آتا ہے اگر جی نہ لگا تو کل پرسوں تک تلاش کر کے کوئی دوسرا بدل دوں گا۔

ہاں اسٹیشن پر اسباب رکھنے کے متعلق بھی دو جملے لکھ دوں۔ اسٹیشنوں پر چھوٹی بڑی الماریاں ہوتی ہیں، اُن میں کُنجی لگی ہوتی ہے، چھوٹے اور بڑے دو قسم کے خانے ہوتے ہیں آپ کو جیسی ضرورت ہو اُس کے مطابق ایک یا دو خانے منتخب کر لیجئے اسباب اُس کے اندر رکھئے، چوبیس گھنٹے کے لئے کرایہ کی رقم ڈالئے اور الماری بند کر کے کُنجی اپنے پاس رکھ لیجئے۔ لکھا ہوتا ہے کہ کوئی ذمّہ دار نہیں ہے لیکن سُنا ہے کہ چیزیں عام طور سے محفوظ رہتی ہیں۔

۴ر اکتوبر سنیچر۔ رات جب نیند نہیں آ رہی تھی تو خیالات آوارہ گردی کر رہے تھے۔ میں اپنے موجودہ مشغلے کے متعلق سوچنے لگا۔ نہ جانے کیوں احساس ہے کہ اس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ بغیر بڑے واضح مقصد کے پھرنے سے کچھ زیادہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ موجودہ بین الاقوامی حالات میں یہ سوچنا کہ ہندوستان اور امریکہ میں کوئی گہرا ادبی اور تہذیبی رشتہ مخلصانہ بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے، میرے خیال میں غلط ہے۔ ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا ایسی سیّال حالت میں ہے کہ گہرے عوامی رابطہ کے بغیر دو قوموں کی اُوپری دوستی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ویسے میری خواہش تو یہی ہے کہ ساری دُنیا کے عوام مخلصانہ بنیاد پر ایک دوسرے کی تہذیب، زندگی اور ادب سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ لیکن اس کے لئے جس فضا کی ضرورت ہے وہ موجود نہیں ہے۔ پھر بھی چونکہ مجھے امریکہ آنے اور یہاں لوگوں سے ملنے کا موقع مل گیا اِس لئے اِس وقت زیادہ تر اسی کے متعلق سوچتا ہوں۔

صبح نَو بجے کے قریب فلاڈلفیا کی سڑکوں پر تھا، ہَوا میں خنکی اور تیزی تھی

ایک اجنبی سیاح کے چھٹویں حس سے کام لیتا، عمارتوں سے اندازہ لگاتا ہوا یونیورسٹی پہونچ گیا۔ آج سینیچر ہونے کی وجہ سے سناٹا سا تھا۔ گھومتا پھرتا میں یونیورسٹی کے میوزیم میں پہونچ گیا۔ مصر، ایران، بابل، کالڈیا، فلسطین، اٹلی اور امریکہ کے قدیم نوادر کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ ہمارے یہاں کی یونیورسٹیوں کے پاس تو کیا، قومی اداروں کے پاس بھی ایسا کوئی ذخیرہ نہ ہوگا۔ چیزوں کو ایسی خوبصورتی اور احتیاط سے رکھتے ہیں کہ دیکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ آج یہاں بھی فٹ بال کا میچ ہے، مجمع کی انتہا نہیں، جوش کی انتہا نہیں، اخبارات کے خاص نمبر بک رہے ہیں، لوگ دُور دُور سے آرہے ہیں ابھی چار گھنٹے باقی ہیں لیکن فرینکلن فیلڈ پر پولیس انتظام کر رہی ہے۔ اسٹیڈیم پر یونیورسٹی کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ کل پرنسٹن میں بھی دیکھا تھا اور آج یہاں بھی اعلان ہو رہا ہے کہ آئزن ہاور کی حمایت میں جلسہ ہوگا۔ اخباروں میں دلچسپ خبریں چھپتی ہیں، تقریریں بعض اوقات ذاتیات کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔

روس نے امریکہ سے کہا ہے کہ اپنے سفیر متعینہ روس کو واپس بُلا لے، وہ روس کا دشمن ہے، دیکھئے بین الاقوامی سیاست کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ استالین کے اس بیان پر بھی کافی غور کیا جا رہا ہے کہ سرمایہ دار ملکوں کا اندرونی تضاد، سرمایہ دار اور اشتراکی مُلکوں کے تضاد کے مقابلہ میں جنگ کے لئے زیادہ مواقع فراہم کر رہا ہے۔ یہاں کے اخباروں میں اس پر بڑی حاشیہ آرائیاں ہو رہی ہیں۔

۵ را کتوبر اتوار۔ طبیعت سُست اور تھکی تھکی سی رہی کیا ایسے سفر میں

تمام لوگ میری ہی طرح اُداس رہتے ہیں ؟ اپنے دل کی دھڑکن بھی اچھی نہیں معلوم ہوتی - کیا ڈھونڈھتی ہے ؟ بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا رہا - یونیورسٹی کی بعض عمارتوں سے واقفیت حاصل کی ، کل کچھ لوگوں سے ملنے کی کوشش کروں گا - غالباً اتوار نے فلاڈلفیا کی بے رونقی میں اور اضافہ کیا ہے ورنہ یہ امریکہ کا بہت بڑا شہر ہے - آج سرراہ اُڑیسہ کے ایک طالب علم سے ملاقات ہوگئی - معلوم ہوا کہ یہاں ہندوستانی پچیس تیس ہیں ، کچھ سے تو ضرور ہی ملاقات ہوگی - نیویارک کے بعد یہ شہر بے رونق معلوم ہوتا ہے - اس میں پرنسٹن کی سادگی اور قدامت بھی نہیں ہے - نیویارک میں ٹریموے نہیں چلتی یہاں چلتی ہے - آج عجیب موڈ رہا پڑھنے لکھنے میں بھی جی نہیں لگا - یوں بھی جب سے آیا ہوں کم لکھ پڑھ رہا ہوں - پاسپورٹ الٹ پلٹ رہا تھا کہ امریکہ کے ویزا پر نظر پڑی تو اُس میں تھا کہ IMMIGRATION & NATURALIZATON کے کمشنر کو اپنے قیام کی اطلاع کرنی چاہیئے اور ہر تیسرے مہینے اپنا پتہ لکھ بھیجنا چاہیئے - میں نے ابھی تک اطلاع نہیں دی تھی آج دے دی -

۶ ، اکتوبر دوشنبہ — جس ہوٹل میں مقیم ہوں یونیورسٹی یہاں سے چند منٹ کے فاصلہ پر ہے ، ناشتہ کے بعد میں نے یونیورسٹی لائبریری کا رُخ کیا - وہاں سے نکلا تو خیال ہوا کہ پروفیسر نارمن براؤن کا پتہ کیوں نہ لگایا جائے - تھوڑی دیر میں ان کا کمرہ ڈھونڈھ نکالا - مسٹر گل پیٹرک نے ٹیلیفون کرکے اُن سے ملنے کا وقت ۷ ، اکتوبر کو مقرر کیا تھا - میں نے آج کا وقت ضائع ہونے سے بچانے کے لئے اطلاع کرائی اور ملاقات ہوگئی - پروفیسر براؤن اس یونیورسٹی میں سنسکرت کے

پروفیسر اور جنوبی ایشیائی ممالک کے متعلق علوم اور تحقیقات کے شعبہ کے چیرمین ہیں۔
یہ شعبہ یہاں کم و بیش ستر سال سے قائم ہے۔ یونیورسٹی کے لوگوں سے ملنے کے بعد
مجھے اس بات کا یقین ہو چلا ہے کہ یہاں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو محض علم کی خاطر
ہندوستان کی زندگی، ادب اور تہذیب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا مطالعہ
یہاں کی سیاسی جماعتوں اور سرمایہ داروں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنے کا
موقع دیتا ہے اِس میں بھی شک نہیں۔ اِس شعبہ کی لائبریری بہت بڑی نہیں ہے
لیکن پھر بھی کام کی کتابیں موجود ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے اخبارات آتے
ہیں اُن میں کمیونسٹ اخبارات بھی دیکھ کر یک گونہ حیرت ہوئی۔ پروفیسر براؤن
سے آج زیادہ تر ہندوستان کے ادبی کارناموں کے امریکہ میں شائع کئے جانے
کے اِمکانات کے متعلق باتیں ہوئیں۔ اُردو ٹائپ کے متعلق بھی گفتگو ہوئی وہ
اس کے حامی ہیں، ان کے شعبہ کے اور پروفیسروں سے بھی ملاقات ہوئی اور
ابھی پھر ہوگی۔ ہندوستانی، پشتو، فارسی، دراوڑی، سنگھالی، بنگالی پڑھانے
کا انتظام ان کے یہاں ہے۔ اُردو کا الگ بھی انتظام کرنا چاہتے ہیں لیکن
روپیہ نہیں ہے۔ کل دس بجے پھر ملنے کا وعدہ ہے۔

آج اخباروں سے اندازہ ہوا کہ امریکہ اور روس کے درمیان کشاکش بڑھتی
جاتی ہے۔ ماسکو میں پارٹی کانگریس نے اور پکنگ میں ایشیائی امن کانفرنس نے
امریکہ پر امن دشمنی کے الزامات لگائے ہیں۔ اُس کا اثر یہاں صدر کے
الکشن پر پڑ سکتا ہے۔

لائبریری میں بیٹھے بیٹھے روزنگر کی کتاب INDIA AND USA کے

اہم حصے پڑھے، کتاب غور و فکر کا نتیجہ ہے، اُس نے امریکہ کو آگاہ کیا ہے کہ ہندوستان جس حال میں ہے اُس سے اس بات کی امید رکھنا کہ وہ کھُلم کھُلا مغرب کا ساتھ دے گا، غلطی ہے۔ اُسے چین کی کمیونسٹ حکومت کے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔

۱۷ اکتوبر منگل ۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ دل سے نہ جانے کیا کیا باتیں ہوتی رہیں۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ دس بجے میں پروفیسر نارمن براؤن کے کمرے میں پہونچ گیا وہاں انھوں نے لندن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کی ڈاکٹر ڈوروتھی اسٹیڈ نے ملایا، وہ پالی اور سنسکرت پڑھاتی ہیں۔ آج تین بجے ایک سیمنار میں بدھ مت کے بعض پہلوؤں پر اُن کی تقریر بھی ہوئی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اُس سے جو ایک سوال پیدا ہوا وہ دلچسپ ہے۔ کیا اشوک کے زمانے میں ذات پات کی شکل وہی تھی جو منوسمرتی میں پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر براؤن کا خیال ہے کہ ایسا نہیں تھا، ایک ذات سے دوسرے میں جانے کے واقعات ملتے ہیں اور بہار میں برہمنوں اور آریوں کا اثر بھی مکمل طور پر نہیں پھیلا تھا۔ بہرحال یہ دلچسپ مسئلہ ہے جس کے متعلق میری معلومات کم ہیں۔ اس سے پہلے دس بجے بھی ایک سیمنار تھا میں نے اس میں بھی شرکت کی جرمنی کے ڈاکٹر ANTHUS نے مصر قدیم میں تاریخی مواد پر لکچر دیا، اس پر کافی بحث ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ مشرقیات کے مختلف شعبوں کے پروفیسر اپنے خاص موضوع کے علاوہ بھی کافی پڑھتے ہیں۔ بحث کا معیار بھی اونچا تھا۔ اس کے بعد قریب ہی کے ایک ریسٹراں میں سب لنچ کھانے گئے۔ وہاں بھی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ جرمن پروفیسر کو امریکہ بے حد پسند آگیا ہے اب وہ یہیں رہنا چاہتے ہیں

اصرار کے باوجود میرے اور ڈاکٹر ڈوروتھی اسٹیڈ کے کھانے کے دام پروفیسر براؤن
نے ادا کئے۔ وہاں سے پروفیسر براؤن اپنے ساتھ لئے ہوئے لائبریری گئے وہاں
خاص کر سنسکرت کا شعبہ دکھلاتے رہے۔ میں نے سنسکرت کی بہت سی لائبریریاں
نہیں دیکھی ہیں اسلئے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن سنسکرت کے علاوہ ہندوستان قدیم کے
متعلق یہاں مجھے زبردست ذخیرہ نظر آیا پروفیسر براؤن نے یہ بھی بتایا کہ اس لائبریری
میں پندرہ ہزار سنسکرت مخطوطات موجود ہیں۔ واللہ اعلم! لائبریری کی عمارت
ناکافی ہے اور نئی بننے والی ہے۔ ڈاکٹر براؤن نے کہا کہ ہماری یونیورسٹی غریب
ہے۔ مطلب یہ تھا کہ دوسری یونیورسٹیوں کے اتنی دولت ہمارے پاس نہیں ہے۔ یہی
بات وہ اُردو اور ہندی کی اعلیٰ تعلیم شروع کرنے کے متعلق بھی کہہ رہے تھے کہ رقم
ہوتی تو اس کا سلسلہ یہاں جاری کردیتے۔ اس موضوع پر لوگوں سے باتیں کرنے
میں مجھے اِس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ یہاں مختلف زبانوں کی تعلیم کا مقصد زیادہ تر
فوجی اور ڈپلومیٹک ہے۔ ایک آدھ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں سے ملاقات
ہوئی۔ مدراس یونیورسٹی کے جغرافیہ کے ایک مدراسی پروفیسر یہاں آئے ہوئے ہیں،
اُن سے باتیں کیں تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ ہمیشہ سے یہیں ہیں اور ہمیشہ یہیں
رہیں گے حالانکہ انھیں آئے ہوئے ابھی چند ہی مہینے ہوئے ہیں اور ایک میں ہوں
کہ شاید سالہا سال یہاں رہوں تو گفتگو میں اس بات کا احساس نہ ہونے دوں۔

۸ر اکتوبر بدھ — دن یونہی گذر گیا کچھ دیر شہر میں، کچھ دیر لائبریری میں۔
نہ شہر میں کوئی خاص چیز دیکھنا مد نظر تھا نہ لائبریری میں، کچھ اُلٹا سیدھا پڑھا
کچھ خط لکھے۔

۹ ر اکتوبر جمعرات - دن بھر موسم دھندلا رہا، ہوا بھی تیز اور ٹھنڈی تھی، کبھی کبھی بوندیں بھی پڑ جاتی تھیں غالباً جاڑوں میں عام طور سے یہی حالت رہے گی۔ صبح دس بجے پروفیسر براؤن سے پھر ملا۔ کتابوں کی اشاعت کے علاوہ آج زیادہ تر گفتگو رسم خط کے متعلق ہوتی رہی۔ وہ رومن رسم خط کو بہتر سمجھتے ہیں لیکن یہ بھی خیال ہے کہ اس وقت ہندوستان اِسے قبول نہیں کر سکتا۔ ہندی رسم خط میں اِصلاح کی جو تجویزیں ہیں ان کی رپورٹیں ان کے پاس موجود ہیں، زیادہ تر اصلاحات سے متفق نہیں۔ اُن کا بھی خیال ہے اگر ہندوستان میں ایک گروہ اُردو رسم خط چاہتا ہے تو اُسے باقی رکھنا چاہیئے۔ کل اُردو ٹائپ کے متعلق باتیں کرنے کا ارادہ ہے، آج اُنھیں کسی اور سے ملنا تھا۔

وہاں سے میں شعبۂ جنوبی ایشیا کی لائبریری میں چلا گیا۔ ڈاکٹر لیمبرٹ سے دیر تک گفتگو ہوئی، وہ ہندو مسلم فسادات کے مسئلہ پر عمرانی نقطۂ نظر سے تحقیقات کر رہے ہیں، میں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے متعلق کافی مطالعہ کیا ہے لیکن نقطۂ نظر ہمدردانہ نہیں ہے۔ انھیں کے ساتھ میں اُن کے گریجویٹ سیمنار کلاس میں چلا گیا۔ زیر بحث مسئلہ تھا قومیت کا تصوّر اور خاص کر ہندوستانی زندگی میں قومیت کا تصوّر۔ طلباء کافی تیار ہو کر آئے تھے، بحث اچھی اور مفید ہوئی ڈاکٹر لیمبرٹ نے واضح اور سُلجھے ہوئے انداز میں مسئلہ کی وضاحت کی۔ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر فربر نے بھی اپنے خیالات ظاہر کئے۔ مجھے بہت سی باتوں سے اختلاف تھا لیکن میں نے بحث میں حصہ نہیں لیا، بعض ہندوستانی طالب علموں نے خیالات ظاہر کئے۔

لیکن وہ ہند و مذہب کی وحدت اور اُس سے پیدا ہونے والے قومی تصوّر کے آگے نہ بڑھ سکے۔ کسی نے بھی اُن معاشی اور اقتصادی مسائل کی طرف اشارہ نہیں کیا جس سے برطانوی اِستحصال کے دَور میں قومی شعور پیدا ہوا تھا۔ بہرحال سیمنار دلچسپ تھا۔ موقع ملا تو ڈاکٹر لیمبرٹ سے اس کے متعلق الگ سے باتیں کروں گا۔

پن سلوینیا یونیورسٹی کے طلبا، دو ہفتہ وار نکالتے ہیں۔ آج دونوں دیکھے۔ ایک اخبار آئزن ہاور کی حمایت کر رہا ہے دوسرا اسٹیونسن کی۔ زیادہ تر یونیورسٹیوں میں یہ کشمکش جاری ہے۔ جو لوگ آئزن ہاور کے موافق ہیں ان کی ایک سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ڈیماکریٹک پارٹی جو بیس[۲۴] سال سے برسرِ اقتدار ہے اب تبدیلی ضروری ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ یونیورسٹیوں ہی سے آزادیٔ رائے اور ضمیر کی دبی دبی سی آوازیں بھی بلند ہو رہی ہیں۔ کولمبیا، ہارورڈ اور پن سلوینیا کے بہت سے پروفیسروں نے موجودہ صورتِ حال سے بیزاری کا اظہار کیا ہے کہ حکومت کا ایک شعبہ لوگوں کے ذاتی خیالات کی چھان بین کر رہا ہے۔

امریکہ میں ایک طرح کی مذہبی زندگی بھی جنم لے رہی ہے اور اُس کا پتہ روزانہ بہت سی ایسی کتابوں کے شائع ہونے سے چلتا ہے مگر اِدھر ایک بہت ہی تاریخی بات بھی ہوئی ہے، انجیل مقدس جدید انگریزی میں شائع کی گئی ہے اور عام طور پر اُس کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ انجیل کا انگریزی ترجمہ ۱۶۱۱ء میں شاہ برطانیہ جمیس اوّل کے عہد میں ہوا تھا۔ وہ انگریزی اب بہت بدل چکی ہے۔ یہ نیا ترجمہ اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہاں کے کلیسا میں عام طور پر کیا رائے قائم کی جا رہی ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ پروٹسٹنٹ عام طور سے

مخالف نہیں ہیں - یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ امریکہ کا کلیسا یہاں کا بہت ہی دولت مند ادارہ ہے - آج چند ہندوستانیوں سے بھی ملاقات ہوئی -

۱۰ اکتوبر جمعہ — ڈاکٹر نارمن براؤن سے گیارہ بجے ملاقات ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹہ تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں - انھوں نے اپنے دو غیر شائع شدہ مضامین، جن میں ہندوستان، پاکستان اور سیلون کی لسانی گتھیوں اور رسم خط کی اصلاحات سے بحث کی گئی تھی مجھے پڑھنے کو دیئے - اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف باخبر ہیں بلکہ بچے تُلے خیالات بھی رکھتے ہیں - اُن کے یہ اور ایسے ہی بہت سے مضامین، جن کے ذریعہ سے امریکہ کو جنوبی ایشیا کے غیر سیاسی مسائل سے واقف بنانے کی کوشش کی گئی ہے - شکاگو یونیورسٹی سے جلد ہی شائع ہو رہے ہیں - میں نے آج اُن کو ہندوستان میں اردو کے مسئلہ سے اچھی طرح باخبر کر دیا ہے - خیال ہوا کہ اور لوگوں سے تو باتیں ہوتی ہی رہیں گی، پروفیسر براؤن یہاں اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم سمجھے جاتے ہیں، ان سے یہ باتیں بتا دینا ضروری ہے، چنانچہ میں نے نہایت تفصیل سے اُن سے باتیں کیں اور کہا کہ آپ کے سے باخبر شخص سے یہ باتیں میں اس لئے کر رہا ہوں کہ جب آپ یا آپ کے حلقۂ اثر کے لوگ اُردو زبان کے مسئلہ پر غور کریں یا ہندوستان کی لسانی گتھی کا حل تلاش کریں تو یہ نہ بھول جائیں کہ اُردو کا مولد و منشا ہندوستان ہی ہے اور اب بھی اُردو وہاں اہم ترین ادبی اور تہذیبی خدمت انجام دے رہی ہے -

موسم بہت دُھندھا دُھندھا سا ہے - کمرے کے اندر گرمی اور اُلجھن، باہر ٹھنڈی ہوا اور بوندیں - خزاں شروع ہو چکی ہے، درخت اپنا سبز لباس اُتار کر

پھینک رہے ہیں۔

کل واشنگٹن روانہ ہو جاؤں گا۔ پھر ایک نئی جگہ پہونچنے اور قیام کرنے کی اُلجھن۔

۱۱؍ اکتوبر، سینچر۔ صبح جب فلاڈلفیا سے چلنے لگا تو میں نے ہوٹل کے منیجر کو احتیاطاً اپنا پتہ دیا کہ اگر کوئی خط وغیرہ میرے نام آئے تو بھیج دیں گے۔ میں نے نیویارک راک فیلر آفس کو خط لکھا تھا کہ میں فلاڈلفیا میں ایک ہفتہ رہوں گا اگر کوئی خط آئے تو بھیج دیا جائے، تعجب تھا کیا کوئی خط نہیں آیا؟ منیجر نے جو میرا پتہ دیکھا تو بہت معذرت کی کہ میں نے آپ کے دو خط کل ڈاکخانہ کو واپس کر دئے کیونکہ مجھے آپ کا نام غلط یاد تھا۔ بڑا دُکھ پہونچا۔ ڈاک کے معاملہ میں مجھے ہمیشہ یہ خلش رہی ہے کہ میرے خط مجھے ضرور مل جایا کریں چاہے اُن میں کچھ نہ ہو۔ اُس نے ڈاکخانہ کو ٹیلیفون کیا، وہاں کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کہہ تو آیا ہوں کہ پھر خبر لیجئے گا شاید پتہ چل جائے مگر کیا امید ہو سکتی ہے۔ کئی دن سے گھر کے خط کا انتظار تھا!

ذہن پر یہ بوجھ لئے ہوئے اسٹیشن پہونچا۔ گاڑی لیٹ تھی، بہرحال دو بجے امریکہ کے دارالسلطنت واشنگٹن میں داخل ہوا۔ اسباب اسٹیشن پر چھوڑا، کھانا کھایا اور واشنگٹن کے متعلق ایک کتابچہ خرید کر وہاں کا جغرافیہ سمجھنے کی کوشش کی۔ اسٹیشن بالکل مرکز میں ہے اور خوبصورت ہے۔ باہر نکلا تو بارش ہو کر ختم ہو چکی تھی لیکن ہوا میں تیزی اور خنکی تھی۔ میں نقشہ کے سہارے چل کھڑا ہوا اور ڈھائی گھنٹہ تک پھرتا رہا۔ بہت سی عمارتیں دیکھ ڈالیں، کانگریس لائبریری کی بھی محض جھلک دیکھی اُسے اطمینان سے دیکھوں گا۔ واشنگٹن کا پہلا اثر یہ ہے کہ اِس شہر سے امریکہ کی عظمت کا

پتہ چلتا ہے یہاں کے ماحول میں آزادی اور وقار کی جھلک ملتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شہر کی جڑیں گہری ہیں۔ یہ نیویارک سے بہت مختلف ہے، یہاں عمارتیں نہ ایک دوسرے کو دبائے کھڑی ہیں نہ انسان کو۔ درختوں، پارکوں، فواروں، مجسموں، تصویرخانوں خوبصورت عمارتوں سے یہ شہر بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

چلتے چلتے تھک گیا تو رات بسر کرنے کا خیال آیا۔ پہلے اوسط درجے کے ہوٹل دیکھے کسی میں جگہ نہیں، پھر بڑے دیکھے کسی میں جگہ نہیں، سات بج رہے تھے، اسباب اسٹیشن پر تھا اور میں سڑکوں پر۔ خدا خدا کر کے ایک ہوٹل میں جگہ مل گئی، بالکل اسٹیشن اور ڈاکخانہ کے قریب ہے جیسا ہے اُس کے لحاظ سے مہنگا ہے۔ خیر کمرہ تو ہے، پھر دیکھا جائے گا۔

۱۲؍اکتوبر اتوار — موسم کل سے بہتر تھا۔ ہوٹل سے نکلا ڈاکخانہ گیا، پھر ریلوے اسٹیشن۔ کچھ دیر اخبار دیکھتا رہا۔ باہر نکلا تو کولمبس کے مُجسّمہ اور یادگار کے قریب مجمع تھا، معلوم ہوا کہ یوم کولمبس منایا جا رہا ہے، میں بھی کچھ دیر اِس مجمع میں شامل رہا، تھوڑے ہی سے لوگ تھے، مجھے اپنا ہندوستان یاد آگیا!

دو بجے لائبریری پہونچا، آج ذرا اندر تک داخل ہوا، خدا کی پناہ! کیسی خوبصورت، شاندار اور وسیع عمارت ہے، کیسے مجسّمے اور چھتیں ہیں، دیواروں پہ کیسی تصویریں ہیں! چپّہ چپّہ سے علم کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں، ایک طرف ترکی کے علوم و فنون، کتابوں اور تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے تو دوسری طرف انجیلِ مقدس کے ہزارہا نسخوں کی۔ دو نسخے حیرت خیز دیکھے، ایک تو چھاپے کے موجد گٹن برگ کا چھاپا ہوا تھا، دوسرا ٹھیک اُسی زمانہ کا قلمی مصوّر نسخہ،

دونوں نادر چیزیں ہیں۔ ایک طرف امریکہ کے صدروں کے خطوط وغیرہ کی نمائش ہو رہی ہے اور دوسری طرف امریکہ کے اعلان آزادی کے اصل قلمی دستاویز کی! کوئی شخص ایک مہینہ میں بھی دیواروں کی تصویروں، کتبوں، مجسموں اور تمام ضروری چیزوں کو پوری طرح نہیں دیکھ سکتا۔ اس لائبریری میں چھیاسی لاکھ سے زیادہ چھپی ہوئی کتابیں ہیں، اس میں رسائل اور اخبارات شامل نہیں ہیں، اُن کی تو کوئی انتہا نہیں ہے۔ مختلف زبانوں اور مختلف قسم کے ایک کرور دس لاکھ قلمی نسخے ہیں۔ تصاویر، نقشوں، ریکارڈوں وغیرہ کی کوئی گنتی نہیں۔ یہ لائبریری دنیا کی سب سے بڑی لائبریری کہی جاتی ہے۔ سنہ ۱۸۰۰ء سے قائم ہے لیکن درمیان میں کئی دفعہ تباہ بھی ہو چکی ہے۔ موجودہ عمارت کی تکمیل سنہ ۱۸۹۷ء میں ہوئی اور اب یہ بالکل ناکافی ہے۔ اس لئے اس کے قریب ہی ایک بہت ہی خوبصورت اور وسیع عمارت سنہ ۱۹۳۸ء میں اور بنا دی گئی ہے، یہ عمارت سادہ لیکن باوقار ہے۔ اصل عمارت میں تین درجے ہیں اور اوپر سبز رنگ کا گنبد ہے، جس کے نیچے ریڈنگ رُوم اور کیٹیلاگ روم ہیں دیواروں میں ہر جگہ یونانی اور رومن وضع کی تصویریں اور مجسمے ہیں اور عمارت پر بھی اطالوی نشاۃ ثانیہ کا اثر ہے پہلی منزل سے دوسری منزل پر جاتے ہوئے پچی کاری کے کام میں علم کی یونانی دیوی منروا کی بہت بڑی تصویر ملتی ہے، اُس کے مجسمے تو نہ جانے کتنے ہیں۔ فرش پر بھی بہت اچھی ڈزائنیں اور بُروج کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ گنبد کی چھت میں جو تصویریں ہیں انسانوں کے تمدنی ارتقا کی مصوری کرتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لائبریری حیرت خیز ہے۔ میں نے تھوڑا سا وقت ریڈنگ روم میں بھی صرف کیا اور کیٹیلاگ

دیکھتا رہا - ہر ملک کی طرح ہندوستان سے متعلق بھی ایک الگ شعبہ ہے اور بہت بڑا ہے - ابھی میں اُدھر جا بھی نہیں سکا ہوں -

وہاں سے نکل کر دارالحکومت کی اصل عمارت میں آیا - اندر جانے اور سب کچھ دیکھنے کی اجازت ہے - بس اوقات مقرر ہیں یہ بھی بہت بڑی اور بہت ہی عظیم الشان عمارت ہے - قد آدم تصویروں، مجسموں، دیواروں میں کُھٹی ہوئی منقش تصویروں سے یہ عمارت بھی بھری ہوئی ہے، اس کی دیواروں پر بھی کتبے اور تصاویر کی انتہا نہیں ہے، صدر کا کمرہ دیکھنے کے لئے کھلا ہوا تھا بہت ہی شاندار ہے - واشنگٹن کے وقت سے اس وقت تک جس طرح اعلیٰ درجہ کی اور تاریخی چیزیں مہیا کی گئی ہیں اُن کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے وقت اور دلچسپی کی ضرورت ہے اور میرے یہاں دونوں کی کمی ہے - یہاں سے نکل رہا تھا کہ آٹھ دس پاکستانی جوانوں سے ملاقات ہوگئی یہ لوگ امریکہ کے چار نکاتی پروگرام کے ماتحت امریکہ میں مختلف قسم کی ٹکنیکل تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں - یہ حضرات ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق، کشمیر کے متعلق ہندوستان کے رویّہ اور عام حالات کے متعلق بہت سی باتیں پوچھتے رہے اور میں اُنھیں بتاتا رہا ان لوگوں کو جو گھبراہٹ ہے وہ مجھے نہیں ہے -

یہاں سے واشنگٹن مانومنٹ پہونچا - یہ ۵۵۵ فٹ سے بھی اونچا چوکور اور اوپر کی طرف پتلا ہوتا ہوا مینار سادہ مگر بڑا پرعظمت ہے - میں اوپر نہیں گیا - قریب ہی لنکن میموریل ہے، اس کی سادگی اور عظمت میں واقعی لنکن کی روح بسی ہوئی ہے سورج ڈوب رہا تھا اور یہ جگہ دل پر اپنا نقش بٹھا رہی تھی -

جب میں ہوٹل واپس آیا تو سات بج چکے تھے اور جسم کا جوڑ جوڑ تھکن سے چور تھا۔

۱۳ر اکتوبر دوشنبہ — آج کہیں زیادہ گھوم پھر نہیں سکا، محض ہندوستانی سفارت خانہ ہی کے چکر میں رہا۔ شعبہ تعلیم کے انچارج پروفیسر سُندرم سے باتیں ہوئیں، آدمی ہوشیار اور واقف کار معلوم ہوتے ہیں۔ گفتگو کا انداز کسی قدر سرپرستانہ ہے۔ تین سال کے یہاں کے قیام میں انھوں نے یہاں کی یونیورسٹیوں سے اچھا خاصا ربط پیدا کرلیا ہے۔ اُن کی یہ رائے مجھے پسند آئی کہ تمام لوگوں کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کے بجائے چند جگہوں کا انتخاب کرلیا جائے اور وہیں تین تین چار چار ہفتہ رہ کر کچھ کام کیا جائے اور خیالات یکجا کئے جائیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ہندوستان کے اخبارات دیکھے اور ذرا دیر کے لئے تخیل کے پَر لگ گئے۔ نیشنل ہیرلڈ میں لکھنؤ یونیورسٹی کی بھی بعض خبریں ملیں۔ اُردو ہندی اور انگریزی کے متعدد اخبارات میں اُردو کے صرف یہ اخبار آتے ہیں پرتاب اور تیج ع

تو ہی ظالم مجھے بتلا اِسے کیا کہتے ہیں!

یہاں کے اخبارات میں آج بہت سے اعلیٰ پیمانہ کے سائنس دانوں (جن میں البرٹ آئن سٹائن بھی ہے) کا ایک بیان دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اِن لوگوں نے حکومت امریکہ کے موجودہ قوانین پاسپورٹ اور وِیزا کی مذمت کی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے دنیا کے بہت سے سائنس داں امریکہ آنے سے محروم رہے وہ ان قوانین کی تبدیلی کا مطالبہ امریکہ کے اصول آزادی اور جمہوریت کے نام پر کر رہے ہیں۔ کسی دن کا اخبار اِس خبر سے خالی نہیں ہوتا کہ اساتذہ اور دوسرے مُلازمین کمیونسٹ ہونے یا اُس کے متعلق تفتیش اور سوالات کا جواب نہ دینے کے

جرم میں ملازمت سے الگ کئے جا رہے ہیں - کئی جگہ طلباء نے بھی معمولی مظاہرے کئے -

۱۴ اکتوبر منگل — ساڑھے نو بجے لائبریری پہونچا - ہندوستانی سکشن میں مسٹر والٹر مازر اور مسٹر مراری لال ناگر سے ملاقات ہوئی - مسٹر مازر نے لائبریری کی پوری مشین دکھائی - وہ سنسکرت کے طالب علم ہیں اور دن رات لائبریری کے ہندوستانی شعبہ کی ترتیب اور تنظیم میں لگے رہتے ہیں - جس طرح کتابیں نکالی جاتی ہیں، جس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچتی ہیں وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں - سارا کام مشین سے ہوتا ہے اور ہر کتاب پندرہ منٹ کے اندر کوئی کہیں بھی بیٹھا ہو اُسے مل جاتی ہے - کتابیں خاص طرح کے بجلی کے بکسوں میں زمین کے اندر اندر چلتی ہیں - اُردو ہندی کا ذخیرہ چھوٹا ہے مگر بڑھایا جا رہا ہے - ہندوستان کے متعلق البتہ چار لاکھ سے زیادہ کتابیں انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں موجود ہیں - دنیا میں کہیں اتنا بڑا خزانہ ہندوستان کے متعلق شائد ہی ہو - پھر آؤں گا تو کچھ نہ کچھ فائدہ ان کتابوں سے اٹھاؤں گا - مسٹر ناگر بنارس کے رہنے والے ہیں - لائبریری کے متعلق جو امتحانات ہوتے ہیں وہ پاس ہیں - دہلی یونیورسٹی میں تھے، وہاں سے اس لائبریری میں ملازمت مل گئی ہے، بہت خوش ہیں - اپنی بیوی کے ساتھ رہتے ہیں، وہ بھی اس لائبریری میں کام کرتی ہیں، کہتے تھے کہ اُن کی بیوی کی آنکھ بھینگی تھی آپریشن سے ٹھیک ہو گئی - امریکیوں کے اخلاق اور ہندوستان سے دلچسپی کے بہت معترف ہیں -

اُس وقت ہندوستانی شعبہ کے ڈائرکٹر ہوریس پول ہین موجود نہیں تھے۔ تین بجے آنے والے تھے، میں تین بجے پھر لائبریری گیا اور اُن سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں اُنھیں انگریزی میں ہندوستانی زبانوں سے اور ہندوستانی میں انگریزی زبانوں سے ترجمہ کی بے حد فکر ہے۔ شکایت کر رہے تھے کہ ہندوستان میں کتابوں پر تبصرے کرنے والے رسائل نہیں نکلتے، ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون سی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے معیارِ تنقید کے متعلق بھی باتیں ہوئیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ لائبریری کے لئے اُردو کتابوں کی ایک فہرست بنادوں میں نے وعدہ کرلیا ہے۔ اسی لائبریری سے ملی ہوئی فولگر شیکسپیر لائبریری ہے۔ اُس کی نمائش دیکھی۔ مطالعہ کے کمرے میں جانے کے لئے خاص پاس کی ضرورت ہے۔ نمائش میں بہت سی نادر تصاویر، کرسیاں، شیکسپیر کے زمانہ کے تھیٹر کے سامان، شیکسپیر کے پہلے نسخے اور سترھویں صدی کی اور کتابیں دیکھیں۔ اُس لائبریری کا دعویٰ ہے کہ سترھویں صدی کے وسط تک کے انگریزی ادب کا جتنا اور جیسا ذخیرہ اس کے پاس ہے اور کہیں نہیں۔ پن سلوینیا یونیورسٹی میں بھی ایک بڑا کمرہ شیکسپیر ہی کے متعلق کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ فولگر لائبریری کی عمارت سنگ سفید کی ہے، بہت خوبصورت بنی ہوئی ہے۔

۱۵ اکتوبر بُدھ — "ایں! تم یہاں کہاں؟" مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری بیوی سامنے کھڑی ہے۔

"کیا میں نہ آؤں آپ کے پاس؟" "نہیں نہیں ضرور آؤ، اور قریب آؤ"، میں نے یونہی کہا، مجھے کچھ حیرت سی ہے، اور بچے؟" اور بچّے بھی ہنستے مُسکراتے

نمودار ہوگئے۔ میں نے ہاتھ بڑھاکر اپنے چھوٹے بچّے ارشد کو پکڑنا چاہا ہاتھ میز سے ٹکرا گیا —— تو یہ محض خواب تھا، خواب کی حقیقت ہی کیا لیکن خیالات کو پر پرواز عطا کرنے کے لئے یہی کافی ہے۔ جب حقیقتیں دُور ہوں تو انسان خواب ہی دیکھتا ہے!

ساڑھے دس بجے مسٹر مارٹیمر گریوز سے ملنے کا پروگرام تھا، میں وہاں پہونچ گیا۔ مسٹر گریوز یہاں کی سب سے بڑی علمی انجمن امریکن کونسل آف لرنڈ سوسائٹیز کے سکریٹری ہیں۔ یہ کونسل عملاً یونیورسٹیوں سے بھی زیادہ اہم مقام رکھتی ہے۔ امریکہ کی ساری بڑی بڑی سوسائٹیاں، یونیوسٹیوں کے اہم لوگ اس میں شامل ہیں اور تقریباً سبھی فاؤنڈیشن اسے بڑی بڑی رقمیں دیتے ہیں۔ میں تو اس کا کام دیکھ کر حیران رہ گیا۔ رُوسی کتابوں کے ترجمے تمیں شائع ہو چکے، عربی، ترکی اور فارسی کے ہو رہے ہیں، ایران پر ایک معلوماتی کتاب نکلی ہے جو مسٹر گریوز نے مجھے دی، کونسل کا کام سمجھایا اور ہندوستان کے متعلق ابھی تک کچھ نہ کرنے پر افسوس کیا۔ انھوں نے معافی مانگتے ہوئے کہا، "میں ابھی تک سب کچھ امریکہ والوں کو باہر کی دنیا سے روشناس کرانے کے لئے کر رہا ہوں، آپ اپنے ملک کو ہم سے روشناس کرائیے"۔ بہت معقول بزرگ ہیں۔ بہت دیر تک گفتگو رہی، مجھ سے اصرار کیا ہے کہ فورڈ فاؤنڈیشن والوں سے ملوں اور اپنے خیالات اُن کے سامنے رکھوں۔ تعارفی خط بھی دیا ہے مگر میں نہ جانے کیا کیا سوچتا ہوں۔ کیا اس میں پھنستا جاؤں؟ اندازہ یہ ہے کہ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ترکی، ایران، مصر ہر جگہ سے اہم انجمنوں کی طرف سے کتابوں کی فہرست برابر شائع ہوتی ہے، ہندوستان سے کیوں نہیں ہو سکتی میں اسے ہندوستان پہونچ کر عملی جامہ پہنانے کی کوشش کروں گا۔ اسی کے ذریعہ سے

ہمارے علمی کام سے باہر کے لوگ واقف ہو سکتے ہیں۔ اس ضرورت کا شدید احساس ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ ترجمہ کے کام کے لئے فورڈ اور کارنیگی یا راک فیلر سے مدد مل سکتی ہے۔ کس سے مشورہ کروں کہ اس کام میں ہاتھ ڈالنا چاہئے یا نہیں محض میرے طے کر لینے کی تو بات نہیں؟ اس ملاقات سے بہت خوشی ہوئی، ہندوستان میں کام کرنے کے لئے بہت سی باتیں ذہن میں آگئیں، کم سے کم وہاں لوگوں کو بتاؤں گا تو! کچھ ہونا تو مشکل ہی ہے۔

خیال تھا کہ آج کئی قابل دید مقامات دیکھ ڈالوں گا مگر یہ سوچ کر کہ پھر واشنگٹن آنا ہے، ارادہ بدل دیا، تاہم گھومتا پھرتا لنکن میوزیم پہونچ گیا۔ یہ وہ عمارت ہے جس میں لنکن کو گولی ماری گئی تھی۔ اُسے حکومت نے خرید کر میوزیم بنا دیا۔ لنکن کی ساری زندگی تصویروں، اخباروں، سکّوں وغیرہ میں دکھائی گئی ہے، اُس کی بہت سی یادگاریں بھی ہیں۔ پہلے یہ عمارت تھیٹر کی تھی، تھیٹر ہی دیکھتے ہوئے ایک شخص نے گولی ماری، اُس نے بھی وہی باتیں کہیں جو مہاتما گاندھی کے قاتل نے کہی تھیں، مجھے تو دونوں میں مماثلت معلوم ہوتی ہے۔ اُس تھیٹر کا ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ دیکھنے کی جگہ ہے۔ آج اور کہیں نہیں گیا لیٹ کر خیالات جمع کرتا رہا، پروگرام بناتا رہا۔ کچھ باتیں ذہن میں واضح ہو رہی ہیں۔ شام کو یونہی اسٹیشن پر چلا گیا وہاں ڈاکٹر گجرال (لکھنؤ میڈیکل کالج) سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ہمارے ساتھ ہی آنے والے تھے۔ کل پہونچے ہیں۔ ۱۸ ستمبر کو بمبئی میں جہاز پر سوار ہوئے اور اب پہونچے ہیں، کہتے تھے بہت تکلیف ہوئی۔ اچھا ہوا جو میں اس مصیبت سے بچ گیا۔

۱۶ اکتوبر جمعرات ۔ موسم بہت اچھا ہے نہ گرمی نہ سردی، ہوائیں خوشگوار خنکی ہے۔ کچھ وقت لائبریری میں گذرا ڈاکٹر پول ہین سے ترجموں اور کتاب فہرست کے متعلق پھر کچھ باتیں ہوئیں۔ کیا یہ ممکن ہوگا کہ ہندوستان سے شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست برابر شائع ہوا کرے؟ حکومت کی مدد ہو تو شائد ہو سکے۔ مسٹر ناگر اور مسٹر والٹر مارر سے باتیں ہوئیں۔ مجھے چونکہ پھر یہاں آنا ہے (کم سے کم میرا خیال ہے) اس لئے نہ تو میں یہاں کے بہت سے میوزیم دیکھ رہا ہوں اور نہ لائبریری سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ بے سرو پا گھومتا پھرتا ایک آرٹ گیلری (کارکوران آرٹ گیلری) میں پہونچ گیا، قدیم اور جدید بہت سی تصاویر اور مجسمے ہیں، جدید مصوری مجھے پسند نہیں آئی۔ صدر کا مکان وہوائٹ ہاؤس بھی دیکھا، اپنی سفیدی اور سادگی میں خوبصورت اور باوقار معلوم ہوتا ہے۔

واشنگٹن کی شام خوبصورت ہوتی ہے، نگہت تو نہیں لیکن نور کا سیلاب ہر طرف بہتا نظر آتا ہے، خاص عمارتوں اور مجسموں پر تیز روشنی ڈالتے ہیں تاکہ رات میں اُن کا حُسن نمایاں ہو فواروں کے اندر رنگین بلب روشن کر کے منظر کو بے حد حسین اور رنگین بنا دیتے ہیں۔

۱۷ اکتوبر جمعہ ۔ صبح طبیعت نہ جانے کیوں گھبرا رہی تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہے، شائد تنہائی کا احساس شدید ہے جو طرح طرح کے بھیس بدلتا ہے۔ ہوٹل سے نکل کر خوب پھرا اور یہاں کے مشہور بوٹنیکل گارڈن پہونچ گیا میں درختوں اور پودوں سے زیادہ واقف نہیں ہوں پھر بھی دُنیا کے اکثر حصّوں کے عجیب وغریب پودے اور درخت دیکھ کر لُطف سا

آگیا۔ اُن میں زندگی ہو یا نہ ہو حیات بخشی کی صلاحیت ضرور ہے! ہوٹل واپس آکر کئی گھنٹے اخبارات اور رسائل دیکھتا رہا اور تین بجے کے قریب ہندستانی سفارت خانے پہونچا۔ کچھ دیر پروفیسر سندرم سے باتیں ہوئیں۔ اتفاقاً وہیں ڈپلومیٹک بُلو بک دیکھنے کو مل گئی جس میں ہر جگہ کے سفارت خانوں کے عہدہ داروں کے نام دئے ہوتے ہیں۔ پاکستان کے افسروں میں سلمان احمد علی کا نام نظر آیا اور حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ انگلستان میں ہیں ایک جاننے والے عزیز دوست اور ہم زبان کو اتنے قریب پاکر عجیب طرح کی خوشی ہوئی۔ بات کی بات میں اُن کے پاس پہونچ گیا۔ یہاں بھی ہندوستان اور پاکستان کے سفارت خانے پاس ہی پاس ہیں مشترک جاننے والوں میں سے شائد ہی کوئی ایسا ہو جس کا ذکر نہ آیا ہو۔ مرنے والوں کا، جینے والوں کا اور جیتے جی بچھڑ جانے والوں کا۔ اُن کے ساتھ اُن کے ہوٹل پہونچا۔ بیگم سلمان اور سلمان سے دس گیارہ سال کے بعد ملاقات ہوئی تھی جی بھر کے باتیں ہوئیں۔ ابھی امریکہ آئے ہوئے اُنھیں کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔ بارہ بجے رات تک وہیں رہا، تنہائی کا بوجھ کم ہوا۔ ایک بجنے کے قریب ہے دیکھوں کب تک نیند آتی ہے۔ کل نیویارک واپس جانا ہے۔

ہاں یہ لکھنا تو بھول ہی گیا کہ کل یہاں کی یونیورسٹی دیکھی۔ کولمبیا، پرنسٹن اور پن سلوینیا کی یونیورسٹیاں دیکھنے کے بعد اس یونیورسٹی نے متاثر نہیں کیا۔ کسی سے ملنا بھی نہیں تھا گھوم پھر کر چلا آیا۔

۱۸ اکتوبر ہفتہ ۔ آج پھر نیویارک میں ہوں اور رُسی وائی ایم سی اے میں، بے ارادہ اور بغیر سوچے ہوئے۔ پرسوں طے کروں گا کہ اب کہاں کہاں جانا چاہئے،

خیال ہے کہ نومبر کے پہلے ہفتہ تک یہیں لوگوں سے ملوں گا اور کچھ لکھوں پڑھوں گا
کل رات کو تھوڑی دیر کے لئے واشنگٹن میں کیسی دنیا بدل گئی تھی! کن لوگوں کے
تذکرے ہوئے، کن موضوعات پر باتیں ہوئیں کیا لکھوں۔ چھ گھنٹے بہت ہوتے
ہیں۔ سلمان اور ان کی بیگم نے کمال کیا کہ اپنے گیارہ اور نو سال کے دونوں
بچوں کو تنہا پڑھنے کے لئے انگلستان بھیج دیا۔ امریکہ سے وہ دونوں ابھی کچھ دن
ہوئے تنہا پانی کے جہاز سے لندن گئے ہیں۔ اُن بچّوں کو بھی آفریں ہے۔

نیویارک ہے اور اُس کی وہی چہل پہل۔ زندگی رواں دواں اور پُرشور ہے۔
سڑکوں، دوکانوں، تفریح گاہوں کی روشنی کے سامنے آسمان اندھیرا معلوم ہوتا
ہے۔ سات بجے شام کے قریب یکایک چونتیسویں سڑک پر (جس پر وائی ایم سی اے
ہے) پولیس بڑی تعداد میں نظر آئے گی، موٹروں اور بسوں کے لئے راستہ رُک گیا،
اچھی خاصی بھیڑ ہوگئی معلوم ہوا کہ امریکہ کے صدر مسٹر ٹرومین اِدھر سے گزریں گے۔
مجھے بھی اشتیاق ہوا کہ دیکھ لوں۔ دس پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد پہلے دو
ڈھائی سو موٹر سائکل سوار پولیس گزری پھر مسٹر ٹرومین کی موٹر کے ساتھ پچیس
تیس موٹریں، مسٹر ٹرومین بار بار ہیٹ اُٹھا اُٹھا کر اِدھر اُدھر گویا سلام کا جواب
دے رہے تھے۔ یہ دلچسپ بات ضرور لکھنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کے تقریباً تمام
اہم اخبار جنرل آئزن ہاور کی موافقت کر رہے ہیں لیکن اِدھر مہینہ بھر میں ٹرومین
اور اسٹی ونسن کی تقریروں اور جنرل پر بے باک حملوں نے انھیں بوکھلا دیا ہے۔
دیکھنا ہے کہ ہوتا کیا ہے۔ انگلستان اور فرانس تو سانس روک کر نتیجہ کا انتظار
کر رہے ہیں۔ سرمایہ دار بڑیس جنرل کے ساتھ ہے مزدور اور کسان، جیسے بھی ہیں

اسٹی وِنسن کا ساتھ دے رہے ہیں۔ زیادہ تر ینگرو بھی اسٹی ونسن ہی کے ساتھ معلوم ہوتے ہیں۔

۱۹ اکتوبر اتوار — آخر کار آج دوپہر کو میں سینما دیکھنے چلا ہی گیا۔ ایک ہی ٹکٹ میں دو تین کھیل دکھانا یہاں کوئی بات نہیں۔ چنانچہ میں نے دو کھیل دیکھے LEAVE HER HEAVEN اور THE RAINS CAME

باہر نکلا تو سر میں درد ہو رہا تھا، اب تک سر بھاری ہے۔ میں ہندوستان میں بھی سینما کہاں دیکھتا ہوں، کوئی پکڑ لے جائے تو اور بات ہے۔ یہاں عام طور سے سینما گھر میں ایک ہی درجہ ہوتا ہے۔

آج نیویارک ٹائمز کے ادبی حصہ میں فرانس کے متعلق کچھ ادبی معلومات چھپی ہیں۔ اُس میں یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ژاں پال سارترے نے پھر فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کی حمایت میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ کوئی خاص بات ہوگی۔

۲۰ اکتوبر دوشنبہ — صبح آنکھ کھُلی تو اندھیرا اندھیرا سا تھا، دیر تک انتظار کرتا رہا، گھڑی دیکھی تو آٹھ بج چکے تھے اُٹھ کر کھڑکی کی طرف نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ برفباری ہو رہی ہے۔ یہ سلسلہ ساڑھے دس بجے تک جاری رہا۔ ہوا میں تیزی اور خنکی بے حد بڑھ گئی تھی۔ یہاں کے محکمۂ موسمیات کو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔ کل کے اخبار میں تھا کہ نیویارک کے موسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، مطلع صاف رہے گا۔ ساڑھے دس بجے میں راک فیلر سنٹر گیا۔ کئی خط ملے اور طبیعت بالیدہ ہوگئی۔ مسٹر گل پیٹرک سے ملاقات ہوئی اور سفر کے کچھ تاثرات اُن سے بیان کئے۔ مفصل باتیں پرسوں لنچ پر ہوں گی۔ وہ جنوری میں جاپان، لنکا، ہندوستان،

اور پاکستان کے دورے پر جا رہے ہیں اور شروع مارچ میں واپس آجائیں گے۔

شام کے وقت آدھ گھنٹے تک دوبارہ برف گری۔ میں کمرے میں پڑا ایک ایک خط کئی کئی دفعہ پڑھتا اور جواب لکھتا رہا۔ اگر بھوک نہ ہوتی تو آج پڑا ہی رہتا۔ یہاں کے کھانوں سے میرا پیٹ تو بھر جاتا ہے لطف نہیں آتا۔ اگر کبھی کبھی اِس طرح کا کھانا ملے تو تبدیلی مزا دے، روزانہ جی اُکتانے لگا ہے حالانکہ میں کھانے کے معاملہ میں بہت بد ذوق ہوں۔ کھانوں کا ذکر آگیا ہے تو یہاں کے ہوٹلوں اور کھانوں کا مختصر سا تذکرہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں مختلف قسم کے ہوٹل اور طعام خانے پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم تو ہوٹلوں کی وہ ہے جہاں سفارش سے جگہ ملتی ہے۔ دوسرے اعلیٰ درجے کے ہوٹل ہیں، جن میں قیام کے ساتھ طعام بھی ہے لیکن ایسے ہوٹل یہاں کم یاب ہیں۔ ہوٹلوں سے وابستہ طعام خانے ہوتے ہیں، آپ کا جی چاہے وہاں کھائیے جی چاہے کہیں اور۔ کمروں میں کھانا منگانے کا رواج نہیں ہاں خاص انتظام کرایا جائے تو اور بات ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ ہوٹل آرام دہ ہوتے ہیں اور صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ کھانے کی دوکانوں کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، بعض جن میں پچاسوں آدمی کھانا کھلانے کے لئے نوکر ہیں اور بعض جن میں صرف ایک ہی آدمی ہے جو بہت سے لوگوں کو کھانا بھی دے رہا ہے اور چیزیں تیار بھی کر رہا ہے اور سب کچھ مشین کی پھرتی سے ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ ہر دلعزیز وہ دوکانیں ہوتی ہیں جنھیں کیفے ٹیریا کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک معمولی مثال دلّی سکریٹریٹ کے اندر دیکھی جا سکتی ہے۔ اپنا کھانا خود کھڑے ہو کر لینا پڑتا ہے اور آخر میں آکر محصّل کو دام دینا ہوتا ہے،

پانی خود ہی لانا پڑتا ہے - یہ طریقہ بعض حیثیتوں سے اچھا ہے - ہر چیز آپ کی نگاہ کے سامنے ہوتی ہے، جو جی چاہے پسند کیجئے - کھانے انواع واقسام کے ہوتے ہیں، ترکاریاں بھی کافی ہوتی ہیں، بعض بعض جگہوں پر چاول بھی مل جاتا ہے - دودھ اور پھل کا استعمال کافی ہوتا ہے - دودھ ٹھنڈا اور بغیر شکر کے پیتے ہیں - یہاں چند دوکانیں ہندوستان اور پاکستان کے کھانوں کی بھی ہیں تعطیل کے دن بہت سے ہندوستانی انھیں میں کھانا پسند کرتے ہیں اور یوں تو ہر ملک کی مخصوص چیزیں مخصوص ہوٹلوں میں مل جاتی ہیں - کھانے کی قیمت کا اندازہ کچھ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر آپ مرغ کا ایک ٹکڑا یعنی تقریباً چوتھائی مرغ اس کے ساتھ تھوڑا سا آلو یا شلجم، تھوڑے سے ہری مٹر کے دانے، دو توس، ایک پیالی کافی اور آئس کریم یا کوئی ایسی ہی میٹھی چیز لیں تو آپ کو اس کے کم سے کم سوا ڈالر یعنی تقریباً چھ روپیہ[1] ادا کرنے ہوں گے - گو یہاں کا معیارِ زندگی اونچا ہے، مگر پھر بھی بہت کم لوگ یہ کھانا کھا سکتے ہیں - اس سے سستی چیزیں بھی مل جاتی ہیں مگر بہت سستی نہیں - ابھی آج ہی کے اخبار میں یہاں کے عام کام کرنے والوں کی تنخواہ دی ہوئی تھی جو اس طرح تھی - جو شخص ہوٹل میں کام کرتا ہے اور ہفتہ میں ۳۵ گھنٹہ کی ڈیوٹی انجام دیتا ہے اسے ساڑھے تینتیس ڈالر (تقریباً ایک سو ساٹھ روپے) ہفتہ - جو ٹیلیفون پر کام کرتا ہے اور ۳۷ یا ۴۲ گھنٹہ وہ ساڑھے چالیس ڈالر (تقریباً ایک سو بانوے روپے) اور ساڑھے بیالیس ڈالر (تقریباً دو سو روپے) ہفتہ تنخواہ پاتا ہے - اس سے یہاں کی زندگی کا اندازہ

---

[1] ڈالر ہندوستانی سکہ میں تقریباً چار روپے بارہ آنے اور پاکستانی روپیوں میں تین روپے کا ہے۔

لگایا جا سکتا ہے۔ مگر معلوم نہیں یہ اعداد و شمار کہاں تک صحیح ہیں اور کن علاقوں سے متعلق ہیں۔

۲۱ر اکتوبر منگل۔ صبح کو ٹہل رہا تھا کہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ملا جس میں لکھا ہوا تھا کہ اسٹی ونسن کو اسٹالین نے امریکہ کی صدارت کے لئے کھڑا کیا ہے، وہ کمیونسٹوں کا آدمی ہے اس لئے اس سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ لکھنے والے نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ راک فیلر فاؤنڈیشن کے روپیہ سے ماسکو گیا تھا، راک فیلر فاؤنڈیشن اور روس میں خفیہ سمجھوتہ ہے اسی لئے اُس کے وظیفہ یاب یونیورسٹیوں میں کمیونزم پھیلا رہے ہیں۔ یہ عجیب لطیفہ ہے۔ روس اسٹی ونسن کو کروڑپتی کہتا ہے، خود امریکہ کے کمیونسٹ اُس پر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر الکشن میں یہ سب کچھ جائز ہے! جس کو جو جی چاہے کہا جا سکتا ہے۔

شام کو ولیم کلفرڈ سے ملاقات ہوئی اور تین گھنٹے تک باتیں ہوئیں۔ نوجوان آدمی ہیں، ہندوستان تین دفعہ جا چکے ہیں۔ سال بھر شانتی نکیتن میں پڑھ چکے ہیں۔ آدمی ملنسار ہیں لیکن مجھے خود غرض اور چالاک معلوم ہوتے ہیں۔ ادب، سیاست، ہندوستان، امریکہ، مذہب ہر چیز کے متعلق باتیں ہوئیں۔ مسانی کی نئی کتاب COMMUNISMIN INDIA پر نظر ثانی کر کے انگریزی درست کر رہے ہیں، جلد ہی چھپے گی اور غالباً امریکہ ہی سے۔ مسانی سے یہاں کافی دلچسپی لی جا رہی ہے، وجہ ظاہر ہے۔

۲۲ر اکتوبر بدھ۔ موسم پرسوں کے مقابلے میں بہت گرم تھا، مجھے ساڑھے بارہ بجے راک فیلر سنٹر پہونچنا تھا، دس ہی بجے نکل کھڑا ہوا، افسانوں، دوکانوں

اور عمارتوں کو دیکھتا رہا۔ میں نے کسی دن شروع ہی میں یہ رائے ظاہر کی
تھی کہ عورتوں میں اچھی صورتیں نظر نہیں آتیں۔ یہ کوئی کلیہ نہیں تھا، شعلہ وگل
سے یہاں بھی سابقہ پڑتا ہے، نیویارک میں کم اور نیویارک کے باہر زیادہ۔
بارہ بجے راک فیلر پلازا پہونچا تو وہاں بھیڑ دیکھی، قریب گیا تو معلوم ہوا کہ
SKATING ہو رہی ہے۔ عورتوں اور مردوں نے وہ کمال دکھائے کہ
انگشت حیرت در دہاں والا معاملہ پیش نگاہ تھا۔ رقص، اُچھل کود، چُستی
اور پُھرتی اور چمکتی ہوئی زمین کے اوپر بہتے ہوئے جسم۔ معلوم ہوا کہ یہ مشغلہ
جاڑے بھر رہے گا۔

آج مسٹر گل پیٹرک سے تین گھنٹہ تک باتیں ہوئیں۔ میں نے انھیں
یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ چاہے ادب کا معاملہ ہو یا تاریخ اور
سیاست کا، ہندوستان کی تاریخ، روایات، موجودہ حالات، اندرونی تضاد
کو پیشِ نگاہ رکھے بغیر کچھ سمجھنے کی کوشش فضول ہوگی۔ امریکی یہی غلطی کرتے ہیں کہ وہ
امریکہ کی تعلیم، خوش حالی، ذرائع حمل ونقل کی افراط اور مختصر سی تاریخی روایت
کی روشنی میں موجودہ ہندوستان کا ذہن سمجھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں اُردو
کے مستقبل پر گفتگو ہوئی اور مجھے کہنا پڑا کہ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہم
جد وجہد کر رہے ہیں۔ امریکہ میں مختلف یونیورسٹیوں اور شہروں میں جانے کا پروگرام
بناتے ہوئے میں نے آج یہ بھی کہہ دیا کہ میں اپریل میں انگلستان چلا جانا چاہتا ہوں
غالباً زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔

۲۳ر اکتوبر جمعرات۔ بچوں نے کئی بار لکھا کہ امریکہ سے اپنی تصویر بھجوائیے

آج میں نے ٹائمز اسکوئر کی ایک دوکان میں تصویر کھنچوائی - ہر چیز کی طرح تصویریں بھی مہنگی پڑتی ہیں - بائیس ڈالر میں چھ تصویریں - اس سے مہنگی اور اس سے سستی بھی کھنچ سکتی تھیں - آج کسی سے ملنا نہیں تھا تو میں جفرسن اسکول آف سوشل سائنسز پہونچ گیا - یہ اسکول مارکسزم کے اصولوں پر مختلف علوم کی تعلیم دیتا ہے - ڈاکٹر ہوورڈ سیل سیم جن کی کتابیں WHAT IS PHILOSOPHY اور SOCIALISM & ETHICS مشہور ہیں اُس کے ڈائرکٹر ہیں - وہ موجود نہیں تھے لیکن مجھے اسکول کے قواعد وضوابط اور نصاب تعلیم وغیرہ کے دیکھنے کا موقع مل گیا - یہ لوگ امریکہ کے اِس بحرانی دَور میں جمہوریت اور آزادیٔ فکر کے لئے بڑے مشکل حالات میں جد و جہد کر رہے ہیں -

شام کو کاظم ظہیر کے یہاں گیا - وہ آخر نومبر میں یورپ ہوتے ہوئے لکھنؤ جا رہے ہیں - چھ سال کے بعد!

۲۵ اکتوبر سینچر - کل طبیعت سُست رہی زیادہ تر پڑا رہا - آج کا دن بھی کل ہی کی طرح گذر جاتا اگر آج میں چارلی چپلن کی نئی تخلیق LIMELIGHT دیکھنے نہ نکل گیا ہوتا - کیا لکھوں اس کے متعلق! ایک عظیم الشان شخصیت کا عظیم الشان کارنامہ ہے - ذاتی اور شخصی پس منظر کے ساتھ زندگی کی مسرت والم کی سچی تفسیر! زندگی سے محبت، اُس کی شیرینی اور تلخی کا احساس، اس کے برقرار رکھنے اور بہتر کام میں لانے کی جد و جہد! اس میں کیا نہیں ہے - اِسے دیکھ کر زندگی کے خوابیدہ تار جھنجھنا اُٹھے - مجھے مغربی موسیقی زیادہ متاثر نہیں کرتی لیکن اِس فلم میں جو موسیقی ہے اُس نے مجھے مسحور کر لیا - میں نے چارلی چپلن کی

جب بھی کوئی تصویر دیکھی ہے مجھے محسوس ہوا ہے کہ زندگی ایک المیہ ہے جس کو نشاطیہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے! عجب اتفاق ہے کل ہی آل حسن (میرے ایک عزیز جو لندن بی بی سی میں ہیں) نے لکھا تھا کہ چیلپن کی نئی فلم ضرور دیکھئے گا اور آج ہی میں نے یہ فرض پورا کر دیا۔ یہ تصویر اُن ہنگامہ خیز، جنسی، سطحی، بے مقصد فلموں سے کس قدر مختلف ہے جن کی یہاں بہتات ہے۔ یہ چارلی چیلپن ہے جسے تاریخ دنیا کے عظیم ترین اداکاروں میں شمار کرے گی اور یہ امریکہ ہے جہاں اُس کے فن کی، اُس کے نقطۂ نظر کی یہاں تک کہ اُس کے وجود کی شدید مخالفت کی جا رہی ہے اُس کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ ظلم و جبر، سامراج اور سرمایہ داری کا دوست نہیں ہے!

۲۷ اکتوبر دوشنبہ ــــ کل کچھ لکھتا پڑھتا رہا، کاظم صاحب کے یہاں جانے کا خیال تھا، تین بار ٹیلیفون کیا جواب نہ آیا اس لئے پڑا رہا۔ آج دس بجے راک فیلر سنٹر پہونچا کہ شائد گھر سے خط آیا ہو، نہیں آیا، طبیعت متردد ہو گئی۔ اس کے سوا اور بس ہی کیا ہے۔ بارہ بجے کے قریب یونائیٹڈ نیشنز پہونچا کئی آدمیوں سے ملنے اور اسے دوبارہ دیکھنے کا خیال تھا۔ آج کمیٹیوں کے کمرے، عمارت کے خاص حصے، جنرل اسمبلی ہال سب دیکھے۔ کسی جلسہ یا مباحثہ میں البتہ شریک نہ ہو سکا اُس کے لئے پہلے سے اجازت نامہ حاصل کرنا چاہیئے تھا۔ عمارت اور اُس کے لوازم دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آسائش کی تمام صورتیں مہیا کر دی گئی ہیں اور تماشائیوں کو تمام چیزیں دکھانے کا خاص اہتمام ہے۔ ہر جگہ موسم اور اپنے ملک کی آب و ہوا کے مطابق درجۂ حرارت کر لینے کا انتظام ہے۔ کمیٹیوں کے کمروں کی روشنی، فرنیچر،

ہر چیز میں خصوصیت ہے۔ بہت سا سامان مختلف ملکوں نے تحفہ کے طور پر دیا ہے یہاں، پہونچ کر کچھ دیر کے لئے تو یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ لوگ چاہیں تو مِل جُل کر رہ سکتے ہیں۔ جلسہ میں کسی دن اور شریک ہوں گا مجھے بعض "بزرگوں" کی زیارت کرنے کے علاوہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ کس طرح بات کی بات میں تقریباً تقریر کے ساتھ ہی ساتھ اُن کے ترجمے بھی مختلف زبانوں میں آتے جاتے ہیں۔ یہاں بنارس کے رہنے والے مرزا محمد تقی صاحب سے ملاقات ہوئی، اب پاکستانی ہیں اور اسی اقوام متحدہ میں ملازم۔ اُنھیں سے معلوم ہوا کہ ن م راشد بھی یہیں آ گئے ہیں۔ اُن سے ملاقات نہ ہو سکی، ٹیلیفون پر باتیں ہوئیں، پھر ملاقات ہوگی۔ تنہائی کے احساس کو بُھلائے رکھنے کی کوشش میں صبح کا نکلا ہوا چھ بجے شام کو قیام گاہ پر آیا لیکن اب کہاں بچ کر جاؤں گا!

۲۹ر اکتوبر بدھ — ایک ایک دن کا ناغہ دے کر اس لئے لکھ رہا ہوں کہ کوئی خاص بات لکھنے کے لئے نہ ہو تو ہر روز لکھنے سے کیا فائدہ! پھر یہ بھی خیال ہے کہ اس کی ضخامت بڑھتی جا رہی ہے اگر کہیں شائع ہونے کی نوبت آئی تو کون چھاپے گا! ابھی تو گھر سے نکلے ہوئے صرف دو مہینے ہوئے ہیں تقریباً دس مہینے پڑے ہوئے ہیں بہت کچھ لکھا جائے گا۔

آج موسم عجیب رہا، معمولی برفباری ہوئی کئی دن کے بعد گھر سے خط پاکر کچھ اطمینان ہوا۔ اِس سے پہلے کا خط نہیں مِلا۔ میں برابر سوچتا ہوں کیا امریکہ کا انتظام کچھ یونہی سا ہے! اس سے پہلے دو خط نیویارک پہونچ کر غائب ہو چکے ہیں۔ میرے لئے اِس سے بڑی کوئی کوفت نہیں۔ آج مشہور ناشر جان ڈے کمپنی کے

مالک مسٹر رچرڈ والش سے ملا۔ یہ مسز پرل بک کے شوہر ہیں۔ ہندوستان سے دلچسپی رکھتے ہیں، جواہر لال نہرو وغیرہ کی کتابیں شائع کرتے رہے ہیں۔ دلچسپ باتیں ہوئیں خیر اور باتوں کا کیا ذکر کروں ایک بات جو کئی دن سے دل میں تھی میں نے ان سے کہہ دی۔ میں نے کہا آپ سب یہی کہتے ہیں کہ ہم ہندوستان کو سمجھنا چاہتے ہیں، آج کل کسی ملک سے دلچسپی کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعلق وہاں کے اخباروں میں کیا شائع ہوتا ہے۔ میں مشکل ہی سے یہاں کے اخباروں میں ہندوستان کی خبریں دیکھتا ہوں ادھر دو ہفتے میں میں نے یہ خبریں دیکھیں کہ امریکہ پھر ہندوستان کو چار کروڑ پچاس لاکھ ڈالر قرض دے رہا ہے، ہندوستان میں گائے پوجا کا ہفتہ منایا گیا، کلکتہ کے قریب ایک اژدہے نے ہاتھی کے بچے کو کھانے کی کوشش کی، یا کبھی کبھی اقوام متحدہ کے سلسلہ میں نام آجاتا ہے، کیا اس طرح آپ ہندوستان کو جان رہے ہیں؟ کچھ پریشان سے ہوئے اور کہنے لگے اب ہم نے شروع کیا ہے، دو تین سال سے اچھی خاصی خبریں دینے لگے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا اگر یہی اچھی خاصی خبریں ہیں تو پہلے کیا حال رہا ہوگا! اُن کا اصرار ہے کہ پرل بک سے بھی ملوں۔ میں نے خواہش تو ظاہر کر دی ہے مگر ابھی وقت کا تعین نہیں ہوا ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں لکھے ہوئے ناولوں کے ترجمے یا ہندوستان کے بارے میں لکھے ہوئے ناول چھاپنا چاہتے ہیں۔

۳۱ اکتوبر جمعہ۔ ایک لحاظ سے آج کا دن دلچسپ گذرا۔ میں صبح ساڑھے نو بجے یہاں کے سرکاری ریڈیو اسٹیشن دوائس آف امریکہ پہونچا۔ ہندوستانی یونٹ کے

لوگ اس طرح ملے کہ مجھے ہندوستان کے ریڈیو اسٹیشن کا لطف آگیا۔ کئی تو دہلی
ریڈیو اسٹیشن سے آئے ہوئے ہیں آل حسن کو جانتے ہیں اور جب انھیں معلوم ہوا
کہ میں ان کا بھائی ہوں تو بڑے ادب اور محبت سے پیش آئے۔ سب کا اصرار
تھا کہ میں اُن کو انٹرویو دُوں لیکن اس وقت جو میرے خداوندانِ نعمت ہیں اُن کی
رائے غالباً مختلف ہوگی بعض وُجوہ سے میں بھی کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ پاکستان
یونٹ میں کوئی خاص آدمی نہیں ملا لیکن اُن کے امریکی آفسر اِن چارج سے بہت
سی باتیں ہوئیں۔ ہندوستان والوں نے اپنی پوری ایک دن کی ریکارڈنگ دکھائی
اور پاکستان نے اپنی اُردو سُنا کر رائے چاہی، دو مہینے کے بعد ہندوستانی گیت
سُننے کا موقع ملا۔ بہت سی یادیں اور میٹھا درد اُس کا نتیجہ تھا۔ بہرحال دو ڈھائی گھنٹے
کے لئے دلچسپی رہی۔ موقع ملا تو پھر کسی دن جاؤں گا۔ دو بجے مسز ویرا ڈین سے ملا۔
اُن کا اصرار میری بے دلی پر غالب آیا اور میں نے یہاں کے لڑکیوں کے سب سے
بڑے کالج اسمتھ کالج کے ہندوستانی پروگرام میں دسمبر کے پہلے ہفتہ میں ہندوستانی
ادب پر دو لکچر دینے اور بحث مباحثہ میں شریک ہونے کا وعدہ کرلیا ہے یہ کالج
نیویارک سے تقریباً تین سَو میل شمال کی جانب نارتھمپٹن میں ہے وہاں سے
ایک اور کالج میں مس فلورا لڈنگٹن سے ملنے اور تقریر کرنے کے لئے جانا ہے۔
یہ امریکہ کی پبلک لائبریریوں کی انجمن کی صدر رہیں۔ اُن سے ملنے کا پروگرام پہلے
ہی سے تھا ہندوستان میں کئی سال رہ چکی ہیں اور ہندوستان کی بڑی دوست
سمجھی جاتی ہیں۔ ساڑھے تین بجے کے قریب اتفاقاً مسٹر گل پیٹرک سے
ملنے گیا تو انھوں نے کہا کہ میں کئی دلچسپ آدمیوں کو لئے ہوئے ساڑھے گیارہ بجے

آپ سے ملنے کا منتظر تھا، میں نے کہا کوئی وعدہ تو تھا نہیں تو اپنی غلط یادداشت پر شرمندہ ہوئے۔

۲ر نومبر اتوار۔ صبح ہی اُٹھ کر کاظم صاحب سے ملنے چلا گیا اور پھر ساڑھے پانچ بجے شام کو پلٹا۔ ان کی باتوں میں وقت خوب گذرتا ہے۔ جب وہ امریکہ میں بسنے والے ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں جو چالیس چالیس سال سے پڑے ہوئے ہیں اور طرح طرح سے زندگی بسر کر رہے ہیں تو ایک دلکش داستان کا لطف آنے لگتا ہے۔ آج انھوں نے ہوٹل پیرے کے ایک باورچی مسٹر ریاض علی سے ملایا، سلہٹ کے رہنے والے ہیں، عمر پینتالیس سال کے قریب ہوگی، دس سال سنگاپور میں رہے پندرہ سال سے امریکہ میں ہیں، فوج میں رہ چکے ہیں، برائے نام لکھ پڑھ لیتے ہیں، خانساماؤں کی سی انگریزی بولتے ہیں لیکن وہ ہر ہفتہ نوّے ڈالر پاتے ہیں۔ ہوٹل میں جا کر صرف چند ہندوستانی چیزیں پکا دیتے ہیں اُن کے دو مکان ہیں، جس میں رہتے ہیں وہ میں نے بھی دیکھا بہت سجا ہوا ہے، موٹر ہے، ریڈیو ہے، ٹیلیفون ہے، ٹیلی ویژن ہے، آسائش کی ہر چیز ہے اور ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے پرٹوریکو کی رہنے والی ایک لڑکی سے شادی کی ہے، اس وقت بینک میں کئی ہزار ڈالر موجود ہیں وہ جو سوٹ پہنے ہوئے تھے سَو ڈالر سے کم کا نہ ہوگا۔ اور ایسے نہ جانے کتنے پڑے ہوئے ہیں جو معمولی ملازمتیں کر کے، لکچر دے کر، کھیل دکھا کر، طرح طرح کے اسکول کھول کر، تجارت کر کے لطف کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُن کے کوئی اعلیٰ مقاصد نہیں ہیں، وطن اور ملک کا کوئی خاص تصوّر نہیں ہے، بس جی رہے ہیں اور

احساس کی نیش زنی سے بچ کر آسودہ حال ہیں۔ موقع ملا تو کچھ ہندوستانی تاجروں، یوگیوں اور فلسفیوں سے بھی ملوں گا۔

الکشن کی سرگرمی اپنی انتہا پر ہے۔ درمیان میں ایک دن اور ہے اور پھر فیصلہ۔ ابھی تک صحیح اندازہ نہیں ہوتا صرف دونوں پارٹیوں کے لوگ یقین کے ساتھ اپنی فتح کا اعلان کر رہے ہیں۔ یہاں جتنے پڑھے لکھے لوگوں سے ملاقات ہوئی اُن میں سے اکثر تو اسٹی ونسن ہی کو چاہتے ہیں انھیں خیال ہے کہ آئزن ہاور ہو گئے تو دنیا کا نقشہ بدل جائے گا۔ کچھ نہ کچھ ہو گا تو ضرور، مگر کیا ہو گا یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

۳ نومبر دوشنبہ۔ ملنے جلنے کے لحاظ سے آج کا دن اچھا خاصا رہا، موسم کے لحاظ سے خراب۔ آسمان کل ہی سے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اخباروں سے معلوم ہوا کہ کہیں جنگلوں میں آگ لگی ہوئی ہے، اُس کا دھواں ہے۔ خیریت ہے کہ کسی کے دل کے جلنے کا دھواں نہیں ہے! صبح رنگین اور چمکدار جلد کی کتابیں چھاپنے والی کمپنی نیو امریکن لائبریری گیا، اصل اڈیٹر مسٹر کریٹ انک سے ملاقات نہیں ہوئی، دوسرے صاحب مسٹر ولیم رٹر سے باتیں ہوئیں۔ وہ لوگ ہندوستان کے متعلق ہی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی لکھی ہوئی کتابیں چھاپنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ رٹر صاحب ہندوستان جا رہے ہیں۔ مسز ارابل پورٹر سے بھی ملاقات ہوئی جو انکی نیو رائٹنگ کی اڈیٹر ہیں، ہوشیار معلوم ہوتی ہیں۔ نیو رائٹنگ کی پہلی جلد مجھے دی، دوسری چھپ چکی ہے ابھی آئی نہیں۔ وہ ہندوستانی ادب کے متعلق مضامین چاہتی ہیں، میں نے دو چار نام بتائے ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں کتابیں بیچنے اور چھاپنے کا بہتوں کو خیال ہے۔
ظاہر ہے یہ ہندوستان سے محبت کا ثبوت نہیں ہے، تجارت اصل مقصد ہے۔
معمولی طور پر یہ بھی خواہش ہے کہ یہاں کے لوگ اُس عجیب و غریب ملک کے
متعلق جانیں۔ اِن لوگوں سے پھر ملنا ہے۔

رات کو مسٹر جیمس ٹی فیرل سے ملاقات ہوئی۔ میں نے غالباً ۱۹۳۸ء
میں ان کی ایک کتاب نوٹس آن لٹریٹری کری ٹی سزم پڑھی تھی اور اُس زمانے
میں اُس کے بعض حصے پسند بھی آئے تھے۔ اب تک ستائیس کتابیں شائع
کر چکے ہیں، پانچ بار یورپ جا چکے ہیں۔ بہت دیر تک باتیں ہوئیں۔ باتونی معلوم
ہوتے ہیں، ملنے جلنے کے شائق ہیں، یورپ کے بہت سے ادیبوں کو جانتے ہیں
نظر گہری نہیں ہے مگر ناول چھپواتے اور روپیہ پیدا کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کی
گفتگو کے بعد ذرا کھل کر امریکہ کے متعلق باتیں ہوئیں۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی
ہر طرح کی باتیں، امریکہ کی موجودہ آسودہ حالی سے اس قدر خوش ہیں کہ کسی قسم کی
تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے یہ بات میں نے کم و بیش تمام لوگوں کے یہاں
پائی، وہ کہتے ہیں ہمارے پاس کیا نہیں ہے کہ ہم سوشلزم کی خواہش کریں! جس
طبقہ سے یہ لوگ تعلق رکھتے ہیں شائد وہ اس سے زیادہ سوچ بھی نہیں سکتا۔
فیرل کا اصرار ہے کہ جب تک امریکہ میں ہوں کئی دفعہ ملوں یا انھیں نیویارک میں
رہنے کے اوقات بتاؤں تاکہ وہ خود ملیں۔

کچھ دیر کے لئے مسٹر گل پیٹرک سے بھی باتیں ہوئیں، ہندوستان کی
یونیورسٹیوں کے متعلق اُن کے پاس کافی معلومات ہیں بہت سے لوگوں سے

خط و کتابت ہے۔ وہ آج یونیورسٹیوں کی تحقیقی کام کی طرف سے غفلت کی شکایت کر رہے تھے۔ میں اُن سے ایک حد تک متفق ہوں لیکن پھر بھی مجھے تکلیف ہوئی۔ یہ کیا بات ہے کہ جب باہر کے لوگ ہماری کمزوریوں پر بھی اعتراض کرتے ہیں تو بُرا معلوم ہوتا ہے حالانکہ ہم خود ہندوستان میں بیٹھ کر یہی باتیں کرتے ہیں۔

۴، نومبر منگل — شہر میں دفاتر بند تھے دوکانیں کھُلی ہوئی تھیں الکشن کا ہنگامہ تھا لیکن نوبجے رات تک نتیجہ کے متعلق کوئی قابل اعتبار اطلاع نہیں — مجھے کیوں فکر ہے؟

۵، نومبر بدھ — جنرل آئزن ہاور امریکہ کے صدر ہو گئے۔ مجھے اسی بات کا خطرہ تھا۔ اندیشہ ہی نہیں یقین ہے دنیا کے حالات میں بڑی تبدیلی ہوگی جو ہندوستان کو بھی متاثر کرے گی۔ کاش وہاں کی روح اجتماعی اسے ابھی سے سمجھ سکے!

آج صبح مسٹر نارمن کزنس سے ملا۔ یہ یہاں کے اہم لوگوں میں سے ہیں۔ ان سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔ ہندوستان سے دلچسپی لیتے ہیں۔ جب پنڈت نہرو یہاں آئے تھے تو یہ کئی بار اُن سے ملے اور اُس ملاقات کی تفصیل ایک کتاب کی شکل میں شائع کی ہے۔ الکشن کے نتیجہ سے بہت بد دل تھے مگر کہتے تھے جنرل آئزن ہاور سب کچھ سنبھال لیں گے۔ آج ہندوستان کی سیاسی اور معاشی حالت کے متعلق اُن سے کافی باتیں رہیں۔ جو باتیں ان لوگوں کے موافق نہیں ہیں، اُنھیں سُن کر چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے۔ امریکہ کے مفاد کے علاوہ کوئی سیاسی عقیدہ نہیں معلوم ہوتا۔ نارمن کزنس ان لوگوں میں سے ہیں جو لبرل کہے جاتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ امریکہ میں لبرل بھی صرف نام کو لبرل رہ گئے ہیں۔

نیویارک ٹائمز نے آئزن ہاور کے انتخاب کے جو اثرات مختلف ملکوں میں
ہوئے اُن کا خلاصہ دیا ہے ۔ ہر جگہ یہی رونا ہے کہ اب شائد امداد نہ ملے ۔ ہندستان کا
ذکر بھی انھیں الفاظ میں ہے ۔ اللہ کب تک روح اور ضمیر مجروح ہوتے رہیں گے!
کب تک یہ بے چارگی اور ذلّت !

۷ر نومبر جمعہ ۔ کل رات کو نیویارک سے ۳۰۰ میل دُور اِتھاکا پہونچ گیا جہاں
کارنل یونیورسٹی ہے ۔ راستہ میں مناظر بے حد حسین تھے ۔ برابر بھوپال سے بمبئی،
پونا سے بمبئی کے راستوں کی یاد آتی رہی ۔ خزاں زدہ جنگل پہاڑوں کے ڈھلوانوں پر
بڑا حَسین منظر پیش کرتے ہیں ۔ زیادہ تر درخت برفیلی ہواؤں کی چوٹ کھا کر
ننگے ہو چکے ہیں مگر جس طرح بہت سے انسانوں پر موسموں کا زیادہ اثر نہیں ہوتا اُسی
طرح بعض درخت بھی ہرے بھرے کھڑے ہیں ۔ کارنل یونیورسٹی پہاڑیوں کے بیچ میں
اونچی نیچی جگہ پر واقع ہے ، بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے ۔ اس کی اپنی ایک
دنیا ہے ۔ ڈاکٹر مزمدار یہیں ہیں رات ہی ان سے ملاقات ہوئی اور دو تین
گھنٹے تک باتیں ہوئیں ، خوشی ہے کہ اُن کے تاثرات کم و بیش وہی ہیں جو
میرے ہیں ۔ انسان کی آنکھیں کھلی ہوں ، ضمیر میں جان ہو اور احساس کُند
نہ ہوا ہو تو وہ ظاہر کے نیچے بھی بہت کچھ دیکھ سکتا ہے ۔

آج یہاں کے کئی پروفیسروں سے ملاقات ہوئی ۔ زیادہ تر اُن لوگوں
کی باتیں سُنتا رہا لیکن کہیں کہیں میں نے اُنھیں ہندوستانی ذہن سے بھی
آشنا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ یہ کس حد تک موجودہ حالات میں ممکن ہے ،
کس حد تک کرنا چاہیئے ؟ نہیں کہہ سکتا ۔ غالب کا یہ شعر ضرور یاد رکھنا چاہیئے

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیا دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

دوستوں کے حالات، بیوی بچوں کی خیریت اب تقریباً تین ہفتہ بعد معلوم ہو گی، مجبوری ہے! شام کو شہر دیکھا، چھوٹا سا، صاف ستھرا، خوبصورت ہے ڈاکٹر مزمدار کے ساتھ ایک چینی رستراں میں کھانا کھایا کچھ وقت یہاں کے اسٹاف کلب میں گذارا۔ ہلکی ہلکی برف گر رہی ہے۔ اور برف سے بھیگی ہوئی تیز ہوا میں "شمشیر کی تیزی" ہے۔ نومبر میں یہ حال ہے تو آگے کیا ہو گا اور مجھے دسمبر اور جنوری میں اور زیادہ شمالی حصہ میں رہنا ہے۔

۱۰ نومبر دوشنبہ ۔ کئی پروفیسروں سے مل چکا، کہیں راستہ صاف نہیں۔ زندگی کی جس منزل میں یہ لوگ ہیں اور جس میں ہندوستان ہے نقطۂ نظر میں فرق ہونا لازمی ہے، میں کوئی مُبلّغ تو ہوں نہیں کہ اپنے خیالات کا انھیں حامی بناؤں بس یہی کہتا ہوں کہ ہم اپنے یہاں کی زندگی کو دیکھتے ہوئے ادب کو زندگی سے بے تعلق بنانے کا خیال بھی نہیں کر سکتے یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی اُن میں سے چند نام یہ ہیں۔ شعبہ انگریزی کے پروفیسر اَبرام، مِنرز، کرین اور کینٹ، عمرانیات کے پروفیسر اڈپلر، ریان، کانس ٹیٹ۔ لائبریری کے جرمن اسسٹنٹ ڈائرکٹر رائخ مان سے بھی ملا کیونکہ اُنھوں نے گل پیٹرک کو خط لکھا تھا کہ وہ ہندوستان کے مطبعوں کے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں اور اُنھوں نے یہ کام میرے ذمہ کر دیا تھا اُنھیں چند کتابوں کے نام اور حوالے لکھ دیے۔

کل ڈاکٹر مزمدار نے اپنے یہاں چند پروفیسروں کی دعوت کی تھی،

کچھ ہندوستانی چیزیں خود ہی پکائی تھیں۔ ساڑھے گیارہ بجے رات تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ موسم بے حد خراب ہے۔ رندھی ہوئی طبیعت میں اِس نے اور اضافہ کر دیا ہے۔

۱۲، نومبر بُدھ — میں نے طے کر لیا ہے کہ شروع جولائی میں لکھنؤ پہونچ جاؤں گا۔ تھوڑا بہت جو کچھ لکھنے پڑھنے کا کام ہے وہیں کر سکتا ہوں، دو کتابیں پریس میں ہیں، اُردو ادب کی تاریخ ہندی میں میں نے محنت سے لکھی تھی، وہ چھپنے کے لئے پڑی ہوئی ہے، دو کتابیں جن کا سلسلہ مدّت سے چل رہا ہے ادھوری ہیں، یہی کام کر لوں تو بہت ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں انسان بہت سے موضوعات کے متعلق بہت کچھ سیکھ سکتا ہے، کام کرنے کا طریقہ جان سکتا ہے، اپنے خیالات پر وہ جس قسم کے بھی ہوں، جِلا کر سکتا ہے لیکن میں خود ان باتوں سے کس قدر فائدہ اُٹھا سکوں گا، نہیں کہہ سکتا۔ بہت سے کام جن سے ہندوستان کی علمی اور ادبی زندگی منظم ہو سکتی ہے پیش نظر ہیں مگر وہ کس طرح ہو سکیں گے یہ بتانا بہت مشکل ہے، جی چاہتا ہے کہ جلد پہونچ کر اُن کے متعلق وہاں لوگوں سے تبادلۂ خیال کروں۔ شائد راستہ آگے دکھائی دے۔ مثلاً ایک اچھی علمی انجمن کی ضرورت ہے جو ایک اکیڈمی کی طرح سارے علمی کاموں پر نظر رکھے۔ جیسے واشنگٹن کی امریکن کونسل آف لرنڈ سوسائٹیز۔ ہندوستان کی موجودہ زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست وغیرہ مستقل انگریزی میں شائع کرنا، مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کے ریویو شائع کرنے کے لئے ایک سہ ماہی انگریزی رسالہ نکالنا، ہندوستانی زبانوں کی

کتابوں کے انگریزی ترجمے کرانا۔ اگر اتنے ہی کام شروع ہو جائیں تو ہندستان کا سر دُنیا کے سامنے اونچا اُٹھ سکتا ہے۔ یہ کام حکومتوں، یونیورسٹیوں، ادبی انجمنوں اور ادیبوں سب کی مدد اور منظم کوشش ہی سے کئے جا سکتے ہیں۔ دیکھوں ہندوستان پہونچ کر یہ دُھن باقی رہتی ہے یا نہیں۔

یونیورسٹی کے اساتذہ کتنی عزت اور اخلاق سے ملتے ہیں، اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں مگر ـــــــ مگر ان باتوں میں ہندوستان کے لئے ترحّم اور ہمدردی کا عُنصر ضرورت سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ محض میرا خیال ہے؟

۱۴ ، نومبر جمعہ ـ کوئی خاص کام نہیں ـ کچھ لوگوں سے ملنا، ڈاکٹر مزمدار کے پاس وقت گذارنا، باتیں کرنا، لکھنؤ کی واپسی کی اسکیم بنانا اور اس پر اتنا وقت صرف کرنا جیسے کوئی بہت بڑی فاتحانہ مہم سَر کرنے کا ارادہ ہو، کچھ وقت لائبریری میں گذارنا۔ اور یہ سب کچھ عجیب طرح کی بے دلی سے۔ یہاں رہ کر ہندوستان زیادہ عزیز ہوتا جا رہا ہے۔ اُس کی خامیوں اور کوتاہیوں کی طرف زیادہ نگاہ جانے لگی ہے، اُس کی پس ماندگی کا زیادہ خیال آنے لگا ہے۔ وہاں پہونچ کر کام کرنے کے گوشے زیادہ واضح ہونے لگے ہیں لیکن دشواریوں کا احساس بھی کم نہیں ہے۔

موسم اچھا ہے، پرسوں سے برابر دھوپ نکلی ہوئی ہے، ہوا میں تیزی اور خنکی بھی کم ہے لیکن طبیعت بحال نہیں۔ اخبارات پڑھ کر اور اُلجھن ہوتی ہے، کیا سب تیزی سے تیسری جنگ کی طرف جا رہے ہیں؟ میرے خیال میں تو صرف اختلافات ہی واضح نہیں ہوتے جا رہے ہیں بلکہ تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔ وسطی اور مغربی یورپ، بحرُالکاہل، مشرق وسطیٰ، افریقہ، ہندچین سب جیسے

اندر ہی اندر سُلگ رہے ہیں۔ انگلستان کے اخبار نویس بھی کچھ یونہی سوچ رہے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ابھی کل ہی کے اخباروں میں یہ بات تھی کہ امریکہ کے اِس الکشن کے دیکھنے اور اُس کے متعلق اخبارات میں مضامین لکھنے کے لئے امریکہ نے کچھ لوگوں کو وظیفے دئے تھے، اُس میں ایک ولیم وائٹ بھی تھے۔ یہ انگلستان کی پارلیمنٹ کے لیبر ممبر ہیں۔ وہ امریکہ میں دو مہینے رہے اور جب واپس گئے تو انھوں نے الکشن کے نتائج اور امریکہ کی رجعت پسندی پر مضامین لکھے۔ کل نیویارک ٹائمز نے اُن کے ڈیلی ہیرلڈ (لندن) کے مضامین کے اقتباسات دینے کے بعد کم سے کم تین جگہ طعن آمیز انداز میں لکھا کہ امریکہ ہی کے ڈالر سے امریکہ کی سیر کی اور اب امریکہ ہی کے خلاف لکھ رہے ہیں۔ کیا امریکہ کے ٹیکس ادا کرنے والوں کی گاڑھی کمائی اِسی طرح صرف کی جائے گی؟ یہ یہاں کے سب سے اہم اخبار کی آواز ہے۔ اِس سے بہت سے سبق لئے جا سکتے ہیں۔ قرض، امداد، چار نکاتی پروگرام، تعلیمی وظائف، ہر چیز کو سامنے رکھ کر اِس جذبے کا مطالعہ کرنا چاہیئے، حالات غور طلب ہیں۔ بعض یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اربابِ حل وعقد غیر ملکی باشندوں سے نہیں، اپنے یہاں کے تمام متعلقین سے امریکی دستور سے وفاداری کا حلف لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر مزمدار سے کیلی فورنیا یونیورسٹی اِسی قسم کا حلفِ وفاداری چاہتی تھی انھوں نے معذرت کر لی کہ میں اپنے ملک کے لئے حلفِ وفاداری اُٹھا چکا ہوں اب دوسرے کے لئے کیسے اُٹھا سکتا ہوں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ "سرخی" کی تلاش میں ہنگامے نہ برپا ہوتے ہوں۔ کل اقوام متحدہ کے ایک بڑے امریکی افسر نے اِسی گھبراہٹ میں خودکشی کر لی۔

جی نہ لگنے کے بہت سے اسباب ہیں اور وقت کسی طرح کٹ نہیں رہا ہے۔

۱۶ نومبر اتوار — رات ڈاکٹر اوپلر کے یہاں ڈنر تھا۔ اُن کی بیوی نے ہندوستانی کھانے پکائے تھے۔ اُن کے گھر پہونچ کر بہت سی ہندوستانی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں، ہندوستان کے متعلق کتابیں، اخبارات، تصاویر، سامانِ آرائش، گانے کے ریکارڈ، سبھی چیزیں۔ مسٹر اوپلر امریکہ میں ہندوستان کے متعلق ذمہ دارانہ رائے رکھنے والے تسلیم کئے جاتے ہیں، میں اندازہ نہیں لگا سکتا کہ ان کی دلچسپی کس قسم کی ہے۔ کئی ہندوستانی اکٹھا ہو گئے تھے اور میں نے دیکھا ہے کہ امریکہ میں جب کئی ہندوستانی جمع ہو جاتے ہیں تو ہندوستان کا ذکر چل نکلتا ہے، ذہن اندر ہی اندر یہاں کی ترقی اور ہندوستان کی پستی کا مقابلہ کرتا رہتا ہے اور ہندوستان کو بامِ ترقی پر پہونچانے کی اسکیمیں بننے لگتی ہیں۔ برابر یہ احساس ترقی کرتا جا رہا ہے کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور پڑھے لکھے لوگوں پر بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ زندگی جمود کی جس منزل میں ہے اُس سے باہر نکلے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں ہے تعمیری نقطۂ نظر کی سخت ضرورت ہے ترقی پسند طاقتوں کا متحد ہونا لازمی ہے۔ چھتیس کروڑ انسانوں کا مُلک، جس کے پاس کھیت، دریا، سمندر اور معدنی اشیاء موجود ہیں کیا نہیں کر سکتا!

۱۷ نومبر دوشنبہ — آج شعبۂ فلسفہ کے ڈاکٹر برٹ سے ملاقات ہوئی۔ بہت اہم سمجھے جاتے ہیں ہندوستانی فلسفہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ دو بار چین اور ایک دفعہ ہندوستان ہو آئے ہیں، آئندہ سال پھر ہندوستان جا رہے ہیں۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں، فلسفہ، ادب اور زبانوں کے متعلق

دیر تک باتیں ہوئیں، لنچ اُنھیں کے ساتھ کھایا۔ اِدھر دو تین دن سے نہ جانے کیوں ہندوستان کے مستقبل کی طرف سے مایوسی سی ہو رہی ہے۔ مستقبل سے میری مراد مستقبل قریب ہے، ہم کتنی دشواریوں میں زندگی گذار رہے ہیں اور یہ لوگ؟ یہ تقابل احساسِ کمتری پیدا کرتا ہے، شائد گفتگو کرتے ہوئے میرے خیالات میں قنوطیت تھی کیونکہ پروفیسر برٹ نے جب یہ کہا کہ اس وقت سب کچھ شائد ٹھیک نہ ہو لیکن آپ لوگ ضرور دشواریوں پر قابو پالیں گے تو مجھے خیال آیا کہ میں کچھ مایوسی کی باتیں کر رہا تھا۔

کچھ وقت لائبریری میں گذرا۔ موسم عجیب ہے، کہرا بوندا باندی اور اندھیرا ــــــ آج کے اخباروں میں ہائڈروجن بم کے تجربہ کی بھی خبر ہے۔ پینتیس ۳۵ میل کے فاصلہ پر سورج سے دس گنا زیادہ روشنی۔ اَمن کے نعروں کے ساتھ اس بم کی آواز!

مسٹر گل پیٹرک کا خط آگیا کہ میں اپریل میں انگلستان جا سکتا ہوں اور جولائی میں لکھنؤ۔ اب پروگرام اِسی کے مطابق بنانا چاہیئے۔

۱۹ نومبر بدھ ــــ اِدھر میں مسلسل امریکی نقادوں کی کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ کم سے کم مجھ سا کم علم تو ان میں اپنا راستہ نہیں پاتا۔ مجھے صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ یہ نقاد چاہتے کیا ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ اِس وقت امریکہ میں تنقیدی ادب پر جتنا زور دیا جا رہا ہے اور اُس کے لئے جس طرح فلسفہ، نفسیات، مابعد الطبیعات اور اشاریت کا مطالعہ کیا جا رہا ہے وہ حیرت خیز ہے لیکن یہاں کے کسی مشہور نقاد نے میرے ذہن کے کسی گوشے کو منور نہیں کیا۔

ایلیٹ، رچرڈس، ولسن، برک، ٹیٹ، رین سم، ونٹرس، بروک، ٹرلنگ، یہ یہاں کے اہم ترین نقاد ہیں، کچھ کو پہلے پڑھ چکا ہوں۔ مجھے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ لوگ ادب اور زندگی کے تعلق سے اِس قدر چڑھتے کیوں ہیں، کہتے ہیں کہ زندگی الگ ہے اور ادبی یا شعری تجربہ الگ، پھر قیامت یہ ہے کہ تجربہ کی ہمہ گیری اور شدّت پر بھی زور دیتے ہیں اور دبی زبان سے ایک اخلاقی مطمحِ نظر بھی تسلیم کرتے ہیں یہ لوگ ایک خاص قسم کے جذباتی، غیر مادّی تجربہ کے اظہار کو شاعری کہتے ہیں اور جیسے ہی مذہب کے علاوہ زندگی کی کسی ایسی قدر کا ذکر آجاتا ہے جو انسانی تجربہ کا جزو ہے، یہ لوگ اُلجھ جاتے ہیں۔ وِلسن اور ٹرلنگ کو ان لوگوں سے الگ کیا جاسکتا ہے، رچرڈس کی راہ بھی دوسری ہے لیکن نفسیاتی اندازِ نظر نے انھیں بھی وہیں پہونچادیا ہے۔ یہاں کے زیادہ تر نقّاد کسی نہ کسی شکل میں ایلیٹ اور پاؤنڈ کے رُوحانی شاگرد ہیں جو عقیدہ — اور صرف کیتھولک عقیدہ — رکھنے والوں ہی کے یہاں نظم اور حُسن دیکھتے ہیں۔ یہاں روزنامچہ میں یہ بحث کیا چھیڑوں، ہوسکا تو الگ سے لکھوں گا۔

موسم خراب ہے، طبیعت سُست ہے، واپسی کی خواہش تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ کیا میں اپنا وقت ضائع کررہا ہوں! یہ قید کا احساس کیوں ہے؟ عجب فضا معلوم ہورہی ہے۔ تعلیمی اوقات کی چھان بین ہورہی ہے کہ کہیں ان کے وظائف کے پردے میں وہ لوگ تو نہیں کام کررہے ہیں امریکہ جنھیں پسند نہیں کرتا۔

۲۰ نومبر جمعرات ــ موسم بے حد خراب تھا لیکن غیر متوقع طور پر گھر کا خط مل گیا تو طبیعت خوش ہو گئی اور موسم کی خرابی ، بے کیفی اور تنہائی کا احساس جاتا رہا ۔ انسان کیسی چھوٹی چھوٹی مسرتوں کا غلام ہے ! اس خط سے یہ معلوم ہو کر بے حد دُکھ ہوا کہ مجھے صرف گھر والوں ہی کے نہیں بہت سے دوستوں کے خط نہیں ملے ، آخر اس کا سبب کیا ہے ! نیویارک پہونچ کر دیکھنا ہے کتنے اور کس کس کے خط ملتے ہیں ۔ جن کے خط نہیں ملے اور جواب نہیں جا رہے ہیں وہ کیا سوچتے ہوں گے ! پردیس میں یہ دُکھ بھی ناقابل برداشت ہے ۔

اِتھاکا سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے سیراکیوز ۔ آج وہ دیکھنے کا موقع ملا ۔ کارنل میں ایک مسٹر راج پرتاب مصر ہیں ، آٹھ نو سال سے تعلیم کے سلسلہ میں یہیں ہیں فی الحال یونیورسٹی کے انجینیری کے شعبہ میں ملازم بھی ہو گئے ہیں ، دلچسپ اور واقف کار اِنسان ہیں انھیں اِس شہر میں کوئی کام تھا چنانچہ ڈاکٹر مزمدار اور میں ، دونوں اُن کی موٹر میں ساتھ ہو لئے اور سیراکیوز کی سیر کر آئے ۔ خوبصورت شہر ہے ۔ راستہ بہت پُرلطف تھا ، پہاڑیاں درخت ، فارم ، خوبصورت گاؤں ۔ شہروں کے متعلق البتہ یہ احساس ہوتا ہے کہ سب ایک ہی سے ہیں ۔ واشنگٹن کے کچھ حصّوں کو چھوڑ کر سب میں یکسانیت ہے ابھی میں نے چند ہی شہر دیکھے ہیں لیکن اندازہ یہی ہے ۔ جب شام کو چھ بجے واپسی ہوئی تو میں نے اور ڈاکٹر مزمدار نے ایک دوسرے کو دیکھ کر کہا "چلو ایک دن اور کٹا !" مزمدار نہ جانے کیوں بہت اُکتائے ہوئے ہیں ، اُن سے باتیں کر کے مجھ پر بھی یہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔

آج کل یہاں کے اخبارات بڑے بڑے لوگوں کی رشوت خوری اور استمدادِ جرائم کے مقدمات سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں، میری دلچسپی کی خبر یہ ہے کہ ہندوستان نے کوریا میں جنگ روکنے کی جو اسکیم پیش کی ہے اُس سے دلچسپی لی جا رہی ہے، کم سے کم کسی نے بہت سخت الفاظ میں اختلاف نہیں کیا ہے، اگر کسی طرح اس تجویز کی بنیاد پر جنگ رُک گئی تو یقیناً ہندوستان کا سر بلند ہو جائے گا کہ ہندوستان اُمن عالم کے لئے کس قدر کوشاں ہے۔

۲۲ نومبر سینچر — صبح موسم اچھا تھا لیکن شام کو بارش ہو گئی۔ آج دوپہر کو پروفیسر اوپلر سے ملنے گیا تو انھوں نے دوپہر بعد سیر کرنے اور رات کا کھانا ساتھ کھانے کی دعوت دی چنانچہ دو بجے سے تقریباً ساڑھے پانچ بجے تک جھیلوں کے کنارے اور پہاڑیوں میں سیر کرتے رہے۔ کئی آبشار دیکھے اور خوبصورت پارک۔ گرمیوں میں یہ جگہ بہت دلچسپ ہو جاتی ہو گی! آج اُن سے امریکہ اور ہندوستان کے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں۔ مسٹر اوپلر مجھے تو سنجیدہ اور علم دوست انسان معلوم ہوئے۔ اگلی گرمیوں میں ہندوستان جانے والے ہیں۔

کل کے اخباروں میں مشہور اطالوی فلسفی کروچے کے مرنے کی خبر تھی۔ دورِ جدید میں جمالیات اور فلسفۂ تاریخ کے جو نظریات اُس نے پیش کئے ہیں اُن سے اتفاق نہ ہو جب بھی اُن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کل نیویارک واپس جانا ہے، سفر کی دلکشی اور اُلجھن دونوں میں جنگ ہو رہی ہے۔

۲۴ نومبر دوشنبہ — کل رات کو نیویارک واپس آگیا۔ راستہ خوبصورت تھا لیکن نہ جانے کیوں جی نہ لگا، زندگی کی راہ میں آسانی سے ہم سفر نہیں ملتے۔

وہی تنہائی کا بوجھ، وہی بجھی بجھی طبیعت۔ پہاڑیوں پر سوکھے درختوں میں کھڑے چند ہرے درختوں نے پھر متوجہ کیا۔ خزاں کے باوجود یہ سدا بہار درخت، بہار کے یہ نقیب، موسم کی سختیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سینہ تانے کھڑے ہیں۔ اُنھیں دیکھ کر مایوسی میں اُمید اور اندھیرے میں اُجالے کا خیال آتا ہے۔ کوئی شاعر ہوتا تو ان خیالات میں رنگ آمیزی کرتا، میرے اندر تو شاعری کی رُوح جیسے سوگئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ...... لیکن نہیں، کیا خبر، شائد پھر کبھی جاگے اور مقید نغمے، گلے میں پھنسے ہوئے گیت لفظوں کا جامہ پہنیں۔ سفر سے متعلق دلچسپی کے لئے یہ بھی لکھ دوں کہ ٹرین میں دو ڈالر کا کھانا کھایا۔ اُس میں مچھلی کا ایک ٹکڑا توس، مکھن، اُبلے ہوئے تین آلو، سیم اور کافی شامل ہیں۔ چند لقمے کھائے تھے کہ مچھلی سے عجیب بُو نکلی اور پھر کوئی لقمہ حلق کے نیچے نہیں اُترا۔

آج راک فیلر فاؤنڈیشن گیا تو کئی خط ملے اور کئی نہیں ملے۔ اِس کا کیا علاج کروں، یہ خط کہاں رہ جاتے ہیں۔ ایک خط سے دوسرے خط کا پتہ چلتا ہے۔ خطوں کا غائب ہونا ہر جگہ اور ہر حالت میں صبر آزما ہے اور یہاں عزیزوں اور دوستوں سے اتنی دُوری پر تو قیامت ہے، قیام کا حوصلہ بٹنے لگتا ہے۔

یہ ملک اپنی دولت، ذرائع اور طاقت کے لحاظ سے نہ جانے کس منزل میں ہے، یہاں کے اخبارات دیکھئے تو پتہ چلتا ہے۔ بعض اخبارات کبھی دُنیا کے دوسرے گوشوں میں جو ردّ عمل ہو رہا ہے اُس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں، یہ سارے مطالعے دلچسپ ہیں۔ کل صدر ٹرومین نے کہا اور متکبرانہ انداز میں کہا کہ ریاستہائے متحدہ کے صدر کی قوت اور اختیار کو سیزر، چنگیز خاں، لوئی چہاردہم

اور نیپولین کی طاقت سے نسبت نہیں دی جا سکتی ۔ اِس وقت اِس میں
شک کی گنجائش نہیں لیکن کون جانے کیا ہو!

آج صبح مسٹر گل پیٹرک سے مِلا ، اِدھر اُدھر کی بہت سے باتیں ہوئیں،
ابھی واپسی کا پروگرام نہیں بن سکا مجھے اِتنا گھبرانا بھی نہیں چاہیئے ۔ چند ہی
مہینوں کی تو بات ہے لوگ سالہا سال سے پڑے ہوئے ہیں ۔

۲۷ ، نومبر جمعرات — ڈاکٹر مزمدار آگئے تھے کل دن کا زیادہ حصّہ اُنھیں
کے ساتھ گذرا شام کو ایک فلم THIEF ساتھ ہی دیکھنے گئے ، ناطق فلموں
کے دَور میں یہ ایک خاموش فلم بنائی گئی ہے ۔ اسے خاموش بھی نہیں کہہ سکتے
ایک طرح کی نفسیاتی کوشش ہے ، امریکہ کی موافقت میں اس کی تبلیغی
اہمیت بہت نمایاں ہو جاتی ہے ۔

ہندوستان کی جنگ بندی والی تجویز ویسے امریکہ نے تو نامنظور
ہی کی تھی لیکن ، روس نے بھی اس سے اختلاف کیا ۔ یہاں کے اخبارات
جس طرح اس کے متعلق لکھ رہے ہیں ، داد کے قابل ہے! اس کو کہتے ہیں
سیاست اور حکمتِ عملی!

دو تین دن مَیں یوں ہی گھومتا کتابیں پڑھتا اور خطوط لکھتا رہا ، کسی
خاص شخص سے ملاقات بھی نہیں ہوئی ۔ کیا ملوں ، میں جانتا ہوں جو باتیں
ہو سکتی ہیں ۔ آج کا دن البتہ روزنامچہ میں جگہ پانے کا مستحق ہے ۔ آج امریکہ کا
قومی تیوہار "یوم تشکّر" (THANKSGIVING DAY) تھا ۔ کہا جاتا ہے
کہ سترھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں جب انگلستان کے لوگ یہاں

بسنے کی نیت سے آئے اور مشرقی اضلاع میں رہنے لگے تو ایسی سخت سردی پڑی
کہ جان کے لالے پڑ گئے اور ان لوگوں نے یہاں بسنے کی ہمت چھوڑ دی۔
اُنھوں نے دعائیں مانگیں، منتیں مانیں اور جب سردی ختم ہو گئی تو ایک
یوم تشکّر منایا۔ یہ اسی کی یادگار ہے۔ پہلے غالباً کسی اور زمانے میں ہوتا تھا
اب تو نومبر کی چوتھی جمعرات کو منایا جاتا ہے۔ خوشیاں منائی جاتی ہیں، دعوتیں
ہوتی ہیں اور دعوت میں ٹرکی کا گوشت ضرور ہوتا ہے کیونکہ جب ان انگریزوں کے
پاس کچھ نہیں رہا تھا تو قرب و جوار کے وحشی باشندوں نے ٹرکی انھیں لاکر
کھانے کو دی تھی۔ اسی کی خوشی میں نیویارک کی مشہور دوکان میسی کمپنی نے
ایک بہت بڑا جلوس نکالا جس میں ربر کے سیکڑوں فٹ اونچے کھلونے، ناچ،
باجے سبھی تھے۔ پولیس کا انتظام تھا، بعض راستوں پر ٹرافک بند تھی۔ یہ
اس کمپنی کا بڑے دن کے لئے اشتہار بھی تھا لیکن اسے اتنی اہمیت تھی کہ
ٹیلی ویژن والے بھی اِسے دکھا رہے تھے۔ غضب کی دوکان ہے اِس میں
چھوٹی بڑی ہر چیز مل جاتی ہے اور پندرہ ہزار ملازم کام کرتے ہیں۔ اس
تیوہار کی تھوڑی سی مذہبی اہمیت بھی ہو گئی ہے۔ اِس کے بعد سے گویا یہ
سمجھا جاتا ہے کہ بڑے دن کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ویسے تو مدّت سے
بڑے دن کے لئے دوکانیں سجی جا رہی ہیں۔ پھر یہاں کی ہر بات نرالی ہے۔
ایک ذمہ دار پروفیسر نے بتایا کہ اُن کے پاس ۱۹۵۲ء نہیں بلکہ ۱۹۵۳ء کے
بڑے دن کے ایک ڈنر میں شریک ہونے کے لئے خط آگیا کہ منظوری بھیج دیں
ورنہ پھر جگہ نہیں رہے گی۔ اِس سے یہاں کے لوگوں کے کردار کے متعلق

رائے قائم کی جا سکتی ہے ۔

پروفیسر فلپ ہٹی نے اپنی تاریخ اہل عرب کے ترجمہ کے کچھ صفحات لاہور سے منگا کر مجھے بھیجے ہیں کہ اس کے متعلق رائے دوں۔ آج میں نے وہ صفحات دیکھ ڈالے۔ ترجمہ اچھا تو نہیں ہے غنیمت ہے۔ اُنھیں مفصّل رائے لکھ کر بھیج دوں گا۔

۲۸ نومبر جمعہ۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ نیند کم آتی ہے اس لئے صبح کو جلد اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ باہر نکلنے کے لئے تیار ہوتے ہوتے دس بج جاتے ہیں آج مسٹر گل پیٹرک سے ملا کہ آیندہ پروگرام کے متعلق باتیں کر لوں کیوں کہ وہ شروع جنوری میں امریکہ سے باہر چلے جائیں گے۔ اور دو مہینہ بعد واپس ہوں گے۔ تقریباً یہ بات طے ہوگئی کہ میں آخر مارچ میں انگلستان کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔ ابھی امریکہ میں مجھے آٹھ دس یونیورسٹیوں میں جانا ہے۔ سردی کے خیال سے کچھ اُلجھن ہو رہی ہے لیکن یہ کام بھی ضروری ہے۔

دو بجے کے قریب کاظم ظہیر کو رخصت کرنے گیا وہ آج کوئن الزبیتھ نامی جہاز سے انگلستان گئے وہاں سے جنوری میں ہندوستان جائیں گے۔ شام کو کاظم صاحب مع اپنی اہلیہ کے آگئے دیر تک باتیں ہوئیں اور اُن کے ہمراہ دس بجے رات تک ٹہلتا رہا۔

آج لکھنؤ چھوڑے ہوئے تین مہینے ہو گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت دن گذر گئے، اس طرح محسوس کرنے کا کیا علاج ! واقعی ہوئے تو تین ہی مہینے ہیں۔

یکم دسمبر ۵۲ء دوشنبہ ۔ پرسوں رات کوکئی انچ برف گری، دو دن گذر گئے لیکن ابھی جگہ جگہ پر اُس کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، ہوا میں بڑی ٹھنڈک ہے۔ اب یہ سلسلہ تقریباً تین مہینے تک لگا رہے گا۔ دو دن زیادہ گھوما پھرا نہیں کچھ پڑھتا ہی رہا۔ کل کے نیو یارک ٹائمز میں ہندوستان کی موجودہ سیاسی اور اقتصادی حالت پر اُس کے نامہ نگار دہلی کا ایک دلچسپ مضمون ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کی سیال حالت اور ناقابل پیش گوئی صورت حال کا اچھا تجزیہ ہے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ ہندوستان میں صرف دو ہی طاقتیں ہیں، کانگریس اور کمیونسٹ، کانگریس جواہرلال کے دم تک ہے اس لئے امریکہ کو جو کچھ کرنا ہے جلد ہی کر لینا چاہئے یعنی جلد ہی ہندوستان پر کم سے کم ایک ارب ڈالر خرچ کرنا چاہئے۔ اِس مضمون میں اور دلچسپ باتیں بھی ہیں جو امریکی پروپیگنڈے کا خاص پہلو ہیں مثلاً یہ کہ روس اور ہندوستان میں رقابت اور کشمکش اصل میں اس بات کی ہے کہ ایشیا میں رہنمائی اور قیادت کس کی ہو۔

آج امریکہ کے مشہور نقاد مسٹر لائنل ٹرلنگ سے مِلا، ہندوستان کی یونیورسٹیوں، زبانوں، ادبی مسئلوں، امریکہ کے نقّادوں وغیرہ کے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں۔ اِس وقت تک جتنے مصنّفوں اور نقّادوں سے مِلا ہوں مجھے سب سے زیادہ معقول اور دلچسپ ٹرلنگ ہی کے خیالات معلوم ہوئے۔ اِدھر میں نے ان کی کتاب LIBERAL IMAGINATION پڑھی تھی اس لئے گفتگو کی گنجائش بھی تھی۔ وہ بھی یہاں کے نقّادوں کے شاکی ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنی ساری ذہانت غیر اہم مسائل کی تحقیق میں لگا رہے ہیں۔ ٹرلنگ

نفسیات اور عمرانیات دونوں سے کام لینے کے قائل ہیں۔ موجودہ امریکہ میں مارکسزم
کی کوئی جگہ نہیں دیکھتے، کہتے ہیں کہ ۱۹۳۹ء کے بعد سے، روسی نظام جمہوریت پر
سے اعتقاد اُٹھ گیا۔ اُن کا خیال ہے کہ یہاں تنقید کے مختلف اسکول نہیں ہیں
بلکہ لوگ شخصیتوں کے گرد اکٹھا ہیں یا اپنا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ہندوستان جانے
کے خواہشمند ہیں اور ممکن ہے دو ایک سال کے اندر کچھ دنوں کے لئے آئیں۔
بہر حال اُن سے مل کر خوشی ہوئی۔ پھر ملنے کا وعدہ ہے۔ اُنھیں اس بات پر
حیرت ہے کہ ہم لوگ ہندوستان میں تقریباً بیس بائیس گھنٹے پڑھاتے ہیں اور
پھر بھی الگ سے کچھ لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ میں نے زندگی کی اُن سہولتوں کی طرف
بھی اُنھیں متوجہ کیا جو یہاں حاصل ہیں اور ہم جن کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔
۲ر دسمبر منگل — آج عجیب موسم رہا، دوپہر تک برف اُس کے بعد بارش،
طبیعت اُلجھنے لگی۔ میں نے نیو امریکن لائبریری والوں سے ملنے کا وعدہ کیا تھا
ساڑھے دس بجے برف باری ہی کی حالت میں وہاں گیا۔ نیو رائٹنگ کی اڈیٹر
مسز پورٹر سے ملاقات ہوئی۔ میں مصنفوں کی رائلٹی وغیرہ کے متعلق باتیں دریافت
کرتا رہا، نیو رائٹنگ میں ہندوستان اور پاکستان کے ادب کے شامل کرنے کے
متعلق کچھ مشورے دئے۔ ہوٹل واپس آیا تو پھر طبیعت گھبرائی میں نے کہا لاؤ
انگلستان سے ہندوستان جانے والے جہازوں کا پتہ لگا لوں، اس کے لئے
کیونارڈ لائنس کمپنی گیا، یہ جگہ عین وال اسٹریٹ میں ہے۔ صرف ایک
جہاز کا پتہ چلا جو ۱۰ر جون کو لندن سے بمبئی جائے گا۔ جس میں جگہ مل سکتی ہے۔
لیکن میں نے وال اسٹریٹ کے بینکوں، اکسچینج کی عمارتوں اور کمپنیوں کو دیر تک

دیکھا، یہیں سے اس وقت مالیات عالم کی طنابیں ملی ہوئی ہیں۔

بعض اوقات جب کچھ کرنے کو نہیں ہوتا تو ذہن یادوں کے خزانے کھول دیتا ہے، عزیز، دوست، شہر، گاؤں، مکان سب سامنے آتے ہیں اور ذہن میں اس طرح دھنس جاتے ہیں کہ انھیں الگ کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بہت کچھ اس پر منحصر ہے کہ نگاہیں کیا کیا دیکھتی ہیں، کیا چاہتی ہیں اور تسکین کے پہلو نہ ہونے کی وجہ سے کیا محسوس کرتی ہیں۔

۱۴ دسمبر جمعرات ۔ کل سے طبیعت ٹھیک نہیں، معدہ خراب ہے، فاقہ کرنے کے سوا اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی، ڈرتا ہوں کہیں زیادہ نہ پڑ جاؤں، اب مسلسل سفر ہی سفر ہے۔ اعزا اور احباب کے جو خط ملتے ہیں اُن میں ازراہ محبت غمِ دُوری اور پریشانی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن یہ چیز مجھے افسردہ کردیتی ہے۔ بیوی بڑی ہمت سے میری دُوری کو برداشت کر رہی ہیں لیکن میں خطوں میں اُن کا غم اور کرب پڑھ لیتا ہوں ۔ کل مسٹر گل پیٹرک سے دیر تک باتیں ہوئیں، وہ مجھ سے کچھ ضرورت سے زیادہ متاثر ہوتے جا رہے ہیں اور یہ بات میرے لئے وبال جان ہے۔ کل پوچھنے لگے کہ یہاں جن لوگوں سے آپ ملے ہیں اُن میں سے کسے ہندوستان بھیجا جائے کہ وہاں کی ادبی زندگی کا مطالعہ کرے، میں نے لائنل ٹرلنگ کا نام لیا لیکن یہ بھی کہا کہ ابھی بہت سے لوگوں سے ملنا ہے، بعد میں بتاؤں گا۔

میں سفر سے اُلجھ رہا ہوں اور وہ زیادہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ مسٹر ولفرڈ کینٹول اسمتھ جن کی کتاب MODERN ISLAM IN INDIA مجھے پسند آئی تھی اور

جن سے لکھنؤ میں دو تین بار ملاقات بھی ہوئی تھی۔ آج کل مانٹریال (کناڈا)
میں ایک اسلامی تحقیقاتی ادارے کے ڈائرکٹر ہیں، کسی طرح انھیں معلوم ہو گیا
کہ میں امریکہ میں ہوں، انھوں نے فاؤنڈیشن والوں سے اصرار کیا ہے کہ میں
مانٹریال بھی جاؤں چنانچہ اب مجھے ایک ہفتہ کے لئے وہاں بھی جانا ہوگا اگر
اسمتھ سے ملنے کا خیال نہ ہوتا تو میں انکار کر دیتا۔

آج میں نے ہندوستانی کانسلیٹ جاکر پاسپورٹ میں کناڈا کا اضافہ
کرالیا، آخر دسمبر یا شروع جنوری میں جاؤں گا۔ وہاں کی سردی کے خیال سے
روح کانپ رہی ہے۔ آج ہی میری واپسی کا مسئلہ بھی قطعی طور پر طے ہو گیا،
۲۱ مارچ ۱۹۵۳ء کو نیویارک سے لندن اور ۱۰ جون ۱۹۵۳ء کو لندن سے
بمبئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذہن پر سے کوئی بوجھ ہٹ گیا۔

۶ دسمبر سنیچر۔ معلوم نہیں طبیعت کیوں بہت سست رہتی ہے۔ معدہ
ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، بہ ظاہر کوئی ایسی بات بھی نہیں کہ ڈاکٹر کے پاس جاؤں،
غالباً کھانے میں تبدیلی اور موسم کا اثر ہے۔ کل لاہور سے نقوش کا افسانہ نمبر
آگیا۔ یہاں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نعمت مل گئی، تقریباً سبھی اچھے افسانہ نویس
شریک بزم ہیں۔ خیر یہ رسالہ تو رجسٹرڈ آیا مجھے حیرت اس پر ہے کہ الہ آباد سے
ایک رسالہ ایک پیسے کے ٹکٹ میں یہاں پہونچ گیا۔

دو دن موسم ایسا خراب رہا کہ اُلجھن ہونے لگی۔ بارش اور تیز ہوا،
اور اسی میں مجھے بعض لوگوں سے ملنے کے لئے نکلنا پڑا۔ یہاں کے لوگ بھی
موسم کے شاکی تھے۔ کل رات کو پٹنہ کے پروفیسر مائٹی سے ملاقات ہوئی،

یہاں نفسیات کے مطالعہ کے لئے آئے ہیں، امریکہ کے متعلق تاثرات پر
تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ بوڑھے ہیں، اُنھیں یہاں آنے سے کیا فائدہ ہوگا،
خالص علمی آدمی نہیں معلوم ہوتے۔
بڑے دن کی تیاریاں تو کب سے ہو رہی ہیں مگر اب تو یہ عالم ہے کہ
بڑی دوکانوں کے قریب سے ہو کر راستہ چلنا مشکل ہو رہا ہے۔ مردوں سے
زیادہ عورتیں ماری ماری پھر رہی ہیں، کس قدر چیزیں خریدی جا رہی ہیں۔
ماں باپ بچوں کے لئے، بچے ماں باپ کے لئے، بیویاں شوہروں کے لئے
شوہر بیویوں کے لئے اور عاشق محبوباؤں کے لئے تحفے تلاش کر رہے ہیں۔
پیسے ہیں کیوں نہ خریدیں، مجھے کیوں رشک آ رہا ہے!
کاظم صاحب سے ہارلم میں ایک ہندوستان رسٹراں میں ملنے کا وعدہ
تھا ساڑھے چھ بجے وہاں گیا۔ وہاں کے ایک مسلمان رسٹراں میں مرغ اور
پراٹھے کھائے۔ امریکہ کے ہندوستانی باشندوں کے متعلق انھوں نے
بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں۔ مثلاً یہاں بہت سی دوکانوں میں مختلف وضع قطع
کی پیتل کی گھنٹیاں، تعویذ یا ٹوٹکے کے طور پر رنگین سوت میں بندھی ہوئی
نظر آتی ہیں اور اُن پر لکھا ہوتا ہے BELL OF SARNA، انھوں نے بتایا
کہ پنجاب کے قریب کا ایک رہنے والا پینتیس سال پہلے یہاں آگیا تھا،
انگریزی بھی اچھی طرح نہیں بول سکتا تھا، یہاں مختلف کام کرتا رہا، سرن
اُس کا نام ہے، اُس نے ہندوستان سے گھنٹیاں منگوائیں مختلف وضع
قطع کی، اُن کے متعلق اُس نے مشہور کیا کہ ان سے ہر کام ہو جاتا ہے اور

ہر کام کے لئے ایک گھنٹی مخصوص کر دی، آہستہ آہستہ کچھ توہّم پرست، بالعموم نیگرو اُسے خریدنے لگے، پھر دوسرے لوگ ایک انوکھی چیز سمجھ کر لینے لگے۔ اب وہ لاکھوں ڈالر کا آدمی ہے۔ کہنے لگے "تو سید صاحب! کوئی ایسی ہی چیز سوچیئے آپ بھی لاکھوں کے آدمی بن جائیے، کیا کر رہے ہیں پڑے ہوئے چند سو مہینے کی تنخواہ پر"! میں ہنس دیا۔ کل نارتھمپٹن اسمتھ کالج جانا ہے۔

۹/دسمبر منگل — پرسوں رات کو نارتھمپٹن آگیا۔ اسمتھ کالج امریکہ میں لڑکیوں کا سب سے اہم کالج خیال کیا جاتا ہے۔ یہاں ڈھائی ہزار لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ کالج ہی کے مہمان خانے میں ٹھہرا اور دو دن بے حد مصروفیت رہی۔ لکچر دینا، الگ الگ باتیں کرنا، اسٹاف کلب میں لوگوں سے ملنا، لنچ، ڈنر، چائے، ہزارہا سوالوں کے جواب اور یہ سب کچھ اِس حالت میں کرنا پڑا کہ ایک ہفتہ سے مجھے شدید پست ہمتی، بیزاری اور اُلجھن کا احساس ہے اور عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کرنا چاہئے۔ ہر طرف ذہن جاتا ہے، بیماری، موسم کا اثر، ہندوستان کی یاد۔ بہر حال بے حد پریشان ہوں، اپنے آپ سے لڑ رہا ہوں اور لڑوں گا۔ بیماری سے بچنے کے لئے میں نے یہاں ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا، اس نے ایک دوا دی ہے لیکن کہا ہے کہ نیویارک جاکر اچھی طرح دکھا لینا چاہئے ابھی مجھے یہاں سے کئی جگہ جانا ہے دیکھوں کہاں کہاں جا سکتا ہوں۔ یہاں میں نے ہندوستانی ادب اور تہذیب پر دو لکچر دئے۔ خاص اجازت تھی ورنہ مجھے امریکہ میں لکچر نہیں دینا ہے۔

کالج کے اوقات میں لڑکیاں نیکر پہنے ہوئے سائیکلوں پر اس طرح چلتی ہیں

کہ حیرت ہوتی ہے، ہزارہا سوال کرتی ہیں، خوش و خرم نظر آتی ہیں، بعض ہندوستان جانے کی بھی آرزومند ہیں، بعض بال ترشوانے تین چار سو میل جاتی ہیں کیونکہ یہاں بال اچھے نہیں کٹتے۔ کالج کیا ہے اچھی خاصی یونیورسٹی ہے، بہت اچھا کتب خانہ ہے، بڑی اچھی عمارتیں ہیں اساتذہ میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ اسٹاف کلب میں لنچ تھا اور مجھے ہندوستان کی موجودہ حالت پر اظہارِ خیال کرنا تھا۔ تقریباً ساٹھ اساتذہ تھے۔ میں نے اپنی باتوں سے اُن لوگوں کو مایوس کیا کیونکہ میں نے انھیں بتایا کہ ہندوستان میں امریکہ کے مقاصد کے متعلق بہت شکوک ہیں۔ کم سے کم میں اتنا تو اُن کو بتا ہی رہا ہوں کہ ہندوستان کا ذہن چین اور روس کے ساتھ ہے اور ہندوستانی ادب جب تک یہاں کے لوگ نہیں پڑھیں گے ہندوستان سمجھ میں نہیں آسکتا آج میں نے مصلحت اندیشی کو بالائے طاق رکھ کر ذرا صاف باتیں کیں۔

مہمان خانہ کی مہمانوں والی کتاب میں ہندوستان کے صرف پروفیسر مجیب (جامعہ) کا نام نظر آیا، میں نے بھی اپنے نام کا اضافہ کر دیا۔

ہاں ایک دلچسپ بات۔ میرے ہاتھ میں نقوش (لاہور) کا افسانہ نمبر تھا اس دفعہ نقوش نے خواتین افسانہ نگاروں کی تصویروں کو خاص اہمیت دی ہے کیا بتاؤں کہ سیکڑوں لڑکیوں اور اُدھیڑ پروفیسروں نے اُن تصویروں کو دیکھ کر کتنی محبت اور پیار کا اظہار کیا۔ معلوم نہیں خود قرۃ العین، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور اور حجاب امتیاز علی پر اس خبر کا کیا ردِ عمل ہوگا لیکن میں اُنھیں یقین دلاتا ہوں کہ اظہارِ تحسین ہی نہیں اظہارِ عشق کے بعض طریقوں سے بھی

ان لڑکیوں نے گریز نہیں کیا - کیا خبر یہ ان کی عادت ہے یا پسندیدگی کا اظہار -
ہاں افسوس کے ساتھ یہ بھی کہہ دوں کہ دو ایک کے سوا مرد افسانہ نگاروں کی طرف
کسی نے کوئی توجہ نہیں کی -

کاش میں ٹھیک ہوتا تو یہ دو دن بُرے نہیں تھے ، پھر بھی ساری اُداسی
کے باوجود یہ چھوٹی سی جھیل "فردوس" ، یہ صحت مند ، حوصلہ مند ، مہربان لڑکیاں ،
یہ پرخلوص اساتذہ ، یہ عنایتیں اور خاطرداریاں میرے ذہن میں نقش ہوگئیں -

۱۰ر دسمبر بُدھ - آج صبح کو نارتھمپٹن سے گیارہ میل جنوب لڑکیوں کے ایک
دوسرے مشہور کالج ماونٹ ہولیوک میں ہوں - یہاں بھی وہی باتیں ہیں یہاں
میرے آنے کا باعث مس فلورا لڈنگٹن ہیں جو ہندوستان میں رہ چکی ہیں ،
اُس سے محبت رکھتی ہیں - اور وہاں کے متعلق کتابوں کا اچھا ذخیرہ اُن کے پاس
ہے - یہاں کے اساتذہ سے مِلا ، وہی باتیں ، وہی اُلجھن ، ہندوستان کے متعلق
وہی سوالات ، ہندوستان سے وہی معصوم اور بے قرار دلچسپی —— مِس لڈنگٹن
میرے لئے اخلاق کا مجسمہ بن گئیں - اسمتھ کالج کی طرح یہاں بھی کالج کے ایک
مہمان خانے میں ٹھہرا ، اساتذہ اور لڑکیوں کے ساتھ ڈنر میں شریک ہوا ، باتیں
کیں ، ہنسا اور یہاں کی منظم ، فارغ البال ، دلچسپ زندگی پر رشک کرتا رہا -
تین دن ایک دلربا اور دلنواز ماحول میں گذرے - آج طبیعت بہتر ہے کل صُبح
"بنجارہ" پھر اپنے سفر پر روانہ ہوگا - کہاں ؟ ییل یونیورسٹی ——

۱۲ر دسمبر جمعہ - کل صبح ساڑھے نَو بجے نیوہیون روانہ ہوگیا ، دو گھنٹے کا سفر
پانچ گھنٹے میں ختم ہوا کیونکہ ایک اسٹیشن پر جس ٹرین سے میل ہونا چاہئے تھا

نہ ہو سکا۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش بھی ہو رہی تھی اور کسی قسم کی دلچسپی کا احساس نہ تھا۔ اس یونیورسٹی میں جو مذہبیات کا شعبہ ہے اُس کے ایک پروفیسر نارون ہائن کا پتہ راک فیلر فاونڈیشن سے ہاتھ آگیا تھا، میں نے خود انھیں احتیاطاً نیویارک سے ایک خط لکھ دیا تھا اور ان کا ایک بہت ہی محبت آمیز جواب بھی ماونٹ ہولیوک کالج ہی میں مل گیا تھا۔ اسٹیشن پر اُترتا ہوں تو انھوں نے ہندوستانی چہرہ دیکھ کر بڑھ کر ملاقات کی۔ مجھے یونیورسٹی ہی کے ایک کمرہ میں ٹھہرنے کا موقع ملا مسٹر ہائن بہت ہی دلچسپ اور با اخلاق انسان ثابت ہوئے۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا درس دیتے ہیں، جوان، خوش رُو اور رنگین مزاج ہیں۔ متھرا (ہندوستان) میں دو سال رہ کر وہاں کی زندگی، خاص کر دیشنوی ڈراموں، رہس، کرشن لیلا اور بعض مذہبی رسوم کا مطالعہ کر کے اُس پر ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ لکھ چکے ہیں۔ بہت دیر تک ساتھ رہے، بہت سی باتیں ہوئیں۔ بنگلور کے پروفیسر نِکم (کاف تازی) سے بھی ملاقات ہوئی۔ فلسفہ کے مطالعہ کے سلسلہ میں یہاں مقیم ہیں اور میری ہی طرح یہاں کی زندگی کے سخت ناقد۔ مسٹر ہائن سے ہندوستانی ڈرامہ، نوٹنکی، اندرسبھا وغیرہ کے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں، میں نے اِس سلسلہ میں بعض اطلاعات بہم پہونچانے کا وعدہ کیا ہے۔

آج ان کے غیر معمولی اصرار پر مجھے اُن کے کلاس کو اسلامیات پر لکچر دینا پڑا میں نے کس حد تک اسلام کی صحیح ترجمانی کی ہے نہیں کہہ سکتا۔ دوپہر کا کھانا شعبۂ انگریزی کے اساتذہ کے ساتھ کھایا جس میں پروفیسر وِلک بھی تھے جن کی کتاب THEORY OF LITERATURE مجھے کئی حیثیتوں سے

ہندوستان میں مفید معلوم ہوئی تھی ۔ وہ طلبار کو آج کل کالرج پڑھا رہے ہیں۔ آج اُن کا سیمنار تھا میں اُس میں شریک ہوا اور مجھے اُن کا مطالعہ وسیع معلوم ہوا گو میں ان کی کئی باتوں سے اتفاق نہ کرسکا ۔ اُن کے زیادہ تر حوالے جرمن، سلاقی اور اطالوی ادب سے تھے جن سے میں واقف نہیں ہوں۔ کچھ مختصر سی باتیں بھی اُن سے ہوئیں بعض دوسرے اساتذہ سے بھی ملنے کے اوقات مقرر ہو گئے ہیں ۔

شام کو لائبریری میں پھر مسٹر ہاٹن سے ملا ، اُنھوں نے یونیورسٹی کے اکثر حصّوں کی سیر کرائی یہاں کا جمنیزیم دیکھ کر تو ہوش اُڑ گئے ۔ایک قلعہ کی سی آٹھ منزلہ شاندار عمارت ہے۔ پیراکی کے دو بڑے خوبصورت حوض ہیں جن میں پچاس ساٹھ طلبار برہنہ نہایت اطمینان سے پیر رہے ہیں اور عمارت کے بعض حصّوں میں بے پروائی سے گھوم رہے ہیں ۔ ایک حمام میں سب ننگے کا مطلب یہیں سمجھ میں آتا ہے ۔

۱۴ر دسمبر اتوار ۔ یہاں چند دن اچھے خاصے گذر رہے ہیں۔ کل دن میں پروفیسر آرچر کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ہندوستان کے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں۔ وہ ۱۹۰۸ء سے اس وقت تک کئی بار ہندوستان جا چکے ہیں اب ریٹائر ہو گئے ہیں لیکن یونیورسٹی کی کئی کمیٹیوں کے ممبر ہیں، ایک طرف سکھوں پر ایک کتاب لکھی ہے دوسری طرف پیغمبر اسلام پر ـــــ شام کے وقت میں شہر دیکھنے نکل گیا ۔ وہی بات ہے جو اور شہروں میں ۔ دوکانیں خریداروں سے بھری ہوئی ہیں ۔ بچے اپنی ماؤں کو کھلونوں کی دوکانوں کی طرف کھینچ رہے ہیں اور جوان مرد

اور عورتیں تحائف خریدنے میں مصروف ہیں۔ مصنوعی سدابہار درخت روشنی سے جگمگا رہے ہیں۔ رات میں پروفیسر نکم سے باتیں ہوئیں، کسی قدر مذہبی آدمی ہیں یہاں کی زندگی اور اندازِ نظر سے سخت بیزاری ظاہر کرتے ہیں گو ہمارے نقطۂ نظر مختلف ہیں۔

آج مسٹر ہائن کے ساتھ یہاں کی ایک پہاڑی کی سیر کی، وہاں سے شہر اور سمندر کیسے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ پھر نیچرل ہسٹری میوزیم گیا۔ قدیم جانوروں کے ڈھانچے اور قدیم انسانوں کے تہذیبی کارنامے بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہیں۔ انٹرنیشنل ہاؤس میں بڑے دن کی چائے تھی اُس میں شریک ہوا، بعض ہندوستانی طلباء بھی ملے، بعض تو بالکل یہیں کے ہو سے گئے ہیں۔ رات کا کھانا مسٹر ہائن کے یہاں کھایا۔ موصوف کی اہلیہ نے ناسازیٔ مزاج کے باوجود بڑا اہتمام کیا تھا۔ میاں بیوی خوبصورت، ہم خیال، خوش اخلاق اور مسرور ہیں۔ دس بجے رات تک وہیں رہا۔ مسٹر ہائن کے مقالے کے کچھ حصّے دیکھے، بڑی محنت کا نتیجہ ہیں۔ موسم غنیمت ہے اور میری طبیعت بھی۔

۵ اردسمبر دوشنبہ — آج کی مصروفیتوں کی انتہا نہیں۔ مسٹر ہائن نے اصرار کیا کہ اُن کے طلبا بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، اُن کے بجائے میں پھر کلاس لے لوں، اس میں ایک بج گیا۔ کالج ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا۔ دو بجے مسٹر کلینتھ بروک سے ملنا تھا۔ یہ اس وقت تنقید جدید کے خاص رُکن ہیں۔ بے حد اخلاق سے ملے اور بہت دیر تک یہاں کی تنقید جدید کی خصوصیات کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ اُن کے عالم ہونے اور اپنے خیالات کی بڑی خوبی کے ساتھ

ادا کرنے میں کلام نہیں۔ میں نے بحث کرنے کے بجائے زیادہ تر انھیں کو سُنا۔
اس وقت تنقید جدید کے حامیوں میں دُو گروہ ہو گئے ہیں اور تنقید نگاری کے
اصولوں ہی کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہو رہا ہے اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک
بھدّے طریقے پر تاریخی اسکول کے ہاتھ پھر کسی قدر مضبوط ہو رہے ہیں۔ ساڑھے
تین بجے پروفیسر وِم سیٹ سے ملا، یہ بھی اُسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہاں
بھی باتوں کا انداز وہی تھا۔ وہ خاص طور سے اُن نقادوں کو تنقید نگار ماننے
سے انکار کر رہے ہیں جو محض تاریخی حقائق کی بنیاد پر ادب کو جانچتے ہیں۔ اس
موضوع پر وہ اور کلینتھ بروک مل کر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر وِم سیٹ
کے ساتھ الزبتھن کلب میں چائے پی اور معلوم ہوا کہ وہاں چائے پینا بڑا اعزاز
سمجھا جاتا ہے، خبر نہیں۔

میں سِلی مَین کالج کے مہمان خانے میں مقیم ہوں، آج اس کالج (اسے
ہوسٹل بھی کہہ سکتے ہیں) کے ماسٹر (یا وارڈن) مسٹر گرین نے بڑے دن کی
خوشی میں اِس کالج کے فیلوؤں، پروفیسروں اور اُن کی بیویوں کو ایک
پارٹی دی تھی، از راہ عنایت انھوں نے مجھے بھی مدعو کیا تھا۔ پانچ بجے سے
کاک ٹیل کا سلسلہ شروع ہوا اور تقریباً ساڑھے چھ بجے تک چلتا رہا۔ مجھ سے
بد ذوقوں کے لئے ٹماٹو کے رس وغیرہ تھے۔ بہت سے اساتذہ سے ملاقات
ہوئی جن کے نام بھی یاد نہیں رہ سکتے۔ اس قدر شور، بے تکلف باتیں اور ہنگامہ
تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے بعد کالج کے ڈائننگ
ہال میں ڈنر تھا۔ جب ہم زمین کے اندر ہی اندر سُرنگ میں ہو کر کھانے کے

کمرے میں جارہے تھے تو ایک بوڑھے پروفیسر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ہمارے متعلق اس اوپری زندگی کو دیکھ کر رائے قائم نہ کرنا، ہمارے اندر بھی بہت کچھ ہے، میں نے گردن ہلائی، انھوں نے کہا، معاف کرنا میں بوڑھا ہوں ذرا زیادہ پی گیا ہوں، یہی تو ہمارے خوشی کے دن ہیں۔ اور ہم ہال میں پہونچ گئے۔ کھانا روز کی طرح قطار میں کھڑے ہو کر ترتیب وار مل رہا تھا، آج ہال سجا ہوا تھا، موم بتیوں کی روشنی میں ایک طرح کی قدامت اور مذہبیت تھی ابھی کھانا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ گانا شروع ہوا، دو ایک گانے تک تو اساتذہ، اُن کی بیویاں اور طلبا، کچھ خاموش سے رہے، پھر سب شریک ہو گئے اور مسرّت کی ایک خاص لہر مجھے فضا میں تیرتی ہوئی نظر آئی۔ بڑے دن کا تیوہار واقعی یہاں انہماک سے منایا جاتا ہے۔ اِسے MERRY XMAS یوں ہی نہیں کہتے! اور میری سمجھ میں کوئی لفظ نہیں آ رہا ہے جسے MERRY کا مکمل ترجمہ کہا جا سکے۔

کھانا ختم ہوا، بعض تقریریں ہوئیں کیونکہ مسٹر گرین (جو لاہور فورمین کالج میں کئی سال پڑھا چکے ہیں) اب کسی اور کے لئے جگہ خالی کر رہے ہیں، پھر گانے شروع ہوئے اور اِس ساری تقریب کے خاتمہ پر ایک طالب علم روایتی سینٹا کلاز بنا ہوا، گھنٹی بجاتا، تحائف کا پُشتارہ لئے ہوئے داخل ہوا اور لوگ مسرّت سے چیخ اُٹھے، اُس نے گویا بچّوں کو مخاطب کرتے ہوئے تحائف کا اعلان کیا، بعض کھلونے، بجانے والوں کو، بعض کھلانے والوں کو اور ایک مسٹر گرین کو دیا گیا۔ رخصت ہوتے ہوئے میں نے مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا تو مسٹر گرین نے کہا میں ہندوستان میں اِس سے بہتر اخلاق دیکھ چکا ہوں۔

کل بوسٹن جانا ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی بھی دیکھ لوں اور ڈاکٹر آئی اے رچرڈس کے درشن کر لوں۔

۱۷ / دسمبر بدھ۔ مسٹر ہائن نے اخلاق کی حد کر دی۔ کل صبح اپنی کار لے کر مجھے اسٹیشن پہونچانے کے لئے آ گئے اور جب تک گاڑی چھوٹ نہیں لی ساتھ ہی ساتھ رہے حالانکہ سخت نزلہ میں مبتلا تھے۔ کل بوسٹن کے قریب کیمبرج پہونچ گیا جہاں ہارورڈ یونیورسٹی واقع ہے یہ سارا علاقہ نیوانگلینڈ کہلاتا ہے کیونکہ زیادہ تر انگریز سوِلھویں سترھویں صدی میں یہیں آباد ہونے کے لئے آئے تھے۔ بعض قدیم گرجا گھروں کے علاوہ جگہوں کے نام بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہیں جیسے نیولندن، آکسفرڈ، کیمبرج وغیرہ (ویسے امریکہ کا نقشہ دیکھئے تو پیکین، ماسکو اور برلن بھی مل جاتے ہیں) کل ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا، آج انٹرنیشنل اسٹوڈنٹ سنٹر میں آ گیا ہوں۔

آج دو بجے ڈاکٹر رچرڈس سے ملنے گیا۔ موصوف موجود نہیں تھے، سکریٹری نے کہا اگر آپ سے وعدہ ہے تو آتے ہی ہوں گے۔ مجھے لے جا کر موصوف کے کمرے میں بٹھا دیا۔ شدید برف باری تھی اور لکڑی کے اس مکان میں کافی ٹھنڈک تھی، تعجب ہے اس میں مکان کے گرم کرنے کے لئے گیس کا انتظام نہ تھا، انگیٹھی بجھی پڑی تھی۔ میں نے تین چار منٹ کمرے کا جائزہ لیا ہوگا کہ ڈاکٹر رچرڈس داخل ہوئے، چند منٹ دیر ہو جانے کی معذرت کی اور دو ایک رسمی جملوں کے بعد خود ہی ایک طرف سے کوئلہ اور لکڑیاں لائے، روشن دان میں آگ روشن کی، اور قریب ہی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے،

مجھے بھی قریب بُلالیا، کبھی ہاتھ سینکے کبھی پیٹھ ——— میں نے کیمبرج یونیورسٹی کے اس عالم کی کتابیں پڑھ کر جو تصویر ذہن میں بنائی تھی وہ اُس سے مختلف نکلا۔ متوسط انداز کا جسم لیکن مضبوط اور چُست، آنکھوں میں چمک، بُشرے میں سنجیدگی اور ذہانت، وہ سنجیدگی نہیں جو رُوکھا پن پیدا کرتی ہے۔ خلیق، گرم جوش اور دلچسپ گفتگو کرنے والے۔

یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں تنقید کے متعلق ڈاکٹر رچرڈس کے اکثر و بیشتر خیالات سے متّفق نہیں ہوں، پھر بھی اُن سے ملنے کی سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔ نیو یارک ہی سے خط لکھ کر میں نے وقت مقرر کر لیا تھا۔ ایک آدھ باتوں کے بعد میں نے پوچھا آج کل آپ کچھ لکھ رہے ہیں؟ کہنے لگے، براہ راست تنقید پر تو کچھ نہیں لکھ رہا ہوں، بہت دنوں سے یہ کوچہ چھوٹا ہوا ہے لیکن میں تنقید کے اس پہلو پر ضرور غور کر رہا ہوں جس کا تعلق طریقۂ تعلیم سے ہے۔ یعنی میں اِس پر غور کر رہا ہوں کہ کسی نظم یا عبارت کا مطلب اچھی طرح پڑھنے والے کی سمجھ میں کیسے آسکتا ہے۔ میں بیچ بیچ میں اختلاف کے لئے نہیں وضاحت کے لئے بعض سوال پوچھ لیتا تھا، زیادہ تر وہی گفتگو کرتے رہے۔ اسی سلسلہ میں اچھے پڑھانے والوں کا ذکر آگیا تو کہنے لگے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم میں بہت سے نقائص ہیں اور سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اچھے ذہین نوجوان تعلیم کے شعبے میں کم آتے ہیں۔ اس کے متعلق ان کے پاس اعداد و شمار بھی تھے اور اُن کا تجزیہ کر کے اُنھوں نے کہا کہ مشکل سے کوئی بیس فی صدی اوّل درجے کے ذہین محکمۂ تعلیم میں ملازمت کرتے ہیں کیونکہ یہاں اُنھیں مستقبل کچھ زیادہ اُمید افزا

نہیں معلوم ہوتا اور جب اچھے پڑھانے والے نہ ملیں تو سمجھنا چاہیئے کہ تہذیب کی موت ہے (جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو میرا ذہن بار بار ہندوستان پہونچ جاتا تھا) غیر ملکی زبانیں سکھانے کے جس نئے طریقے پر وہ اس وقت کام کر رہے ہیں وہ موصوف نے مجھے پروجکٹر کی مدد سے سمجھایا۔ وہ جس نظری اور سماعی طریقے کا ذکر کر رہے تھے اُس کے مفید ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن ہندوستان ایسے مفلس ملک میں اس سے کتنی مدد لی جاسکتی ہے!

تعلیم میں تنقید سے کس طرح مدد لی جائے اُس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر رچرڈس نے کہا ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ جس تہذیب پر ہمارے ادب اور ہماری زندگی کی بنیاد ہے اُسے بچّے بھی سمجھیں۔ وہ افلاطون اور ارسطو کو آسانی سے سمجھ نہیں سکتے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ارسطو اور افلاطون کے بنیادی خیالات کو کم سے کم الفاظ میں اور آسان سے آسان زبان میں ذہن نشین کرایا جائے۔ جب وہ اسے سمجھ لیں گے تو شیکسپیر، ملٹن اور ورڈسورتھ کو بھی سمجھ سکیں گے۔ یہاں اُنھوں نے "بنیادی انگریزی" کا ذکر کیا۔ یہ بھی کہا کہ تنقید کے بڑے بڑے اصول بن چکے ہیں اور بن رہے ہیں لیکن جب تک ابتدائی تعلیم کے ساتھ اُسے شروع نہ کیا جائے اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی بنیادی انگریزی میں، جس میں وہ صرف گیارہ سو الفاظ استعمال کرتے ہیں اُنھوں نے ہومر کی ایلیڈ، افلاطون کی ریاست اور چند دوسری کتابوں کے بنیادی مفہوم مختصر کرکے پیش کئے ہیں۔ چند کتابیں اور رسائل موصوف نے مجھے بھی عنایت کئے۔ جس طرح وہ باتیں کرتے اور اپنے مفہوم کو واضح کرتے ہیں،

اُسے دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ اس کا گہرا اثر اُن کے طلبا پر ہوتا ہوگا۔ اس سال وہ PUETRY & SCIENCES پر لکچر دے رہے ہیں اور اپنی پہلی مختصر کتاب SCIENCE & POETRY کو گویا بہت تبدیل کر کے دوبارہ شائع کرانا چاہتے ہیں۔ اُن سے مل کر احساس ہوا کہ ایک اچھے استاد اور اچھے عالم سے ملاقات ہوئی۔ کل اپنے ایک کلاس میں آنے کی دعوت دی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ جون میں انگلستان جاؤں گا، موقع ہو تو مجھ سے کیمبرج میں ملنا۔

اچھی خاصی عمر کے باوجود پھرتیلے، پرجوش اور سیماب وش ہیں۔ جلد جلد جگہ بدلتے ہیں۔ کسی نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ میاں بیوی دونوں پیدل چلنے اور پہاڑوں پر چڑھنے کے ماہر ہیں۔

۱۹ دسمبر جمعہ ۔ کل ڈاکٹر رچرڈس کے کلاس میں نہ جا سکا کلاس نو بجے تھا مجھے دیر ہوگئی تھی۔ دس بجے پروفیسر بیٹ کے کلاس میں البتہ شریک ہوا تنقید کے متعلق اس سشن کا اُن کا آخری لکچر تھا، میں کچھ زیادہ لطف اندوز نہ ہوسکا۔ اُن سے باتیں بھی تھوڑی ہی دیر کے لئے ہوئیں، موقع ملا تو پھر ملوں گا۔ شام کو ہارڈرو یونیورسٹی لائبریری اور آرٹ میوزیم دیکھا۔ اس لائبریری کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ کل ملا کر یہاں چھیاسٹھ لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں۔

آج دن یونہی گذر گیا، غالباً ایک ہفتہ یونہی گذرے گا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کرنا ہے۔ پڑھنے لکھنے میں زیادہ جی نہیں لگ رہا ہے لوگوں سے ملتے ملتے اُکتا بھی گیا ہوں لیکن اگر نہ ملوں تو وقت نہیں کٹتا یونیورسٹی بند ہو چکی ہے ملوں تو کس سے ملوں۔ یہاں اس اُمید میں ٹھہر گیا ہوں کہ ۲۷ دسمبر سے امریکہ کی

مشہور علمی اور ادبی انجمن MODERN LANGUAGES ASSOCIATION کا سالانہ اجلاس بوسٹن میں ہو رہا ہے۔ شاید دلچسپی کی صورت پیدا ہو۔ جو مضامین پڑھے جانے والے ہیں اُن میں سے کچھ ہی ایسے ہیں جن سے مجھے دلچسپی ہے اور اُن میں سے بھی اکثر کے اوقات متصادم ہیں۔

ہاں رات کو البتہ کچھ لطف آ گیا۔ ہندوستانی طلباء نے ایک چھوٹی سی صحبت ایک کیتھولک گرجا گھر میں ترتیب دی تھی وہاں چلا گیا اور کئی ہندوستانیوں سے ملاقات ہوئی۔ بعض جہاں دیدہ پروفیسر بھی ہیں جو یہاں لکچر دے رہے ہیں اُن کا خیال ہے کہ سائنس کے علاوہ اور دوسرے شعبوں میں یہاں سے بہت نہیں سیکھنا ہے۔ دو ڈھائی گھنٹہ یہ صحبت رہی، کچھ اُلٹے سیدھے ناچ گانے اور زیادہ تر باتیں۔

۲۲ دسمبر دوشنبہ ـ کیمبرج ہی میں قیام ہے۔ انٹرنیشنل اسٹوڈنٹ سنٹر میں بڑے دن کی وجہ سے ہنگامہ رہتا ہے بہت سے ہندوستانی طالب علموں سے ملاقات ہوئی، بعض پریشان ہیں کہ یہاں کی سالہا سال کی محنت کے بعد ہندوستان میں کوئی ملازمت بھی ملے گی یا نہیں۔ اُن کے جو دوست یہاں سے جاتے ہیں اپنی پریشانی لکھتے ہیں۔ بعض تو یہیں رہ جانے کا قصد کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی بیکاری کو دیکھتے ہوئے اُنھیں کیا مشورہ دوں۔ عام طور سے یہ طلبا ہندوستان کی سیاسی پالیسی کی تنقید یہاں نہیں کرتے بلکہ اپنے اپنے انداز میں اُس کے مبلّغ ہیں۔ بعض ضرور یہاں کی زندگی میں کھو گئے ہیں۔ تقریباً ہر ملک کے لوگ ملتے ہیں اور کسی قدر وقتی اور سطحی طور پر گھل مل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

فطری طور پر ایسی جگہوں میں لڑکیاں زیادہ توجہ کا مرکز بنتی ہیں اور فضا میں بڑا فرق پیدا کر دیتی ہیں، وہ اتنی بیباک، شوخ اور سہل الحصول نہ ہوں تو صحبتوں کا یہ مصنوعی اور سطحی انداز اور کھلنے لگے۔

کئی دن سے پنجاب کے ایک ڈاکٹر نواز بھی یہیں مقیم ہیں، معقول، فرض شناس اور پُرجوش ہیں۔ پاکستان کی مرکزی حکومت کی طرف سے یہاں کی صنعت پارچہ بافی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ میں کانفرنس کے انتظار میں رُکا ہوا ہوں۔ بیس روز سے زیادہ ہو گئے بیوی بچوں کا حال نہیں معلوم ہوا۔ یہ سخت آزمائش ہے لیکن جانتا ہوں کہ گھبرانے سے کچھ حاصل نہیں اب یہاں تین مہینے سے بھی کم رہنا ہے۔ آج دن بھر برف گرتی رہی۔

۲۵ر دسمبر جمعرات — اب تک تو یہ خیال تھا کہ گھر کے خط نیویارک سے آجائیں گے لیکن یہ امید ختم ہو گئی۔ نیویارک سے ڈاک آئی صرف تین خط ہیں، گھر کی کوئی خبر نہیں۔ آخر میرے خطوں کو کیا ہو گیا ہے، یہ تو یقین نہیں کہ وہاں سے کوئی خط لکھا ہی نہیں گیا۔ بڑی اُلجھن ہے۔ پھر انتظار اور پریشانی!

کئی دن یہاں عجب رنگ میں گذرے، بہت کچھ لکھنے کو ہے لیکن طبیعت آمادہ نہیں معلوم ہوتی۔ گفتگو اشاروں میں بھی تو ہو سکتی ہے! بڑے دن کے سلسلہ میں سیکڑوں آدمیوں۔ مردوں اور عورتوں سے ملنے کا موقع ملا، کچھ وقت اچھا گذرا کچھ حماقتوں میں۔ تقریباً سبھی ملکوں کے لوگوں سے صاحب سلامت ہوئی، باتیں ہوئیں، بہت گہری نہیں بہت واضح نہیں، پھر بھی اُن میں غور و فکر کے لئے کافی سامان تھا۔ سب سے زیادہ صحبت لبنان اور یردن کے عیسائی، عربوں کے

ساتھ رہی اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ وفاقی بنیاد پر ایک عرب جمہوریہ کے دلدادہ ہیں، انھیں اُن عیسائی اور مُسلم قائدین سے نفرت ہے جو اپنے فائدے کے لئے کبھی سیاسی اور معاشی مسائل کو مذہبی رنگ دیتے ہیں اور کبھی خلیج کے وسیع تر کرنے میں مختلف سامراجی اور سرمایہ دار ملکوں کے پٹھو بن جاتے ہیں۔ انھیں اسرائیلی حکومت کا قیام عرب قوت کو پارہ پارہ کرنے کی چال کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ ذہین، پُرجوش اور بے تکلف ہیں ان میں سے ہر ایک جدید ادبی تحریکات سے کافی دلچسپی لیتا ہے۔ خلیل جبران کے متعلق مجھے انھیں سے معلوم ہوا کہ وہ اتنا ہی بڑا مصوّر بھی تھا جتنا بڑا صاحب قلم۔ اُنھیں یہ معلوم کرکے تعجب اور خوشی کا احساس ہوا کہ جبران کی تقریباً تمام تحریریں اُردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ توفیق الحکیم اور محمد خالد مصری کی کتابوں کا ترجمہ بھی عرب ذہن کے سمجھنے میں مدد دے گا۔

ایک بات ہر جگہ کے لوگوں نے کہی۔ لبنانی، یہودی، عراقی، آئس لینڈی، فرانسیسی، سبھی نے کہا کہ طویل قیام کے باوجود ان کے تعلقات امریکہ کے لوگوں سے بہت سطحی، وقتی اور ظاہری ہیں ــــ اگر ذہن پر بوجھ نہ ہوتا تو یہ صحبتیں سطحی ہونے کے باوجود زیادہ دلچسپی کا سامان فراہم کرتیں یہ لکھ رہا ہوں اور دِل سوال کرتا ہے کہ تم ہندوستان ہی میں کب ایسی صحبتوں سے پوری طرح لُطف اندوز ہوتے ہو! میرے پاس جواب نہیں۔

آج دوپہر کا کھانا ایک امریکی دیہاتی گھر میں کھایا۔ پانچ آدمیوں کا مختصر سا خاندان، مہمان نواز، خوش اخلاق اور دلچسپ ــ ہندوستان کے متعلق

وہی سوالات، امریکہ کے متعلق وہی باتیں۔

کل بوسٹن کی بعض عمارتیں دیکھیں اور مشہور آرٹ میوزیم — کوئی بہت نادر اور تاریخی چیز تو نظر نہ آئی لیکن پھر بھی نوادر کا بہت بڑا ذخیرہ یہاں موجود ہے۔ ہر یونیورسٹی اور ہر بڑے شہر میں ایسے ہی چھوٹے بڑے میوزیم ہیں۔

۲۸ر دسمبر اتوار — کل صبح سویرے بوسٹن میں جدید زبانوں کی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے نکل کھڑا ہوا کانفرنس بوسٹن کے بہت عظیم الشان ہوٹل اسٹیٹلر میں منعقد ہوئی جسے سجایا گیا تھا۔ وہاں سیکڑوں انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، ہسپانوی کے اساتذہ، علماء، مصنف اور ناشر موجود تھے، مجھے بھی ڈیلیگیٹوں کا پاس مل گیا۔ کام بہت اور وقت کم، اس لئے کئی جلسے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے بعض میں شرکت کی، انگریزی شاعری پر چند اچھے مقالے پڑھے گئے افسوس ہے کہ آخری مقالہ جو امریکہ کے مشہور نقّاد ایلن ٹیٹ پڑھنے والے تھے نہیں پڑھا جا سکا، نہ خود آئے نہ مقالہ بھیجا۔ اور مقالے عالمانہ تھے۔ ہر ایک نے ۱۹۴۰ء کے بعد کی شاعری کی بنیادی خصوصیت سے بحث کی تھی۔ زیادہ تر مقالوں میں سماجی مسائل کو نظر انداز کیا گیا تھا بعض اور جلسوں میں بھی شریک ہوا۔ کانفرنس کیا تھی ایک بہت بڑا میلہ تھا جس میں لوگ ایک دوسرے سے ملنے آئے تھے۔ مجھ سے بھی بعض حضرات سے ملاقات ہوئی۔ خواتین کی بھی تعداد کم نہیں تھی لیکن زیادہ تر یا تو تماشائی کی حیثیت سے شریک تھیں یا خود تماشا تھیں۔ کتابوں کی نمائش بھی ہو رہی تھی مگر مختصر۔ اس جلسہ پر بھی نشستند و گفتند و برخاستند کی مثل صادق آتی ہے۔ اس کے عظیم الشان

ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن یہ محض کھاتے پیتے لوگوں کا ہنگامہ ہے۔ سُننے والوں میں ایسے لوگ شائد ہی دو چار رہے ہوں گے جنھیں پبلک کہا جا سکے حالانکہ بعض جلسوں میں اُنھیں آنے کی اجازت تھی۔

شام کو قیام گاہ میں واپس آیا تو طبیعت بے حد تھکی ہوئی اور سُست تھی۔ گھر کے، بہت سے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے خط نیویارک سے آگئے تھے انھوں نے بھی بحال نہیں کیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں بیمار ہوں۔ سونے کی کوشش کی مگر نہ جانے کیوں مجھے امریکہ میں ٹھیک سے نیند نہیں آتی۔ آج صبح دس بجے تک پڑا رہا۔ کانفرنس میں نہیں گیا، کوئی دلچسپ پروگرام بھی نہیں تھا۔ چند خط لکھے اور زیادہ تر اخبار پڑھتا رہا، دو تین ہندوستانی آگئے بہت اچھی گھریلو قسم کی باتیں ہوئیں۔ کل طبیعت ٹھیک رہی تو پھر کانفرنس میں شریک ہوں گا اور شام کو نیویارک چلا جاؤں گا۔

۳۰، دسمبر منگل ۔ کل کانفرنس میں شریک ہوا اور دوپہر تک پانچ مضامین امریکی تنقید کے مختلف پہلوؤں پر سُنے، میرا یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ امریکہ کی جدید تنقید راستہ سے بھٹک گئی ہے وہ نہ جانے کن گہرائیوں میں اُتر کر نہ جانے کن حقائق کی جستجو کرنا چاہتی ہے اُس کے قدم زمین پر نہیں ہیں۔ ایک بڑا جھگڑا یہاں اس بات کا چل رہا ہے کہ نقاد کو بنیادی خیالات (جو تاریخی زمان و مکان میں پیدا ہوتے ہیں) کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہیے یا نہیں۔ زیادہ تر جواب نفی میں ہے لیکن اُن مذہبی اور اخلاقی اقدار کے لئے نہیں جو مابعد الطبیعاتی ہیں۔ بہرحال مجھے بے حد خوشی ہے کہ اتنی بڑی کانفرنس میں شریک ہونے کا

موقع مجھے مل گیا ۔ کئی اساتذہ جن سے مختلف یونیورسٹیوں میں مِل چکا تھا یہاں پھر مل گئے اِس کانفرنس کی حیثیت ہندوستان کی اورنٹیل کانفرنس کی سی ہے، اِسی میں اور بہت سے اداروں کے جلسے ہوتے رہتے ہیں اور نئے سال کے لئے انتخابات ہوتے ہیں ۔ شام کو میں نیویارک کے لئے روانہ ہوگیا ۔

نیویارک وہی ہے ، اِس کے سوا کہ جگہ جگہ بہت آراستہ معلوم ہوتا ہے اور کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی ۔ آج میں راک فیلر سنٹر گیا ، گل پیٹرک سے ملاقات نہیں ہوئی ، کچھ خط وغیرہ مل گئے ۔ میرا معدہ مجھے الجھن میں مبتلا کررہا ہے یہاں اتفاقاً تین ہندوستانی ڈاکٹر مل گئے ، انھوں نے تمام باتیں سُن کر ہمدردانہ کہا ، کچھ بھی نہیں ہے فکر نہ کرو ۔ کھانے پینے میں احتیاط برتو پھر بھی میں احتیاطاً کل کسی ڈاکٹر سے مشورہ کروں گا ۔ سوچتا ہوں کہ کناڈا جانے کا پروگرام ملتوی کردوں، وقت ہوا تو مارچ میں دیکھا جائے گا ۔ وِلفرڈ اِسمتھ کا بہت ہی محبت آمیز خط آیا ہے مگر سوچتا ہوں کہیں بیمار نہ ہو جاؤں ۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ محض ذہنی کیفیت ہے مگر پھر بھی ۔

یکم جنوری ۱۹۵۳ء جمعرات ۔ رات ایک سال اور ختم ہوا ، گرجا گھر کے گھنٹوں ، ریل کی سیٹیوں اور شوروغُل نے اس کا اعلان کیا ۔ مِلوں کے بھونپو ، شہر کے سائرن سب بارہ بج کر ایک منٹ پر چیخے ۔ مجھے بھی ایک خوشگوار سا احساس ہوا کہ نیا سال شروع ہوگیا ۔ پھر خیال آیا کہ آخر اس تبدیلی کی نوعیت کیا ہے ؟ کیا آج کی صبح کل کی شام سے کٹ کر الگ ہوگئی ہے ؟ کیا آج کل سے جدا کوئی معنی رکھتا ہے ؟ کیا وقت کے مسلسل بہاؤ میں اس معمولی سے مفروضے کی کوئی

حقیقت ہے ؟ پھر بھی کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نئے وجود نے جنم لیا ہے اور ہمارے سامنے مستقبل ایک سادہ ورق کی طرح ہے۔ گو غور کیا جائے تو مستقبل ماضی ہی کا تسلسل ہے، اُسی کا زائیدہ ہے اور اُس کے اثرات سے بالکل محفوظ نہیں رہ سکے گا تاہم انسان کے اندر بہتر بننے، دنیا کو بہتر بنانے اور دیکھنے کی جو خوبصورت خواہش ہے وہ چاہتی ہے کہ نیا سال اپنے پیش رو سے بہتر اور حسین تر ہو۔ زندگی کو بہتر اور حسین تر بنانے کے لئے وقت کے اس تسلسل کو توڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے ایک جذبہ، ایک یقین اور ایک عزم کی ضرورت ہے پھر وقت کے ہاتھوں پر ایک ایسا چراغ جل اُٹھے گا جسے تاریخ بُجھا نہ سکے گی۔ اسی لئے نیا سال نئے امکانات اور نئی اُمیدوں کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ کوئی پیچھے مُڑ کر دیکھے تو گذرے ہوئے سال میں سیاہ راتیں اور سُنہرے دن دونوں دکھائی دیں گے اور ہم غور کریں تو دونوں کی نوعیت سمجھ بھی سکتے ہیں۔ زندگی کا سفر اس نئے سال کے ساتھ کسی منزل پر نہیں پہونچتا۔ خزاں اُسی طرح مُنہ پھاڑے درختوں کو کھا رہی ہے لیکن اندر ہی اندر بہار اور نمو کی وہ طاقت بھی سرگرم کار ہے جو کل خزاں کا گلا گھونٹ دے گی۔ یہ فطرت کا اندرونی عمل ہے۔ انسانی شعور بھی حالات کو اس طرح ترتیب دے سکتا ہے کہ وہ انسانیت کے لئے سازگار ہوں۔ میں اسی امید پر نئے سال کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ جنگ کے پُجاری اَمن کے حامی بنیں گے، موت کے سوداگر زندگی کا بیوپار کریں گے اور انسان اِنسان کو آزاد زندگی بسر کرنے کا حق دے گا۔ یہی نئے سال کا خوشگوار احساس ہے۔

کل دن بھر برف گرتی رہی لیکن دن اچھا گذرا کیونکہ بمبئی کے شہاب الدین دیسوی

اور کراچی کے مصباح الحق صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ وائی ایم سی اے میں رقص و سرود کی محفلیں گرم تھیں لیکن ہم نے اپنے تاثرات پر تبادلۂ خیال کیا اور وطن کی یاد کو گلے لگایا۔ آج انھیں لوگوں کے ساتھ نیچرل ہسٹری میوزیم اور ہیڈن پلینٹوریم دیکھا۔ میں ستاروں اور سیاروں سے کم واقف ہوں لیکن یہاں بہت سی باتیں سمجھ میں آئیں۔ آسمان پر ستاروں کی رفتار، جگہوں میں تبدیلی مشینوں کی مدد سے اس خوبی سے دکھاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور اپنی لاعلمی پر شرمندگی کا احساس ہوتا ہے انھیں دوستوں کے ساتھ سینما میں بھی وقت گذاری کی۔ آج موسم اچھا تھا، میری طبیعت بھی بہتر تھی۔

۳ر جنوری سینچر ۔ مسٹر گل پیٹرک سے ملا اور دیر تک باتیں ہوئیں۔ انھیں اِس بات کی اطلاع پہونچ چکی ہے کہ میں نے کہاں کیا باتیں کیں جانتا ہوں کہ بعض باتیں یہاں کے لئے، یہاں کی عام نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے ٹھیک نہیں تھیں لیکن آدمی کہاں تک ہونٹ سئے ہوئے رہ سکتا ہے۔ اُنھوں نے بڑی خوبی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ حالات ایسے ہیں کہ میں یقیناً احتیاط کروں گا۔ میں نہ یہاں مبلّغ بن کر آیا ہوں نہ مُصلح۔

میں نے طے کر لیا ہے کہ جنوری میں کناڈا نہیں جاؤں گا طبیعت بحال رہی تو مارچ میں دیکھا جائے گا۔ اب ۱۲ر جنوری تک شکاگو جاؤں گا۔ اِس درمیان میں یہاں کیا کروں گا سمجھ میں نہیں آتا۔

۵ر جنوری دوشنبہ ۔ دو تین دن سُست رہا، معدہ کی خرابی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر کو دکھایا وہ کہتا ہے کچھ نہیں ہے، سب کچھ کھاؤ، ایک مکسچر دیا ہے۔

کیا خاص تکلیف ہے یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ سلسلہ لگا رہے گا۔ کچھ خطوط لکھے، کچھ پڑھتا رہا، کچھ ٹہلا۔ موسم ایسا بے کیف ہے کہ اس کی اُلجھن الگ ہے۔
کل شام کو تھوڑی دیر کے لئے محمد کاظم صاحب مع اپنی اہلیہ کے آگئے۔ دلچسپ باتیں کرتے رہے اس میں جی بہلا رہا۔ اُن کا تقاضہ ہے کہ سید صاحب! آپ یہاں آئے ہیں تو ہر چیز دیکھ لیجئے، دنیا میں ایسی جگہ کوئی نہیں ہے، میں کہتا ہوں ضرور، جی ہاں، میری بھی یہی خواہش ہے لیکن انھیں کیسے بتاؤں کہ میں کیسی تنہائی محسوس کر رہا ہوں۔

آج فاونڈیشن کے دفتر گیا۔ مسٹر گل پیٹرک دو مہینے کے لئے جاپان، ہندوستان اور پاکستان کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ میں دوسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر مسٹر مارشل سے ملا اور کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آج ہندوستان سے جو خطوط بھی ملے ہیں اُن سب میں ایک پُراسرار روشنی یا "اُڑن تشتری" کا تذکرہ ہے۔ فضا میں ایسے کھیل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اِدھر ایک دلچسپ کتاب دیکھی، کتاب تو نہ پڑھ سکا اُس کا ریویو دیکھا۔ ایک امریکی خاتون نے چارلس ڈکنس پر ایک کتاب لکھی ہے، اُس میں اُس کے خطوط وغیرہ بھی جمع کئے ہیں۔ تبصرہ نگار نے جس بات کی سب سے زیادہ داد دی ہے وہ یہ ہے کہ جب ڈکنس امریکہ آئے تھے تو یہاں اُن کا جی نہیں لگا، یہاں سے واپس جا کر انھوں نے جو کچھ لکھا اُس میں امریکہ کی سخت تنقید تھی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب انھوں نے لندن چھوڑا اُس وقت بُری طرح ایک خاتون کے عشق میں مبتلا تھے اور اُس سے دُوری کی تلخی اور غم کا اظہار ڈکنس نے امریکہ سے نفرت کا اظہار کر کے کیا۔ چلئے فیصلہ ہوگیا۔

یہاں کی زندگی میں کوئی نقص نہیں نقص دیکھنے والے کی آنکھ میں تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ تبصرہ نگار بڑی دُور کی کوڑی لایا ہے۔

آج رات سلون ہاؤس ہی میں ایف بی آئی کی تنظیم اور کارگذاری کے متعلق ایک فلم اپنی معلومات کے لئے دیکھی دو تین ہندوستانی طالب علموں سے ملاقات ہوئی، اپنی تعلیم ختم کر کے واپس جا رہے ہیں۔

۷ رجنوری بُدھ ۔ شہر میں پہلی جنوری سے بس اسٹرائک ہے۔ مجھے تو بظاہر کچھ زیادہ اثر یہاں کی زندگی پر نہیں معلوم ہوتا۔ ہائی اسکولوں کے طلباء البتہ کچھ دشواری محسوس کر رہے ہیں دوسری اہم بات مسٹر چرچل کا وُرود ہے۔ وہ ٹرومین سے رخصت ہونے اور آئزن ہاور سے یورپ اور امریکہ کے تعلقات پر گفتگو کرنے کے لئے آئے ہیں یہاں کے اخباروں نے مختلف شکلوں میں اسے کافی اہمیت دی ہے۔

کل ولیم کلفرڈ سے ملنے سلور برڈٹ کمپنی گیا وہاں نصاب کی کتابیں چھپتی ہیں اُن کتابوں کے مرتب کرنے کا کام جس طرح ہوتا ہے اُس سے واقفیت حاصل کی۔ کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر سے بھی ملاقات ہوئی، وہاں محض آخری نام سے لوگ جانے جاتے ہیں، حسین کی وجہ سے وہ مجھے اختر حسین رائے پوری (پاکستان کے محکمۂ تعلیم کے افسر) یا ہندوستان کے محکمۂ تعلیم کا سید اشفاق حسین سمجھ کر بڑے اشتیاق سے ملے کہ شاید اِن سے کچھ کام ملے گا۔ اُن لوگوں سے مِل چکے ہیں، صورت یاد نہیں تھی، اس غلط فہمی میں بڑا لطف آگیا۔ اُن کے ہاں پاکستان حکومت کی فرمائش پر نصاب کی بعض کتابیں اُردو میں شائع ہو رہی ہیں۔ میں سوچتا ہوں کیا پاکستان کے لکھنے والے اور پاکستان کے ناشر اس کام کو انجام نہیں

دے سکتے تھے؟ ہمارے اُردو کے پبلشروں کا کیا انجام ہو گا؟

کلفرڈ نے کہا تھا کہ کل رات کو ساتھ کھانا کھائیں گے، ایک پاکستانی دوست سے بلاؤں گا۔ میں اور وہ صاحب، جو یہاں پانچ سال سے مقیم ہیں، کلفرڈ کے فلیٹ پر اکٹھا ہوئے، پھر ایک ہسپانوی ریستراں میں کھانا کھانے گئے، کھانا مہنگا لیکن عام کھانوں سے مختلف تھا بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ کلفرڈ کھانا کھِلا رہے ہیں لیکن جب دام دینے کا وقت آیا تو سب نے اپنے اپنے دام دئے یہاں اِس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ آج طبیعت بحال ہے، خطوط لکھے اور پڑھتا رہا۔ موسم اچھا ہوتا تو گھومتا پھرتا۔

۱۰؍جنوری سنیچر۔ چار دن سے موسم ذلیل ہے۔ مسلسل بارش ہو رہی ہے۔ یہاں کے لوگ جو اس کے عادی ہیں وہ بھی خوش نہیں۔ دو دِن تو میں کہیں نہیں نکلا ورنہ دو ایک ناشروں سے ملنے کا خیال تھا۔ کل راک فیلر فاونڈیشن گیا۔ ڈاک لایا، آئندہ کے متعلق ہدایتیں دیں، سفر خرچ لیا اور اسی بارش میں پھرتا رہا۔ مسٹر مکتی مکرجی اور مسٹر تھمیّا سے ملاقات ہوئی، مکرجی کا تعلق حکومت ہند کے انجینیرینگ کے شعبے سے ہے بہت سی باتوں میں ہم خیال ہیں اور اسی طرح واپس جانے کے خواہش مند ہیں جیسے میں۔ مسٹر تھمیّا حکومت میسور کی طرف سے لنگڑے، لولے، اندھے، بہرے بچّوں کی تعلیم کے مسئلہ پر یہاں کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ بہت سے حصّوں میں ہو آئے ہیں، بہت سے خیالات اکٹھا کئے ہیں لیکن ہندوستان میں ان پر عمل درآمد کیسے ہو گا، اس کے متعلق اُلجھن میں ہیں۔

آج کا سارا دن کاظم صاحب کے یہاں گذرا۔ موصوف کی باتوں میں وقت

خوب کٹتا ہے۔ انھیں میری مالی حالت کا اندازہ نہیں مُصر ہیں کہ یہاں سے کار، ریفری جریٹر، ٹیپ ریکارڈر، پروجکٹر، کھانا پکانے کے مختلف برتن، بہت سے کپڑے ساتھ لے جاؤں، شام کو انھیں کے ساتھ پنجاب کے مسٹر نذیر پراس کے یہاں گیا وہ گھر سے ناخوش ہو کر ۱۹۱۳ء میں یہاں آئے تھے اب اگلے سال ڈاکخانہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے والے ہیں۔ بہت تواضع کی، موقع ملا تو پھر ملوں گا۔ میں ان لوگوں کی ہمت، صبر اور استقلال کا قائل ہو گیا۔

اِدھر کچھ دنوں سے روزانہ اٹیم کا راز افشا کرنے والے مفروضہ مجرمین جولییس روزن برگ اور اُس کی بیوی ایتھل کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ ہر عدالت اُنھیں سزا دیتی جا رہی ہے، کہیں کہیں سے احتجاج کی آواز بھی بلند ہو رہی ہے۔ پروفیسر یورے اور آئن سٹائن نے بھی ان کی موافقت میں بیانات دئے مگر امریکہ پر اس کا کیا اثر ہو گا۔ امریکہ جو اپنے سائے سے بھی بھڑک رہا ہے۔

۱۲ار جنوری دوشنبہ ۔ آج شکاگو میں ہوں۔ امریکہ کا دوسرا شہر، آبادی ۳۷ لاکھ، دنیا میں سب سے بڑا گوشت کا بازار، سب سے بڑا ریلوے یارڈ، مشینیں، کارخانے، بہت بڑی یونیورسٹی، جرائم کا بہت بڑا مرکز اور نہ جانے کیا کیا خصوصیتیں ہوں گی۔ انٹرنیشنل ہاؤس بہت بڑا ہے اس لئے کیمبرج والے انٹرنیشنل سنٹر سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ یہاں دلچسپیوں کے سامان بھی بہت ہیں۔ آج یہیں اٹلی کی مشہور فلم BIC YCLE TIHEF دیکھی۔ اپنی حقیقت پسندی اور کمال اداکاری کے لحاظ سے یقیناً حیرت خیز ہے۔ صرف دو کردار ساری کہانی پر حاوی ہیں۔ خاص کر بچّے کی اداکاری بہت دنوں تک ذہن پر نقش رہے گی۔

آج یہاں دو پروفیسروں سے مل لیا۔ مسٹر رابرٹ کرین (شعبۂ تاریخ) ہندوستان میں رہ چکے ہیں، کانگریس پر مقالہ لکھ چکے ہیں اور مطالعہ کے لئے آیندہ سال پھر جا رہے ہیں۔ فلسفہ کے پروفیسر چارلس مارِس سے صرف فون پر گفتگو ہو سکی وہ کل باہر جا رہے ہیں۔ شائد مارچ میں نیویارک میں ملیں۔

نیویارک سے شکاگو پندرہ سولہ گھنٹے کا راستہ ہے۔ فاصلہ تقریباً نوسو (۹۰۰) میل ہے۔ ٹالیڈو پہونچ کر گھڑی ایک گھنٹہ پیچھے ہٹانی پڑی۔ کچھ دُور اور مغرب چل کر ایک گھنٹہ اور گھٹے گی اور کیلی فورنیا پہونچ کر ایک گھنٹہ اور —— اِس طرح امریکہ کے اندر چار وقت ہیں۔ شکاگو کے قریب پہونچتے ہی بڑی بڑی لوہے کی فیکٹریاں، سیمنٹ کے کارخانے اور متعدد قسم کے کاروبار نظر آنے لگتے ہیں۔ یہاں ۲۲ جنوری تک رہنے کا ارادہ ہے دیکھوں کیا کیا دیکھ سکتا ہوں اور کیسی گذرتی ہے۔

آج کے اخباروں میں یہ دلچسپ خبر ہے کہ امریکہ کی نئی ری پبلکن حکومت کے سکریٹری مسٹر ڈلس ہندوستان اور پاکستان جائیں گے تاکہ کمیونزم کے خلاف تحفظ کے متعلق گفتگو کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ مالی اِمداد کے لئے واضح تعلقات کا مطالبہ ہوگا۔ نیویارک ٹائمز نے صاف لکھا ہے کہ ہندوستان سے گفتگو کرنا فضول ہے پاکستان سے پینگ بڑھانا چاہئے۔

۱۴ جنوری بدھ۔ کل زیادہ تر انٹرنیشنل ہاؤس ہی میں لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ یونیورسٹی میں صرف پروفیسر مارٹن زابل سے ملا۔ انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ وہ مجھی سے ہندوستان کے متعلق اتنی باتیں پوچھتے رہے کہ مجھے اُن سے زیادہ کچھ پوچھنے کا موقع نہ مل سکا تاہم ان سے جو باتیں ہوئیں اُن سے یہ اندازہ ہوا کہ گو وہ بھی شکاگو اسکول کے

نقادوں میں گِنے جاتے ہیں لیکن وہ سَو فیصدی اِس سے متفق نہیں ہیں یہ لوگ ارسطو کے نقطۂ نظر کے ترجمان ہیں۔ تنقید جدید والوں سے اُن سے سخت اختلافات ہیں۔ اُن سے پھر باتیں ہوں گی۔ میں اِسے تسلیم کرتا ہوں کہ امریکی یونیورسٹیوں کے ادب کے اساتذہ اصولِ تنقید کے متعلق غیر معمولی چھان بین کر رہے ہیں لیکن بہت اُلجھے ہوئے ہیں۔

آج رابرٹ کرین سے پھر ملا اور چار گھنٹے ساتھ رہا۔ تھوڑے سے پینترے میں نے بدلے، تھوڑے انھوں نے، پھر آہستہ آہستہ دونوں کھُلے، اور اس وقت تک جتنے لوگوں سے گفتگو ہوئی ہے اُن میں سب سے زیادہ واضح گفتگو انھیں سے ہوئی۔ ہندوستان کے متعلق اور امریکہ کے متعلق ـــ سبھی طرح کی باتیں ہوئیں اور یہ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ کھلے ذہن سے بھی بعض مسائل پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن گردوپیش سے بہت خوفزدہ ہیں۔ راک فیلر فاؤنڈیشن والے ہندستان جدید کی ایک تاریخ لکھوانا چاہتے ہیں جس میں کرین اہم حصّہ لیں گے۔ سردی بہت ہے بارش دن بھر ہوتی رہی۔

۱۶ر جنوری جمعہ ـــ آج صبح سے کوئی یاد کوندے کی طرح ذہن میں بار بار لپک جاتی تھی، ڈھونڈھتا رہا اور آخر میں نے اُسے ڈھونڈھ ہی نکالا، اس یاد کے ساتھ ایک طرح کے غم کا احساس بھی وابستہ تھا اِس لئے اُسے ڈھونڈھ لینے کے بعد سکون نہیں ہوا۔ چوبیس (۲۴) سال پہلے ۱۶ر جنوری کو والد کا انتقال ہوا تھا۔ اتنی دُور، اس تنہائی میں یہ یاد، جس کے نقش دُھندلے ہوتے جاتے ہیں، کیا تھی، میں نہیں کہہ سکتا! ویسے شکاگو میں دن رات مصروفیت کے ساتھ گذر رہے ہیں

پھر بھی اس یاد نے اپنا وقت ڈھونڈھ نکالا ۔ کل مسٹر میک کِم میریٹ سے ملا۔ وہ ہندوستان کے ایک گاؤں میں سال بھر تک رہ کر وہاں کی سماجی زندگی کا مطالعہ کرچکے ہیں، دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ زبان، رسم ورواج، جنسی زندگی، تیوہار اور اُن کی سماجی اہمیت، گھریلو گیت سبھی کا ذکر آیا۔ ایک دلچسپ بحث یہ بھی چھڑی کہ قدیم ہندوستانی فلسفہ کی روح وہاں کے عوام میں یا عام زندگی میں کہاں تک نمایاں ہے، مجھ سے جہاں تک ہوسکا میں نے عام کہاوتوں، عقیدوں، زندگی، موت، اخلاق اور خدا کے متعلق خیالات کی تشریح کرکے مختلف تاریخی ادوار میں اُس کا تجزیہ کیا، موجودہ تہذیب اور شہری زندگی، مغربی اثرات اور جدید تعلیم کی روشنی میں اُس کی بدلتی ہوئی نوعیت سے بحث کی، بہرحال دوتین گھنٹہ اُن کے ساتھ کافی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے اپنی موٹر میں سارے شہر کی سیر کرائی۔ شکاگو، مشی گن جھیل کے کنارے دور تک پھیلا ہوا ہے اور بعض جگہوں پر خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ شام کو میں نے میوزیم آف سائنس اینڈ انڈسٹری دیکھا۔ اِس میں سائنس کی برکتوں کا اچھا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مجھے لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کہ میں بجلی، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن ہرطرح کی مشین وغیرہ کی ساخت کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں۔ ایسے میوزیم ہندوستان میں بھی ہونے چاہئیں، بچّوں کی تعلیم میں اُن سے بہت کام لیا جاسکتا ہے۔ یہاں متعدد میوزیم ہیں، ایک آدھ اور دیکھوں گا۔

رات کو ہندوستانی ایسوسی ایشن کا جلسہ تھا، ہندوستان کے متعلق کچھ فلمیں دکھائی گئیں، ایک امریکی نے ہندوستان کی بیرونی پالیسی کے متعلق

اچھی اور سُلجھی ہوئی تقریر کی - لوگوں سے ملتے ملاتے رات کے ایک بج گئے -

آج میں سنسکرت کے پروفیسر موسیو بابرنسکا فت سے ملا - روسی ہیں - یہاں تیس سال سے رہتے ہیں - ہندوستان کی لسانی گتھی کے متعلق باتیں ہوئیں - اُن کا خیال ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں اس وقت سنسکرت کی جو بھرمار ہو رہی ہے اُس سے مصنوعی زبانیں وجود میں آئیں گی - انگریزی کے دو پروفیسروں سے ملا - امریکہ میں تنقید کے متعلق تھوڑی بہت باتیں ہوئیں - آج رات کو البتہ دلچسپی رہی - یہاں ایک ایسوسی ایشن ہے جو مختلف ملکوں کے ڈراموں اور اچھے ادب پاروں کو جلسہ کر کے پڑھتا ہے - آج اتفاق سے ٹیگور کے دو ڈرامے پڑھے جانے والے تھے - سنیاسی اور پوسٹ آفس - میں بھی چلا گیا - کچھ حصے مجھے بھی پڑھنے پڑے - پھر وہاں لوگوں نے چاہا کہ ٹیگور کے متعلق کوئی شخص بتائے - ہندوستانی طلباء نے مجھ سے کہا تو میں نے آدھ گھنٹہ ٹیگور پر تقریر کی، پھر سوالوں کا جواب دیا - ایک طالب علم نے ٹیگور کے دو گیت سُنائے - وقت اچھا گذرا -

۱۸ جنوری اتوار — پرسوں رات سے برف گرنا شروع ہوئی اور کل دن بھر گرتی رہی - مجھے اسٹاف کلب میں دو تین صاحبوں کے ساتھ لنچ کھانا تھا، اُسی حالت میں گیا اور تین بجے تک وہیں باتوں میں وقت گذرا - پھر سارا وقت انٹرنیشنل ہاؤس میں گذرا - یہاں زیادہ اُلجھن نہیں ہوتی - ہندوستان سے کئی خط مل گئے، اُن کا بار بار پڑھنا ہی ایک دلچسپ مشغلہ بن جاتا ہے - ایک صاحب ہندوستان کی سوشلسٹ پارٹی پر مقالہ لکھنے جا رہے ہیں اُن سے باتیں

ہوتی رہیں اب یہ اچھی خاصی مصیبت رہے گی کہ یہاں کے بہت سے لوگ لکھنؤ میں اُلٹے سیدھے کاموں کے لئے ملتے رہیں گے۔

آج میریٹ کے ساتھ نیچرل ہسٹری میوزیم دیکھا۔ قدیم امریکی قبائل کے متعلق غالباً یہ سب سے اچھا میوزیم ہے اُنھیں کے یہاں کھانا کھایا۔ نئے چین کے چھ گیت سُنے جنھیں اُس "مُغنی آتش نفس"، نے گایا تھا جس کا نام پال رابسن ہے اور دُنیا کے ہر خطہ میں جس کی عزت ہے۔ صرف امریکہ ایسا ہے جو اپنے کوہ نور کو نہیں پہچانتا۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ کاش یہ آواز بار بار سُننے کو ملتی۔ زندہ، بے قرار، پرجوش اور معنی خیز! تین بجے کے قریب اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ کا میوزیم دیکھا۔ مصر، بابل اور ایران کے متعلق بعض دلچسپ چیزیں ہیں۔ شام کو ایک جاپانی پروفیسر سے ملنے کا وقت طے تھا۔ جن کا نام ہے نوفیوسو ہیرائی۔ مذہبیات کا مطالعہ کر رہے ہیں اور جاپان میں شنٹو مذہب کی از سرِ نو تنظیم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھیں کے ساتھ ایک جاپانی رسٹران میں کھانا کھایا۔ جاپان اور ہندوستان میں مذاہب کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اُنھیں سے معلوم ہوا کہ جاپان میں ایک فیصدی سے بھی کم عیسائی ہیں اور اسّی فیصدی کے قریب لوگ شنٹو اور بُدھ دونوں عبادات میں شریک ہوتے ہیں۔ جاپان پر امریکی اقتدار سے بد دِل تھے لیکن اس کا اعتراف ڈر ڈر کر کرتے تھے۔

۲۰ جنوری منگل۔ دو تین دن سے پھر اُلجھن ہے جب سے نیویارک سے نکلا ہوں دوستوں کے متعدد خطوط ملے گھر کا کوئی خط نہیں ملا۔ برف باری سے الگ جی

گھبرا گیا ہے حالانکہ ہر طرف برف کی یہ سفید سفید بچھی ہوئی چادر دیکھنے میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔

کل شکاگو یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے دو پروفیسروں سے ملا۔ ان سے باتیں ہوتی ہیں تو اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھی کو زیادہ کہنا پڑتا ہے، یہ لوگ واضح بات کہنا نہیں چاہتے یا کہہ نہیں سکتے۔ پروفیسر میک لین یہی اصرار کرتے رہے کہ یہ باتیں ہمارے فائدے کے لئے لکھ ڈالئے۔ میں نے کہا مجھے اپنی انگریزی لکھنے کی صلاحیت پر زیادہ بھروسہ نہیں، کہنے لگے آپ بہت سے امریکی پروفیسروں سے اچھی زبان بول رہے ہیں۔ بہر حال یونہی وقت گذر رہا ہے۔ رات کو ایک سوئڈش فلم دیکھی، TORMENT ' بہت پسند آئی۔ بُرے، ذہنی طور پر بیمار اور لکیر کے فقیر اساتذہ کے ہاتھوں ایک ناقص نظام تعلیم میں طلباء کی زندگی کس طرح تباہ ہوتی ہے، یہ تھا اُس کا موضوع۔ ہمارے ہندوستانی فلم ساز ان چیزوں کی طرف ابھی متوجہ نہیں ہوئے۔

آج شکاگو کا آرٹ انسٹی ٹیوٹ دیکھا۔ اپنے تنوّع کے لحاظ سے یہ ادارہ اِس قسم کے دوسرے اِداروں سے زیادہ پسند آیا اگرچہ نیویارک، واشنگٹن اور بوسٹن کے اداروں سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جو اسکول وابستہ ہے وہ بہت بڑا ہے۔ آج واشنگٹن میں نئے صدر آئزن ہاور کی مسند نشینی کا جشن ٹیلی ویژن سے دکھایا گیا۔ اِس کا سارا خرچ فورڈ موٹر کمپنی نے برداشت کیا ہے۔ میں نے بھی چند منٹ کے لئے دیکھ لیا۔

۲۲ جنوری جمعرات ۔ دو دن چند آدمیوں سے ملنے میں گذرے۔

پروفیسر ولکٹ سے ملا جو ادبیات وغیرہ کے ڈین ہیں۔ مسٹر زابل سے ملا۔ کوئی بھی واضح طور پر یہ نہ سمجھا سکا کہ "شکاگو اسکول" کی تنقید کے اصل عناصر کیا ہیں، اتنا تو میں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ یہ لوگ ارسطو کے مقلد ہیں، کلاسکی اندازِ نظر رکھتے ہیں اور ادب پارے کا محض ادبی تجزیہ کرتے ہیں۔ ایک صاحب سے ادب کے نفسیاتی تجزیہ کے متعلق بھی باتیں ہوئیں۔ ساری باتیں میں پہلے سے جانتا ہوں، جہاں ضروری معلوم ہوا ہے اُن سے کام بھی لے چکا ہوں۔ جتنے لوگوں سے باتیں ہوئیں اور جو جو باتیں ہوئیں کہاں تک لکھوں۔ یہاں کا قیام ختم۔ کل سالٹ لیک سٹی کی روانگی ہے، یہاں سے تقریباً سولہ سو میل۔ بیوی بچوں کا حال نہیں معلوم ہوا، طبیعت بجھی بجھی سی ہے۔ سین فرانسسکو ۲۸ر کو پہونچوں گا اس سے پہلے خط نہیں مل سکتا۔

۲۵ر جنوری اتوار — کل رات کو سالٹ لیک سٹی پہونچ گیا۔ ڈاکٹر شردکمار سے اسٹیشن ہی پر ملاقات ہو گئی۔ انھیں کے ساتھ قیام ہے پرسوں جب شکاگو سے چلا تھا اُسی وقت لکھنؤ کا ایک خط مل گیا تھا اور اس اُلجھن میں کمی ہوگئی تھی جو کئی دن سے مُسلّط تھی۔ روانگی کے وقت تیز بارش ہو رہی تھی لیکن مظہر حسن صاحب (نجیب آباد یوپی کے رہنے والے، اب پاکستانی ہیں) اسٹیشن تک پہونچانے آئے۔

اِس وقت تک ریل سے یہ سب سے طویل سفر تھا، جس کے خیال ہی سے تھکن ہوتی تھی۔ میں نے یہ سفر یہاں کی سب سے مشہور ٹرین میں کیا جس کا نام ہے "کیلی فورنیا زیفر" یعنی نسیمِ سحر۔ اس ٹرین کی خوبی یہ ہے کہ اِس میں مناظر دیکھنے کے لئے

اوپر شیشے کے گنبد (VISTA DOMES) بنے ہوئے ہیں اور چونکہ یہ راستہ اپنے تنوع اور مناظر فطرت کے لحاظ سے سب سے حسین سمجھا جاتا ہے اس لئے بہت سے لوگ اسی ٹرین کو پسند کرتے ہیں۔ میرے دل کی بات یہ ہے کہ بہت سے آرام کے باوجود، ہندوستان کے فرسٹ کلاس کا آرام نہیں ہے۔ شکاگو سے نکلتے ہی برف کا طوفان شروع ہوا اور میلوں اس کا ساتھ رہا۔ لمبے لمبے زراعتی فارم، برف میں ڈھکے ہوئے پہاڑ، تیز رو بہتی ہوئی ندیاں، واقعی اس راستہ کو بے حد حسین بناتی ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے گھڑی ایک گھنٹہ پیچھے ہو گئی تھی۔ ۴۸ گھنٹے کا سارا سفر پہاڑوں اور ندیوں کے درمیان تھا اس علاقہ کو GRAND CANYON کہا جاتا ہے اور حسین ترین تفریح گاہوں میں اس کا شمار ہوتا ہے یہاں سب سے بڑے نیشنل پارک ہیں۔

سالٹ لیک سٹی پہاڑوں کے درمیان آباد خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کی جھیل اسّی میل لمبی اور ساٹھ میل چوڑی ہے، پانی میں سمندر کے پانی سے چھ گُنا زیادہ نمک ہے۔ شہر کی سڑکیں بے حد چوڑی، مکانات پھیلے ہوئے اور کسی قدر بنگلوں کے انداز کے ہیں۔ یہاں کی سب سے اہم چیز مورمن چرچ ہے جسے برگھم ینگ نے انیسویں صدی کے وسط میں قائم کیا ہے اگرچہ اس کا سلسلہ نیویارک میں ۱۸۲۰ء کے قریب شروع ہو چکا تھا۔ یہ لوگ بعض تفصیلات میں عیسائیوں سے مختلف ہیں لیکن جیسا کہ ہوتا ہے بات کا بتنگڑ بن گیا ہے۔ اُن کی انجیل کسی قدر مختلف ہے اور بعض دوسری مقدس کتابیں بھی ہیں۔ جس جگہ ان کا چرچ اور اسمبلی ہال، میوزیم اور TABERNACLE ہیں، تفریح کی

جگہ ہے۔ اس کی موسیقی ہر اتوار کو چوبیس سال سے نشر ہو رہی ہے۔ یہ لوگ اپنے خیالات عقائد اور معمولات میں سخت معلوم ہوتے ہیں، اصل گرجا گھر کے اندر مورمن بھی بغیر خاص اجازت نامے کے داخل نہیں ہو سکتے۔

یونیورسٹی دیکھی حالانکہ آج اتوار تھا۔ چھوٹا سا میوزیم بھی ہے، کچھ وقت اس میں گذرا۔ ہندوستانی یہاں بہت کم ہیں اس لئے جو چند ہیں وہ ایک دوسرے سے بہت وابستہ ہیں۔

شام کو چند ہندوستانیوں کے ساتھ ایک THREE DIMENTION فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ فلم تو خیر مذاق تھا لیکن چونکہ تجربہ نیا تھا لطف آیا۔ کھانا ایک میکسی کن رسٹران میں کھایا۔ ابھی ابھی کئی آدمیوں کو ایک ساتھ خیال آیا کہ کل ہندوستان میں یوم جمہوریہ ہوگا۔ وقت کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اس وقت ہندوستان میں وہ دن منایا جا رہا ہوگا کیونکہ وہاں کا وقت اس جگہ سے ۱۳ گھنٹے آگے ہے۔ یہاں وہ دن اس قدر کیوں عزیز ہے کہ اس کا خیال کر کے خوشی ہو رہی ہے۔ وہاں تو ایسا جذبہ نہیں پیدا ہوتا تھا۔

۲۷ جنوری منگل ۔ موسم اچھا ہے، بس گھومتا پھرتا رہا، کچھ خط لکھے، کچھ پڑھا۔ ڈاکٹر شرد کمار سے بہت سی باتیں کر کے وطن کی یاد تازہ کی۔ یونیورسٹی میں کسی سے نہیں ملا۔ کسی خاص آدمی کا نام معلوم نہیں کیوں ڈھونڈھتا پھروں۔ یہاں بہت سی چیزیں دیکھنے کی نہیں ہیں پھر بھی شہر خوبصورت ہے اور دیکھنے کے قابل۔ ابھی تھوڑی دیر میں کیلی فورنیا زیفر سے سین فرانسسکو چل دوں گا۔ وقت کٹتا جا رہا ہے۔

۲۸ر جنوری بدھ ـــ شام کو پانچ بجے تقریباً سترہ گھنٹے کے سفر کے بعد بارکلے پہونچ گیا جو کیلی فورنیا یونیورسٹی کا مرکز ہے۔ انٹرنیشنل ہاؤس میں قیام ہے۔ یہ سفر بھی خوبصورت مناظر کے درمیان تھا۔ اونچے پہاڑ، سخت اور کھردری چٹانیں، سُرنگیں ـــــ سیکڑوں میل پہاڑیاں اور سیکڑوں میل ہموار کھیت۔ یہ ٹرین چکّردار راستوں سے ہوکر گذرتی ہے پہاڑوں میں ریل اس طرح بل کھاتی ہوئی چلتی ہے کہ سورج کبھی داہنی کھڑکی سے جھانکتا ہے کبھی بائیں سے، کبھی آگے نظر آتا ہے کبھی پیچھے۔ گرینڈ کینین کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ جاری رہا۔ انیسویں صدی کے وسط میں کیلی فورنیا میں سونے کی کانوں کا پتہ چلا اُس وقت سے یہ خطّہ آباد ہونا شروع ہوا اور اِس وقت امریکہ کی بڑی دولت اسی علاقہ میں ہے۔ آگے بڑھ کر موسم بدل جاتا ہے اور فضا مشرقی ہونے لگتی ہے حالانکہ امریکہ کے لحاظ سے یہ مغربی حصہ ہے۔ کھیتوں میں اور سڑکوں کے کنارے جہاں پانی جمع ہے اُن میں بطیں اور مرغابیاں تیر رہی ہیں۔ بھیڑوں اور گایوں کے گلّے بغیر بوئے ہوئے کھیتوں میں سر جھکائے چر رہے ہیں، گاؤں کے کنارے مُرغیاں نظر آتی ہیں۔ یہاں سردی کا احساس کم ہونے لگا ہے سبزے کی فراوانی اور موسم کی تبدیلی کی وجہ سے مارچ اپریل یا اکتوبر کا دھوکا ہوتا ہے۔

انٹرنیشنل ہاؤس تقریباً اتنا ہی بڑا ہے جتنا شکاگو کا۔ انتظام اتنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ شکاگو کے مقابلہ میں مہنگا بھی ہے۔ یہاں بھی ہندوستانی طلباء کافی ہیں، صرف چار پانچ سے ملاقات ہوئی۔ کل پرسوں تک اَوروں سے ہوگی۔

۳۰ر جنوری جمعہ ـــ کل صبح ہی صبح مسٹر لکھن پال سے ملاقات ہوگئی

یہ لکھنؤ میں پیلیو باٹنی انسٹی ٹیوٹ میں لکچر رہیں، ویسے لکھنؤ میں شائد مشکل سے بے تکلفی ہوتی یہاں ایسا محسوس ہوا کہ نہ جانے کب کے دوست ہیں۔ انھوں نے ساری یونیورسٹی کی سیر کرادی۔ یونیورسٹی پہاڑوں کے درمیان دُور تک پھیلی ہوئی ہے اور سات دُور دراز مقامات پر اس کے مختلف حصّے ہیں، اس کا ایک حصّہ لاس اینجلس میں بھی ہے۔ یہ دُنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی کہی جاتی ہے، تقریباً چالیس ہزار طلباء یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہاں کی یونیورسٹی میں بھی ایک طرح کی تاجرانہ مسابقت جاری رہتی ہے اور اس طرح کے اشتہار اِن کے متعلق نکلتے ہیں جیسے لوگوں کو کسی دوکان کی طرف متوجہ کیا جارہا ہو۔ میں ذرا غلط زمانے میں آیا ہوں یہاں کا ایک سشن ختم ہوا ہے (جسے سمسٹر کہتے ہیں) اور دوسرا ۱۰/ فروری سے شروع ہوگا لیکن پھر بھی بڑی چہل پہل ہے بہت سے لوگوں کے مل جانے کی امید ہے۔ ہندوستان کے طلباء محبت سے ملتے ہیں۔ کام بھی کرتے ہیں، پڑھتے بھی ہیں، سب یہی پوچھتے ہیں کہ ہندوستان میں ہمارے لئے کوئی جگہ ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ میرے ذہن پہ بوجھ بنتا جاتا ہے، ہندوستان پہونچ کر اس کے متعلق لکھوں گا۔ ہوسکا تو بڑے لوگوں کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ بھی کروں گا۔

یہ نوجوان جن کے دل میں کام کرنے کی خواہش، بازوؤں میں سکت، ملک کی خدمت کا ولولہ اور لیاقت ہے، یہاں خوش نہیں ہیں، مجبوراً پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بڑا اہم سوال ہے، غیر ملک میں وہ روپیہ تو کما سکتے ہیں لیکن خوش نہیں رہ سکتے۔ اُنھیں احساس ہے کہ ان کی جگہ ہندوستان ہی میں ہوسکتی ہے

مگر کہاں ؟ زندگی ان کے لئے ایک بڑا سوالیہ نشان ہے - یہاں انھوں نے اپنے قوتِ بازو سے موٹریں خرید لی ہیں آرام دہ مکانوں میں رہتے ہیں، وہاں کیا کریں گے - یہاں ہوٹلوں، دفتروں، دوکانوں پر کام کرتے ہیں، وقت نکال کر لڑکیوں سے بھی دل بہلا لیتے ہیں - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُنھیں کیا مشورہ دُوں، یہی کہہ کر چُپ ہو جاتا ہوں کہ آپ ہندوستان کی دولت ہیں اور آپ کی جگہ وہیں ہے -

آج شعبۂ انگریزی کے چیرمین مسٹر فارنھم سے ملا - موصوف کو شیکسپیر اور اِس دَور کے دوسرے ڈرامہ نویسوں سے دلچسپی ہے - اُنھوں نے از راہِ شفقت خود اپنے ساتھ لے جاکر دو اور پروفیسروں سے ملایا جنھیں تنقید سے شغف ہے - اُن سے دلچسپ باتیں رہیں گو نئی یا بہت گہری نہیں تھیں -

شام کے وقت انگریزی کی ایک پروفیسر مِس جوزیفین مائلس سے اُن کے گھر پر ملا - ایک خاص طرح کی اعصابی بیماری نے اُنھیں مفلوج بنا دیا ہے، چلنا پھرنا ناممکن ہے، ایک کرسی میں بیٹھی پڑھتی لکھتی رہتی ہیں لیکن گفتگو میں جوش، معلومات اور علم کی پیاس حیرت خیز ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جسم کی ساری توانائی حصولِ علم کا شوق بن گئی ہے - اُن کی جسمانی حالت قابلِ افسوس مگر ذہنی حالت قابلِ رشک ہے - دو گھنٹے تک علم و ادب، ہندوستان اور امریکہ پر باتیں ہوئیں - انھیں لفظوں اور جملوں کی ساخت اور کسی زمانے میں لفظوں کے اہمیت اختیار کر کے شاعری کا جزوِ خاص اور تنقید کی بنیاد بن جانے کے مسئلہ سے دلچسپی ہے - میں نے اُنھیں لفظوں اور علامتوں کی سماجی نوعیت کی طرف بھی

متوجہ کیا جس سے وہ بے خبر نہیں ہیں لیکن دلچسپی نہیں ہے۔ چلتے وقت اُنھوں نے اپنی کتاب THE CONTINUITY OF POETIC LANGUAGE مجھے دی۔

انٹرنیشنل ہاؤس واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر مزمدار بھی آگئے ہیں لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔

۳۱ر جنوری سینچر — صبح ڈاکٹر مزمدار سے ملاقات ہوئی۔ دس بجے یونیورسٹی گیا۔ شعبۂ انگریزی کے ایک پروفیسر سے ملا، دو سے وقت مقرر کیا اور ایک بجے واپس آیا۔ ہندوستانی کونسل مقیم سین فرانسسکو مسٹر عظیم حسین نے کچھ ہندوستانی طلباء کو چار بجے چائے پر بلایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ اپنے ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کئے ہوئے کسی مشاعرے کے کچھ حصے اور گانے سُنائیں گے میں بھی لکھن پال کے ساتھ گیا۔ عظیم حسین سے پہلی دفعہ ملا۔ مجھے صورت سے ذہین، جذباتی اور اور خوش اخلاق معلوم ہوئے۔ کچھ ہندوستانیوں سے اور ملاقات ہوئی۔ وہیں کانگریس کمیٹی کے ڈاکٹر راج کمار سے بھی ملاقات ہوئی —— چائے کے بعد کچھ گانوں کے اور پھر ہند پاکستان مشاعرے کے ریکارڈ سُنے۔ نغمہ وشعر میں ماضی کے افسوں کس قدر جلد جاگ اُٹھتے ہیں، اس کا اندازہ ایسے ہی موقعوں پر ہوتا ہے۔ اور خیالات کی زنجیر پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ بارہ ہزار میل کی دُوری پر تھوڑی دیر کے لئے جوش، حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، عرش ملسیانی، آزاد اور فراق کی آوازیں سُننا غم اور خوشی کا مِلا جُلا تاثر پیدا کرتا ہے۔ بارکلے سے سین فرانسسکو پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے واپسی میں

رات کے گیارہ بج گئے۔

یکم فروری اتوار ۔ کل لکھنؤ ہی کے ایک پرانے طالب علم مسٹر ابوالبشر صدیقی سے ملاقات ہوگئی تھی آج انھوں نے سین فرانسسکو بلایا تھا، وہاں مجھے عبدالباسط نعیم سے اپنے خطوط بھی لینے تھے۔ صبح گیارہ بجے سین فرانسسکو پہونچ گیا اور پھر گیارہ بجے رات کو واپس ہوا۔ عبدالغفور سارنگ (موپلا) محمد علی میرداد، مسز میرداد اور صدیقی صاحب کے ساتھ وقت دلچسپ کٹا۔ سہ پہر کو انھیں لوگوں کے اصرار پر ایک تقریر سننے چلا گیا۔ یہ جلسہ بشیر منٹو صاحب (لاہور) امام جماعت احمدیہ کے یہاں تھا، بعض امریکی مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ کچھ فی جی کے مسلمان طالب علم ملے جن کے والدین ہندوستان سے فی جی چلے گئے تھے، وہ اب ہندوستان کے متعلق جاننے اور وہاں واپس آنے کے خواہشمند ہیں۔ منٹو صاحب کے یہاں اس علاقہ کے بہت سے مسلمان جمع ہوجاتے ہیں اور ایک طرح کی مذہبی اور معاشرتی فضا قائم رکھتے ہیں۔ کیلی فورنیا میں کچھ مسلمان اور سکھ اور بڑے بڑے زراعتی فارموں کے مالک ہیں انھوں نے مسجد اور گرودوارے بھی بنوائے ہیں کچھ لوگ، خاص کر قادیانی، مذہبی تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ امریکہ میں امریکی مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ واشنگٹن میں ایک مسجد دیکھی تھی جو ابھی مکمل نہیں تھی۔ دوسری کیلی فورنیا کے دارالسلطنت سیکرامنٹو میں دیکھی۔ اس علاقہ میں رام کرشن مشن کا کام بھی کافی ہو رہا ہے۔

۳ فروری منگل ۔ دو دن میں کتنے آدمیوں سے ملا ہوں، انگریزی کے ادیب، نقاد اور پروفیسر، فلسفہ کے اساتذہ، علم الانسان کے ماہرین۔ کچھ گہرے ہیں کچھ سطحی۔ کس سے کیا باتیں ہوئیں۔ کہاں تک لکھوں۔ کوئی انوکھی یا

بہت زیادہ غور طلب بات نہیں ہوئی ۔ اتنا ضرور کہنا ہے کہ لوگ اخلاق سے ملتے ہیں
اور جو کچھ ہیں وہ عام طور سے ظاہر کر دینا چاہتے ہیں ۔ ایک بات کا اور اندازہ ہوا کہ
تھوڑی سی ہوشمندی سے کام لیا جائے تو ہر شخص سے اُس کے موضوع کی مناسبت
سے باتیں ہوسکتی ہیں ۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی پریس بھی دیکھا ۔ اُس کے اطالوی منیجر
ماتی سی نی نے پریس کے کام کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں ۔ یہ محض ایک یونیورسٹی
کا پریس ہے مگر اُس کے ساز و سامان ، اُس کی تنظیم وغیرہ دیکھ کر آنکھیں کھُل جاتی
ہیں ۔ کاش ہماری یونیورسٹی کے پاس بھی کوئی پریس ہوتا ۔ جا کر لوگوں کو اُکساؤں گا ،
حالانکہ جانتا ہوں کچھ نہیں ہوسکتا ۔ بات یہ ہے کہ ہر جگہ روپیہ کا سوال ہے ۔
وہی نہیں جس پر میاں سوار ہوں ۔

اِدھر بڑی مشکل سے نگاہیں نیویارک ٹائمز کی عادی ہوئی تھیں ، وہ یہاں نظر
نہیں آتا ، اخبار پڑھنے کا مزا نہیں ، پھر بھی کئی کئی اخبار خریدتا ہوں اور سُرخیاں
دیکھ کر پھینک دیتا ہوں ۔۔ آئزن ہاور نے فارموسا کو چین پر حملہ کے لئے آزاد
کر دیا ہے ، دورانِ جنگ میں روزولٹ اور ٹرومین نے روس سے جو معاہدے
کئے تھے ، وہ اُنھیں ختم کرنا چاہتے ہیں ، کیا یہ جنگ کی طرف کھُلا ہوا اقدام نہیں
ہے ؟ معلوم ہوا ہے کہ وہ چیانگ کے پٹھوؤں کو اُبھار کر امریکہ کے سپاہیوں کو
واپس بلا لینا چاہتے ہیں تا کہ ایشیا والے آپس ہی میں لڑیں اور اس درمیان
میں جنگ کی تیاریاں ہوسکیں میرا یہ خیال قوی ہوتا جاتا ہے کہ امریکہ اس
منزل میں ہے جہاں اُس کے لئے دو ہی دروازے کھُلے ہیں ، خول کے اندر واپسی
یا نئی جنگ ۔۔ پہلی بات معاشی وجوہ سے ممکن نہ ہوسکے گی اس لئے ۔۔

کیلی فورنیا کی ریاست سب سے زیادہ رجعت پسند ہے، یہیں سے اساتذہ کے حلف وفاداری کا سلسلہ شروع ہوا۔ کئی دن سے شدید کہرا پڑ رہا ہے۔

۵، فروری جمعرات — کل JOURNAL OF AESTHETIC & ART HISTORY کے اڈیٹر مسٹر ہینگر لینڈ سے ملاقات ہوئی۔ میں گھر نہیں جانتا تھا، موصوف کی بیگم صاحبہ خود آکر مجھے لے گئیں۔ پہاڑیوں کے اندر خوبصورت مکان ہے۔ اُن کے گھر پر کوئی چار گھنٹے رہا، کھانا وہیں کھایا اور بہت سی باتیں ہوئیں۔ ایک پڑھا لکھا ذہین اور محنتی جرمن جیسا ہوتا ہے، یہ بھی انھیں میں سے ہیں۔ صاف گو، علم دوست، ملنسار ہیں۔ میں نے جب امریکہ کے ظاہری اخلاق اور اوچھے پن کا ذکر کیا تو کہنے لگے، یہ لوگ سینے سے لگاتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں۔ ہندوستان ہو آئے ہیں اور پھر جانا چاہتے ہیں۔ آرٹ سے متعلق ہندوستان کے بعض رسائل دیکھے جو ہندوستان میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ اُنھوں نے اپنے متعدد مضامین وغیرہ کی نقلیں مجھے دیں۔ بہرحال مسٹر ہنگر لینڈ سے مل کر خوشی ہوئی۔ ان سے ملنے پر مس جوزیفین مائلس نے زور دیا تھا۔

آج کچھ خط لکھے، کچھ کتابوں کی دوکانوں میں وقت گذارا، بارکلے میں ایک چھوٹی سی دوکان ہے "بیسویں صدی"۔ تنہا بوڑھی عورت، خاموشی، دبے پاؤں آمد رفت، وہاں زندگی بٹتی ہے — زندہ ادب اور زندہ کرنے والے خیالات! بوڑھی خاتون کی شفقت آمیز گفتگو یاد رہے گی۔

۶، فروری جمعہ — آج سین فرانسسکو میں ہوں، دو تین دن یہاں رہ کر شہر دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ ہوٹل سے نکل کر دو بجے سے سات بجے تک گھومتا ہی رہا۔

شہر کے اکثر حصے دیکھے۔ جو پُل اوک لینڈ اور فرانسسکو کی خلیج کے اوپر بنا ہے
اُس کی لمبائی سوا آٹھ میل ہے۔ اس کے علاوہ گولڈن گیٹ پل بھی ہے جو سب سے
طویل معلق پُل کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک امریکن اکیڈمی آف ایشین اسٹڈیز ہے،
غلط راستوں سے گیا، ادھر بس نہیں تھی تھک گیا، یہ ادارہ شروع ۱۹۵۱ء میں
قائم ہوا ہے اور ایشیاء کے متعلق اعلیٰ تعلیم دینے کا مُدعی ہے لیکن میں نے وہاں کے
لوگوں سے بات چیت کی، کاغذات اور قواعد وغیرہ دیکھے تو زیادہ متاثر نہیں ہوا۔
پھر بھی اس وقت اِس میں بعض مشہور لوگ موجود ہیں جیسے دلیپ کمار رائے،
ہری داس چودھری، رُدوم لینڈا، ملا لاسیکرا وغیرہ۔ یہاں کالی داس ناگ.
اور سرسی پی راما سوامی آئر بھی لکچر دے چکے ہیں۔ اگر فاؤنڈیشنوں وغیرہ سے
مدد مِل جائے تو ممکن ہے چل جائے۔ دشواری یہ ہے کہ یہاں کے لوگ مخلصانہ انداز
میں کچھ زیادہ جاننے کے خواہش مند بھی نہیں معلوم ہوتے۔

کچھ کچھ دنوں کے بعد کھانے سے طبیعت ہٹ جاتی ہے، بیمار ہونے کا
احساس ہوتا ہے، آج پھر وہی حالت ہے۔ مُنہ کا مزا بدلنے کے لئے یہاں کے
انڈیا ہاؤس نامی رسٹراں میں کھانا کھایا کئی ہندوستانی طلباء یہاں کام کرتے
ہیں۔ امریکہ میں چینیوں کی سب سے بڑی آبادی سین فرانسسکو میں ہے، ایک
پورا علاقہ انھیں کا ہے، بعض اچھی حالت میں ہیں۔ اُن کے مکانات، تھیٹر،
عبادت گاہیں سب یہاں موجود ہیں۔

۷ر فروری سینچر — صبح سے اُٹھ کر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ دوپہر کا کھانا عبدالباسط
نعیم صاحب کے یہاں کھایا۔ جب اُن کے یہاں جا رہا تھا تو مدراس کے مسٹر ٹیپایہ سے

سرِ راہ ملاقات ہوگئی۔ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد انھوں نے کہا شام کو ایک جگہ دلیپ کمار رائے کی دعوت ہے آپ بھی آئیے وہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ میں کچھ ہچکچایا تو انھوں نے کہا میں وہاں رہوں گا ضرور آئیے۔ میں نے بھی دل میں کہا ایسا موقع نہیں کھونا چاہئے۔ شام کو وہاں پہونچ گیا تو واقعی بہت سے ہندوستانیوں سے ملاقات ہوگئی۔ دلیپ کمار رائے، اندرا دیوی، ڈاکٹر چودھری کے علاوہ بہت سے لوگ ملے جو سالہا سال سے یہیں ہیں۔ ہندوستانی کونسلیٹ کے لوگوں سے پھر ملاقات ہوئی۔ مسٹر چٹیار مدراس میں تعلیمی اور معلوماتی فلمیں بنانے والے ادارے میں ملازم ہیں۔ ہالی وڈ میں گاندھی جی کے متعلق ایک فلم تیار کی ہے۔ آدمی اچھے معلوم ہوئے۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی کے علاوہ یہاں کے لوگوں کی دلچسپی ویدانتک سوسائٹی، بدھ مت، رام کرشن مشن، ہندوستانی رقص اور اروند گھوش سے ہے۔ واپسی میں بارش ہو رہی تھی۔ ہوٹل پہونچا تو عزیزوں اور دوستوں کے بہت سے خط مل گئے (بارکلے انٹرنیشنل ہاؤس سے ایک طالب علم لاکر رکھ گیا تھا) اس وقت طبیعت بے حد بحال ہے۔ کل ایک صاحب نے سین فرانسسکو کی اچھی طرح سیر کرانے کا وعدہ کیا ہے۔

نومبر میں خبر ملی تھی کہ فرانس کے مشہور ترقی پسند شاعر پال ایلوا کا انتقال ہوگیا میں نے اُس کی کوئی نظم نہیں پڑھی تھی۔ آج ایک رسالہ میں ایک مختصر سی نظم دیکھی بہت پسند آئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس میں میرے دل کی بات بھی ہے۔ عنوان ہے۔ "آخری اشعار" اور غالباً یہ اس کی آخری نظم بھی ہے۔ جی چاہتا ہے اس کا ترجمہ کر دوں۔۔۔۔

میں سب کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔
مجھ میں سبھی سے محبت کرنے کی اہلیت تھی مگر وہ ناکافی تھی۔
آسمان، سمندر اور زمین نے مجھے نگل لیا تھا،
انسان نے دوبارہ جنم دیا۔
یہاں وہ محوِ خواب ہے جو اس میں شک کئے بغیر زندہ رہا
کہ صبح ہر عہد کے لئے اچھی چیز ہے۔
اُسے موت آئی تو اس کے دل میں دوبارہ زندہ ہونے کی خواہش تھی
جیسے سورج پھر طلوع ہو جاتا ہے۔
میں اپنے لئے اور دوسروں کے لئے اِس طرح جیا، گویا تھکا ہوا ہوں،
لیکن میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اپنے کندھے کا بار ہلکا کروں
اور اپنے غریب سے غریب بھائی کا بوجھ بٹاؤں
جیسے اپنے اوپر لادے ہوئے وہ قبر تک چلا جاتا ہے۔
اِسی اُمید کی محبت میں میں نے اپنا نام تاریکی کے مخالفوں میں لکھا لیا ہے۔
ٹھہر جاؤ اور ہرے بھرے جنگلوں کو یاد کرو!
چمکتی ہوئی دھوپ میں کھڑی لہلہاتی ہوئی کھیتوں کو یاد کرو!
اُن مناظر کو یاد کرو جن پر سایہ کی تاریکی اور غم کا بوجھ نہ تھا!
میری زندگی مٹی تو اُس جگہ تمھاری زندگی آگئی،
موسموں کی آمد و رفت اور زندہ رہنے میں ہمارا سلسلہ جاری ہے۔
ہم زندہ رہنے اور پائدار بن جانے کی تکمیل کرتے ہیں۔

کیسی خوبصورت نظم اور کتنی پُر اثر!

چھوٹی سے چھوٹی پیشین گوئی سچ نکل آئے تو خوشی ہوتی ہے۔ آتے ہوئے قاہرہ کے ایروڈروم میں میں نے ہندوستانی ساتھیوں سے کہا تھا کہ غالباً اِس ایرفیلڈ کا نام اب شاہ فاروق کے نام سے منسوب نہ رہے گا آج اخبار میں دیکھا کہ شاہ فاروق کا نام اس سے نکال دیا گیا۔ اور شاہ فاروق اپنی ہی سی کہے جا رہے ہیں۔ اِدھر ان کی خود نوشت سوانح عمری بعض اخبارات اور رسائل میں شائع ہو رہی ہے، ہر جگہ تان اِس پر ٹوٹتی ہے کہ مجھے مصر سے نکال دیا اب روس کا حملہ روکنے والا کوئی نہیں رہا۔ یہ عجیب دلچسپ بات ہے، کہ ان کی بیگم صاحبہ کے خود نوشت حالات بھی چھپ رہے ہیں اور اُن کی والدہ ملکہ نازلی بھی اپنے حالات ترتیب دے رہی ہیں، امریکہ میں ایسی چیزوں کی بے حد قدر ہے۔

۹ر فروری دوشنبہ — آج دوپہر کو پیلو آلٹو پہونچ گیا۔ یہ قصبہ اسٹین فرڈ یونیورسٹی کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نسبتاً نئی یونیورسٹی ہے۔ یہاں کے کمرے اور برآمدے ہندوستانی عمارتوں کی یاد دلاتے ہیں اگرچہ عمارت کی ساخت اُس سے الگ ہے۔ یونیورسٹی کے پھاٹک سے اصل عمارت کا فاصلہ چھ سات فرلانگ ہے اور درختوں کی وجہ سے بے حد حسین۔ آج میں نے مسٹر ولیس اسٹگنر سے ملاقات کی، یہ شعبۂ انگریزی میں تخلیقی ادب پر لکچر دیتے ہیں۔ اُن سے باتیں ہوئیں لائبریری وغیرہ دیکھی، کل کے متعلق پروگرام طے کیا اور چلا آیا۔ مسٹر اسٹگنر ہندوستان جا چکے ہیں اور وہاں کے متعلق چند مضامین بھی لکھ چکے ہیں۔

کل کا دن سین فرانسسکو میں بہت ہی اچھا گذرا تھا۔ صبح کا نکلا ہوا بارہ بجے رات کو ہوٹل میں واپس پہونچا۔ دوپہر کا کھانا میرداد صاحب کے یہاں کھا کر سب کے سب سیر کے لئے نکلے۔ معلق گولڈن گیٹ پل ذرا غور سے دیکھا، تعمیر کے نقطۂ نظر سے واقعی حیرت میں ڈال دینے والا پل ہے۔ وہاں سے پہاڑی سڑکوں پر ہوتے ہوئے تقریباً پچاس میل نکل گئے یہاں ایک جنگل ہے جسے میور وُڈس کہتے ہیں۔ یہ جگہ بڑی خوبصورت تفریح گاہ بن گئی ہے۔ اتوار کی وجہ سے ہزارہا آدمی تفریح کے لئے آئے ہوئے تھے اور جنگل میں منگل کا سماں درپیش تھا۔ یہاں کے اونچے اونچے گھنے درخت، پہاڑیاں اور منظر سب بے حد دلکش ہیں بعض درختوں کی عمر تقریباً اٹھارہ سو سال اور اونچائی تقریباً ڈھائی سو فٹ ہے۔ ایسی (بلکہ اس سے بھی اچھی) تفریح گاہیں اور بھی ہیں لیکن میرے پاس وقت نہیں ہے۔ وہاں سے واپس ہو کر گولڈن گیٹ پارک اور جاپانی ٹی گارڈن دیکھے۔ تھوڑی سی جگہ میں جاپانی منظر اور فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ساحل سمندر بھی دیکھا، بہت خوبصورت ہے لیکن مجھے بمبئی کے چوپاٹی اور میرین ڈرائیو اور مدراس کے میرینا بیچ میں زیادہ لُطف مِلا تھا۔ رات کا کھانا قریشی صاحب (پاکستان کونسلیٹ) کے یہاں کھایا، چار گھنٹے دلچسپ صحبت رہی۔

۱۱ فروری بُدھ — کل کا دن بہت مصروفیت کا دن ثابت ہوا۔ ساڑھے دس بجے ہوور میموریل لائبریری اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مسٹر لوئی فشر سے ملاقات ہوئی۔ (وہ لوئی فشر نہیں جو صحافی ہیں) وہ ہندوستان میں رہ چکے ہیں، سنجیدہ اور علم دوست ہیں۔ دبی زبان سے ہندوستانی طلبا کی شکایت کرنے لگے کہ

مقرّر کی بات نہیں سُنتے۔ میں نے اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی تو کہنے لگے یہ میرا بھی تجربہ ہے کہ تقریر کے بعد دوست ہو جاتے ہیں اور گھُل مِل کر باتیں کرتے ہیں۔ ہندوستان کے متعلق امریکہ میں جو لاعلمی ہے، میں نے اُس کا تذکرہ کیا اور اُنھیں متفق پایا۔ اس کے بعد مسٹر رابرٹ نارتھ سے ملا۔ پیسفک اسپکٹیٹر کے اڈیٹروں میں سے ہیں۔ یہ رسالہ ایشیا اور خاص کر ہندوستان کے ادب کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور شائع کرتا ہے اگرچہ وہ چیز ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتی، یہ بات میں نے اسنگر سے بھی کہی تھی اور نارتھ سے بھی کہی۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ فوراً کہتے ہیں، پھر اچھی چیزیں ہمیں دیجئے اور دوسروں سے دلوائیے۔ مسٹر نارتھ ستمبر میں فورڈ فاؤنڈیشن کی طرف سے ہندوستانی ادب اور زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے جا رہے ہیں، آدمی پڑھے لکھے، سادہ مزاج اور خلیق ہیں موجودہ ہندوستانی ادب اور زندگی کے متعلق بہت سے سوال جواب ہوئے۔ اِس کے بعد مسٹر پول سے ملاقات ہوئی یہ ہندوستانی سیاسیات پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں، نو عمر ہیں اور ہندوستان جانے کے خواہشمند۔ تین بجے کے قریب امریکہ کے مشہور نقاد مسٹر آئیور ونٹرس سے ملا۔ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو اپنی ہی بات کو صحیح سمجھتے ہیں حالانکہ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے IN DEFENCE OF REASON۔ تنقید میں سماجی، معاشی یا کسی اور نقطۂ نظر کے استعمال کے خلاف ہیں حالانکہ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ اگر شاعر کے خیالات کا صحیح علم ہو جائے تو زیادہ صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ نئے ادیبوں سے نہ تو زیادہ واقف ہیں اور نہ فکر ہے۔ سینما دیکھنے کا خیال تھا لیکن ہوٹل واپس آکر

خطوط لکھنے میں مصروف ہو گیا ۔

آج صرف مسٹر اسٹگنر سے ملنے کا پروگرام تھا اُن سے ادبیات کے متعلق کم اور ہندوستانی ادب کے امریکہ میں شائع کرنے کے متعلق زیادہ باتیں ہوئیں۔ اصل دشواری یہی ہے کہ شاید یہاں کے ناشر وہ چیزیں چھاپنا نہ چاہیں گے جسے ہم اچھا ادب کہتے ہیں ۔ آج مسٹر نارتھ سے پھر ملا ۔ اُن کے تعلقات فورڈ اور راک فیلر دونوں فاونڈیشنوں سے ہیں ممکن ہے یونیورسٹی لائبریری کیلئے کچھ کتابیں اور ضروری چیزیں اُن کے ذریعہ سے مل سکیں۔ وہ ہندوستان کے متعلق بہت سی باتیں جاننا چاہتے ہیں ۔ دو تین ہفتوں کے بعد ایک دفعہ تھکن ، کمزوری اور بے دلی کا شدید دَورہ پڑتا ہے ، آج شام سے وہی صورت ہے ۔ شام کے وقت حیدرآباد کے ایک شناسا ، ثناء اللہ صاحب آگئے جو اب پاکستان میں ہیں اور یہاں تعلیم کے لئے آئے ہوئے ہیں ، اُن کی وجہ سے دل بہلا رہا ۔

۱۳ فروری جمعہ ۔ کل صبح کو لاس اینجلس پہونچ گیا ۔ ہالی وُڈ کی وجہ سے اُسے ستاروں ، نظاروں ، نِگاروں اور بہاروں کی دنیا بھی کہہ سکتے ہیں ۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ستارے آنکھوں میں پڑ جاتے ہیں ۔ شہر بہت وسیع ہے ، مکانات دُور دُور پر بنے ہیں ، کھُلی ہوئی جگہوں ، پارکوں ، کھجور کے اونچے اونچے دُو رویہ درختوں کی وجہ سے یہاں کی فضا امریکہ کے اور علاقوں سے کچھ الگ الگ سی معلوم ہوتی ہے ۔ جو جدید حصّہ آباد ہوا ہے وہاں مکانات بالعموم اونچے نہیں ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ کیلی فورنیا زلزلوں کا علاقہ ہے ۔ اس لئے مکانات اونچے نہیں بنتے ۔ اسٹین فرڈ یونیورسٹی بھی ایک منزلی تھی صرف ہوور میموریل کے ایک مینار میں چودہ منزلیں تھیں ۔

یونیورسٹی کا گرجا گھر فنی نقطۂ نظر سے لاجواب تھا۔

طبیعت کا وہی حال ہے کیا کروں! یہاں آتے ہی عزیزوں کی خیریت کا خط مل گیا اور اطمینان ہو گیا لیکن اُلجھن سی ہے۔ کل اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ اخبار دیکھتا اور غم کھاتا رہا۔ روزن برگوں کی آخری اپیل بھی رد کر دی گئی۔ افسوس! پھر جنگ کے آثار ہیں، بادل گھرے جا رہے ہیں، پروپیگنڈے کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ پرسوں اِسٹین فرڈ میں چند پروفیسروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک نوجوان پروفیسر جو تاریخ چین پڑھاتے ہیں، امریکہ کی موجودہ سیاست کا ذکر کرنے لگے۔ دو دن ہوئے یہاں کے علامۂ بے بدل، سینٹ کے لیڈر، آئزن ہاور کے ری پبلکن رقیب، مسٹر ٹیفٹ سے طلبا نے کچھ سوالات پوچھے، اُنھوں نے اُلٹے سیدھے جواب دئے، ایک طالب علم نے پوچھا، کیا یہ صحیح ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مارشل چیانگ کی فوجیں کمیونسٹ باغیوں سے مل گئیں، کہنے لگے یہ تو تم وہی کہہ رہے ہو جو ہمارے دشمن کہتے ہیں۔ اِس بات کا حوالہ دیتے ہوئے اُس نوجوان پروفیسر نے کہا اب میں کیا پڑھاؤں جانتا ہوں یہی ہوا، فوجیں باغیوں سے مل گئیں اور چند گھنٹوں کے اندر چیانگ سے شہر اور قصبے چھیننے کے لئے واپس آئیں، کیا طالب علموں سے یہ کہہ دوں کہ چیانگ کے پاس سے بھاپ بن کر اُڑ گئیں؟ یہ باتیں محض دوستوں سے کمروں کے اندر ہوتی ہیں، حالات ایسے ہیں کہ بہت کم لوگ باہر کچھ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ اُس پہ یہاں آزادیٔ خیال کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے!

آج کیلی فورنیا یونیورسٹی دیکھی۔ شہر کے مرکزی حصّے سے پندرہ میل کے فاصلہ پر۔

شعبۂ انگریزی اور فلسفہ کے بعض پروفیسروں سے دلچسپ گفتگو رہی۔ لائبریری دیکھی۔ خیر اور تو جو کچھ، مائکروفلم کا شعبہ دس پندرہ کمروں میں پھیلا ہوا ہے۔ میں تو کیمرے، مشینیں اور ہزاروں کی تعداد میں مائکروفلم دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ کیا ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں کے لئے اس کا عشرِ عشیر بھی ہو سکتا ہے! آج مسز واتومل سے ملنے کے لئے وقت مانگا ہے، اگر موقع ملا تو مُنہ پھوڑ کر لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری کے لئے اُن سے کچھ مانگوں گا۔

۱۵ ار فروری اتوار — برسوں کا اندازہ صحیح نہیں تھا، کل پوربی اور اُتّری شہر دیکھنے گیا تو کم و بیش وہی شکل نظر آئی جو دوسرے شہروں میں ہے، یہاں جس بات نے مجھے متوجہ کیا وہ لباس، بال بنانے کی وضع، عمارتوں کی قطع، شراب خانوں کی زیادتی، تفریح گاہوں کا تنوع ہے، اتنی مختلف وضعوں اور قسموں کے رسٹران مجھے اور کہیں نظر نہیں آئے۔ نئے پن کی انتہا یہ ہے کہ بیورلے ہلس کے قریب فوکس تھیٹر بالکل مقبرے کی شکل کا بنا ہوا ہے۔ گُنبد بھی ہے اور بُرجیاں بھی۔ سوک سنٹر، پبلک لائبریری اور چند دوسری عمارتیں بھی دیکھیں۔ میک آرتھر پارک خوبصورت ہے، کاش یہ حسین قطعۂ زمین کسی بہتر انسان کے نام سے منسوب ہوتا! خیال تھا کہ کہیں نہ جاؤں گا لیکن چھ گھنٹہ گھومتا رہا۔ بڑی چھوٹی سی بات ہے لیکن امریکہ میں مجھے چڑیوں کے چہچہانے کی آواز لاس اینجلس کے علاوہ کہیں اور نہیں سُنائی دی۔

آج کا دن دلچسپ تجربوں کا دن تھا۔ میں جس خاندان میں مقیم ہوں یہ کوئیکرس ہیں۔ آج اُن کا جلسہ تھا، میں بھی شریک ہوا۔ یہ لوگ انسانی برادری، ہمدردی،

رواداری، امن پسندی میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ مراقبہ سے ملتی جلتی خاموش عبادت
ان کا مسلک ہے۔ تین سو سال سے زیادہ دنوں سے اس برادری کے لوگ عیسائی مذہب
سے الگ ہوئے بغیر مسائل کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اُن میں بھی اختلافات ہو گئے
ہیں لیکن عام طور پر اُن کے جلسے اس طرح ہوتے ہیں کہ حاضرین اکٹھا ہو کر خاموش بیٹھ جاتے
ہیں تھوڑی دیر کے بعد کوئی شخص آزادی، ہمدردی، پڑوسی کی محبت وغیرہ کے
موضوع پر انجیل کے حوالہ سے کچھ کہتا ہے اور پھر سب خاموش ہو کر کچھ دیر اُس کے متعلق
غور کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ تقریباً دو گھنٹہ جاری رہا۔ درمیان میں کھانے کے لئے وقفہ ہوا،
زیادہ تر لوگوں نے کھانا یہیں کھایا، ایک دوسرے سے ملے اور دلچسپ باتیں ہوئیں۔
اُن میں سے ہر شخص ہندوستان کی امن پسندی، عدم تشدد اور مہاتما گاندھی سے
متاثر ہے۔ ڈھائی بجے کے قریب میں خاموشی سے نکل گیا کیونکہ مجھے واتومل سے
ملنا تھا۔ یہ سندھی خاندان کئی سال سے امریکہ اور ہوائی کے جزیرے میں تجارت کرتا ہے،
پیسے جمع کر لئے ہیں اور ایک واتومل فاؤنڈیشن کارِ خیر کے لئے قائم کیا ہے۔ میاں
بیوی بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ مسٹر واتومل امریکہ میں ڈھائی گھنٹہ تک ہیں رہا۔
اِس وقت یہ لوگ اپنی آمدنی کا کچھ حصّہ ہندوستان میں ضبط تولید اور خاندانی تنظیم
کے مسئلہ پر خرچ کر رہے ہیں۔ چھوٹا سا فاؤنڈیشن ہے، اب وظائف وغیرہ کم دیتے
ہیں تاہم میں نے اپنی یونیورسٹی کے کتب خانے کے لئے مدد دینے پر زور دیا ہے۔
باتوں سے امید ہے کہ کچھ نہ کچھ مدد ضرور کریں گے۔ اُنھیں تعجب ہے کہ ہندوستان
کے سرمایہ دار تعلیمی اور سماجی کاموں پر روپیہ کیوں نہیں صرف کرتے۔
ساڑھے چھ بجے جب اُن کے یہاں سے واپس آ رہا تھا تو نیا چاند صاف

آسمان میں چمک رہا تھا اور ہالی وُڈ اور بیورے ہلس کی روشنیاں پہاڑیوں اور سڑکوں پر جگمگا رہی تھیں ۔

۱۷ فروری منگل ۔ یہاں ہر طرح کی دلچسپیاں ہیں، ہر طرح کی تفریحیں ہیں، شہر خوبصورت اور متنوع ہے لیکن طبیعت بہت اُلجھ رہی ہے، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کو راس نہ آئے تو جنت بھی تکلیف دہ ہو سکتی ہے ۔ آج پھر کیلی فورنیا یونیورسٹی گیا، شعبۂ انگریزی کے بعض اور پروفیسروں سے مِلا مسز لینسبٹ سے بھی ملاقات ہوئی، یہ وہی ہیں جنھوں نے ڈکنس پر کتاب لکھی ہے ۔ میں نے پوچھا یہ آپ کا خیال ہے یا آپ کے تبصرہ نگار کا کہ ڈکنس کو جو امریکہ پسند نہیں آیا اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر آیا تھا اِس لئے اس کی طبیعت میں جھنجھلاہٹ تھی ۔ کہنے لگیں میں نے اِس طرح نہیں لکھا ہے نیویارک ٹائمز کا تبصرہ نگار ڈکنس کی زندگی سے ناواقف معلوم ہوتا ہے ۔ اور لوگوں سے یونہی رسمی سی باتیں ہوئیں، میں بہت سر کھپا چکا، اس کے علاوہ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں علمی گفتگو کا سلیقہ ہی نہیں ہوتا ۔ کیا باتیں کروں اور کتنی ۔ پروفیسر میک گوُون سے بھی ملا ۔ یہ تھیٹر آرٹ کے پروفیسر ہیں ۔ فلم اور تھیٹر وغیرہ کے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں ۔ اس یونیورسٹی میں یہ شعبہ بہت بڑا ہے ۔ یہ لوگ فلمیں بھی بناتے ہیں میں یہ سمجھنا چاہتا تھا کہ اگر ہندوستان کی یونیورسٹی میں ایسے شعبے قائم کئے جائیں تو کیسا رہے! اس پر یاد آیا کہ یہاں کی یونیورسٹیوں میں آپ کسی قسم کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں ۔ یونیورسٹی آف سدرن کیلی فورنیا میں ہوٹل چلانے اور فیشن پر بھی کورس ہے اور آٹھ ہفتہ میں امتحان ہو جاتا ہے ۔

چند دنوں سے یہاں کے اخبارات میں جارگن سن کے متعلق ہنگامہ ہے۔ کچھ دن پہلے یہ انسانی جسم مرد تھا اب عورت ہے۔ اب جارج سے کرسٹین جارگن سن ہے۔ ڈنمارک میں کامیاب آپریشن کرا کے یہ چھبیس سالہ جوان عورت بن گیا ہے۔ چند دنوں کے اندر اس نئی خاتون کے پاس شادی کے ہزارہا پیغام، ریڈیو اور ٹیلی ویژن، فلم اور تھیٹر کے سیکڑوں دعوت نامے آچکے اور وہ لاکھوں کما چکی ہے۔ بعض اخبارات نے اس کی خود نوشت سوانح عمری بھی شروع کر دی ہے۔

جس دن آیا تھا اُسی دن ایک عجیب وضع کی عمارت نظر آئی تھی اُس پر شرائن (SHRINE) لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک خاص فرقہ کی عبادت گاہ ہے۔ اسلامی وضع کی عمارت ہے۔ ہلال اور انجم کے ساتھ ایک تلوار بھی اُن کا نشان ہے جس پر رومن حروف میں الملائکہ لکھا ہوتا ہے۔ اُس کے تہہ دار ترکی وضع کی سُرخ ٹوپی پہنتے ہیں۔ اپنا تعلق قدیم عربی ممالک سے بتاتے ہیں۔ اُس کے دفتر میں کافی پوچھ گچھ کی، کچھ پتہ نہ چلا۔ دیوار پر انگریزی میں ایک دعا لکھی ہے اُس میں اللہ کا لفظ بار بار آتا ہے۔ ایک طرح کی فری میسن قسم کی چیز معلوم ہوتی ہے جس کے ممبروں کی تعداد ہزاروں سے گذر کر لاکھوں تک پہونچ گئی ہے۔ اِس کا تعلق اسلام سے بظاہر نہیں معلوم ہوتا اگرچہ اُن کی مختلف عبادت گاہوں کے نام ہیں: اسلام، قرآن، مدینہ، قسمت وغیرہ۔ یہاں سے چند گھنٹوں کے فاصلے پر الڈوس ہکسلے اور اِشروڈ رہتے ہیں لیکن میرے دل میں اُن سے ملنے کا ولولہ نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ مجھے اس کی فہرست تو تیار نہیں کرنا ہے کہ میں کتنے لوگوں سے ملا۔ اَپٹن سنکلیر سے ملنے کا خیال تھا وہ بیمار ہیں۔ کل ڈھاکہ کے ڈاکٹر انور علی

اور ڈاکٹر عبدالکریم سے پھر ملاقات ہو گئی۔ شکاگو میں خوب ساتھ رہا تھا۔ کچھ دیر طبیعت بہلی رہی، یہ لوگ بھی گھبرا گئے ہیں۔ آج زیادہ تر خط لکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے لئے سدرن کیلی فورنیا یونیورسٹی میں گیا۔ اب دو تین دنوں میں تھوڑا بہت گھوم لینا چاہتا ہوں، کہاں تک لوگوں سے باتیں کروں گا۔

۱۸ فروری بدھ — اخبارات طرح طرح کی خبریں لاتے ہیں، یہاں کی سماجی زندگی کے متعلق بھی اور بین الاقوامی حالات کے بارے میں بھی۔ مجھے یہاں شدید اقتصادی بحران کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ باہر کوئی امریکہ سے دل سے خوش نہیں اس کا احساس اب ان لوگوں کو بھی ہو رہا ہے، تقاریر اور بیانات کا لب و لہجہ بدلا ہے۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت اپنے متضاد اصولوں اور طریق کار میں الجھی جا رہی ہے۔ کنٹرول ہٹ رہے ہیں، ٹیکس کم کئے جا رہے ہیں، چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں، صدر اور کانگریس میں اختلاف بڑھ رہا ہے — کچھ ہو کر رہے گا۔

آج دوپہر کا کھانا حسن خیام صاحب کے یہاں کھایا۔ پشاور کے رہنے والے ہیں برسوں سے ہالی وڈ میں رہتے ہیں با اخلاق آدمی ہیں، اس وقت ان کے پاس کار نہیں ہے ورنہ اچھی طرح گھوم لیتا حالانکہ میری طبیعت زیادہ گھومنے کے لئے آمادہ نہیں۔ چند گھنٹے خیام صاحب اور ان کی امریکی بیگم صاحبہ کے ساتھ گذرے۔ بیگم خیام نے میرے دل کی بات کہی کہ ویسے تو دیکھنے کی سبھی چیزیں ہیں لیکن اگر کوئی نہ دیکھے تو افسوس کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تاہم میں نے ہالی وڈ کے اکثر حصے اُن کے ساتھ دیکھے۔ مشہور و معروف گراماں چینی تھیٹر کے سامنے سیمنٹ کے فرش پر سیکڑوں ایکٹروں، ایکٹرسوں کے ہاتھوں، قدموں اور

پستول وغیرہ کے نشانات ہیں، اُن کے دستخط بھی ہیں - ایسی چیزیں بعض اور جگہ دیواروں پر بھی نظر آئیں، ظاہر کرتا ہے کہ وہ یہاں آتے ہیں اور اُس کی سرپرستی کرتے ہیں - عمارت چینی وضع کی ہے - ہالی وُڈ باؤل، کھُلا ہوا تھیٹر ہے گرمیوں میں پھولوں کی کثرت سے ڈھک جاتا ہے، یہاں سے موسیقی کے پروگرام ہوتے ہیں ہزارہا آدمی تماشے دیکھنے کے لئے گھنٹوں قطار میں کھڑے رہتے ہیں، بیورلے ہلس پر ایکٹروں وغیرہ کے شاندار، خوبصورت اور وسیع مکانات ہیں - دو ایک اسٹوڈیو نظر آئے مگر اُن میں جانے کی صورت پیدا نہ ہوسکی، مجھے کچھ ایسی فکر بھی نہیں ہے - یہ اندازہ ضرور ہوا کہ یہ ایک الگ دنیا ہے جس کا مطالعہ کرنے اور جس سے لطف اندوز ہونے کے لئے بہت وقت اور شوقِ فضول کی ضرورت ہے - یہاں تو لوگوں کو اور سیّاحوں کو اس سے بھی دلچسپی ہے کہ یہ گیری کوپر کا کتّا ہے اور یہ مرنالوائے کی بلّی، اور لوگ انھیں کو دیکھ کر، ان کی تصویر کھینچ کر اتنے خوش ہوتے ہیں کہ اگر کوئی اُن کی کامیابی پر خوش نہ ہو تو بیوقوف نظر آنے لگے۔

آج ہوا قیامت کی چل رہی تھی، سڑکوں کے کنارے اور پہاڑیوں کے اوپر درخت از خود رفتہ متوالوں کی طرح جھوم رہے تھے اور راستہ چلنا دشوار تھا۔

۲۰ رفروری جمعہ - خیال تھا کہ دو ایک دن کے لئے اور ٹھہر جاؤں گا لیکن جی نہیں چاہتا - کل نیویارک کے لئے روانہ ہوجاؤں گا - ابھی سے سفر کے خیال سے اُلجھن ہو رہی ہے، تین دن اور تین رات کا مسلسل سفر - تھکا دینے اور اُکتا دینے والا - لیکن اس بات سے اطمینان ہے کہ اب امریکہ میں مجھے اِدھر اُدھر جانا نہیں ہے -

کل نکلا تو یہاں کے مشہور ہندوستانی تاجر موسیٰ راوجی سے ملنے چلا گیا۔ گرم مسالے کے تاجر ہیں اور امریکہ کے حساب سے بھی دولتمند ہیں۔ بارہ سال یورپ میں رہے ہیں، بیوی یوروپین ہے، آٹھ سال سے یہاں ہیں۔ گھنٹہ بھر اُن کے یہاں کے رہا۔ پھر سینما چلا گیا، صرف اس خیال سے کہ جو سرزمین ان تصویروں کی تخلیق کرتی ہے وہاں بھی ایک تصویر دیکھ لوں۔ ہائی نون دلچسپ ڈرامائی فلم ہے جسے اکیڈمی انعام ملنے کی امید ہے بعض اور مقامات مثلاً RANCHO LA BREA کے غار دیکھے جہاں سے بہت سے جانوروں کے فاسل یعنی منجمد ڈھانچے نکلے ہیں جن کی عمر پانچ کروڑ سال بتائی جاتی ہے۔ شام کو مسٹر سراج قادری کے یہاں کھانا تھا۔ یہ بھی یہاں آٹھ نو سال سے ہیں یہیں شادی کر لی ہے، انجینیری کے امتحانات پاس کئے ہیں۔ دلچسپ، خلیق اور ترقی پسند ہیں۔ اُن کے یہاں کئی اور حضرات سے ملاقات ہو گئی۔ باتوں میں رات کے دس بج گئے۔ جب وہ مجھے گھر پہونچانے کے لئے نکلے تو دس بارہ میل چل کر سمندر کے کنارے آگئے۔ میں نے اِس سینٹا مونیکا بیچ کو دن کے وقت دیکھا تھا، رات میں اس کا حسن کچھ اور ہی تھا، بحرالکاہل کہنے کو کاہل لیکن پُرشور تھا، موجوں کی آواز بھیانک نہیں لیکن پُرجلال ضرور تھی۔ حدِ نظر تک روشنیوں کے جال بچھے ہوئے تھے کیونکہ لاس اینجلس میں نہ جانے کتنے بیچ ہیں اور سب کی دیکھ بھال ہوتی ہے، سبھی اچھی تفریح گاہوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

بارہ بجے رات کو واپسی ہوئی، نیند نہیں آرہی تھی اخبار دیکھنے لگا۔ ہاورڈ فاسٹ سے اُس کے عقائد کے متعلق پوچھ گچھ ہو رہی ہے اور "سرخ شکاری" کا سلسلہ جاری ہے۔ پھر ایک خبر پہ ہنسی آگئی اور میں نے اخبار رکھ دیا۔ ایک شخص کو

کچھ فرصت تھی اس لئے وہ ایک شارع عام پر صرف بتیس ۳۲ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کار چلا رہا تھا حالانکہ وہاں اسے کم سے کم پچپن ۵۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلانا چاہئے تھا، اُس پر مقدمہ چلا، جج اور جوری نے متفقہ طور پر اُس کے لئے سزائے قید تجویز کی وجہ یہ بتائی گئی کہ وہ تیز کار چلانے والوں کی راہ میں رُکاوٹ پیدا کر رہا تھا۔

آج صبح دس بجے قادری صاحب اپنی کار لئے ہوئے آ گئے اور یہاں کے کاؤنٹی میوزیم لے گئے۔ یوں تو ہر میوزیم کی طرح یہاں بھی بہت سی چیزیں ہیں لیکن سب سے خاص چیز RANCHO LABREA کے غاروں کے مجسمے ہیں۔ ہر جگہ کے میوزیم ایک ہی سے معلوم ہوتے ہیں، یہ سارے میوزیم تقریباً بیس سال کے عرصے میں اتنے بڑے اور خوبصورت بنائے گئے ہیں۔ وہاں سے نکل کر EXPOSITION PARK میں وہ "تختۂ گل" دیکھا جس میں گلاب کے پھولوں کے پندرہ ہزار پودے اور ۱۴۵ قسمیں ہیں۔ بعض پودوں میں پھول آ رہے تھے۔ اس باغ کے دروازے پر انگریزی میں یہ خوبصورت فقرہ لکھا ہوا ہے "جس طرح ستارے آسمان کے اشعار ہیں اُس طرح پھول زمین کے اشعار"۔

یہاں ایک فلم کمپنی ہے جس کا نام ہے CASCADE ان لوگوں نے ہندوستان کے لئے بھی تعلیمی اور معلوماتی فلمیں تیار کی ہیں ہ اُس کے رابطہ افسر مسٹر رابرٹ براؤن کو ہندوستان کے کونسل جنرل مقیم لاس اینجلس مسٹر عظیم حسین کے چند اعزّا کو بعض اسٹوڈیو دکھانا تھا، ایک ذریعہ سے میرا بھی تعارف ہو گیا اور میں بھی ان لوگوں کے ساتھ اسٹوڈیو دیکھنے چلا گیا۔ پہلے ہال روشن فلم کمپنی کے اسٹوڈیو دیکھے۔ یہ یہاں کی کوئی بڑی کمپنی نہیں ہے لیکن اس کے سامان، انتظام، عارضی بازار، مکانات وغیرہ

دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں ۔ آج کل ہر جگہ ٹیلی ویژن کے لئے فلمیں تیار ہو رہی ہیں کئی اسٹوڈیو میں اس وقت بھی فلمیں بن رہی تھیں ۔ عجیب دنیا ہے مسٹر براؤن نے ، جو بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں جی لگا کر ان جگہوں کی سیر کرائی اور بہت سی ٹکنیکل باتیں سمجھائیں ۔ ذرا دیر کے لئے وارنر برادرس کا اسٹوڈیو بھی دیکھا ، اس کی وسعت اور انتظامات کا کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے ۔ ہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہالی وڈ کے اس رسٹراں میں لنچ کھایا گیا جس میں ایکٹر اور ایکٹرسیں اکٹھا ہوتے ہیں ۔ شام کو واپسی ہوئی ۔ کچھ دیر قیام گاہ پر ٹھہر کر پھر نکلا تو سر راہ آگرہ کے مسٹر گرپرشاد استھانا سے ملاقات ہوگئی ، وہ سدرن کیلی فورنیا یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں ۔ اصرار کرکے اپنے گھر لے گئے ، پوری اور ترکاری پکائی اور ہم دونوں نے مزے لے لے کر کھایا ، پھر وہ مجھے مسٹر رشرڈ ڈ رابرٹس سے ملانے لے گئے ۔ یہ میرے جاننے والے نکلے ۔ لکھنؤ کے سی آئی ڈی انسپکٹر ۔ یہاں تحقیق جرائم کی تعلیم کے لئے آئے ہوئے ہیں ۔ بے حد با اخلاق ہیں ۔ بارہ بجے رات تک دنیا بھر کی باتیں ہوئیں افسوس ہے کہ ان لوگوں سے بالکل آخری دن ملاقات ہوئی ۔

۲۴ فروری منگل ۔ ۲ ، گھنٹے کے سفر کے بعد آج نیویارک پہونچ گیا ، پھر عمارتوں ، انسانوں اور کاروبار کے اسی جنگل میں ۔ مگر یہ بات کہاں نہیں ہے کیلی فورنیا ہی کو لیجئے جسے ابھی دیکھ کر آیا ہوں اور اس کی ترقی کا کیا ٹھکانا ہے ۔ سونا ، مٹی کا تیل ، اناج ، لوہے ، کوئلہ اور لکڑی کے کارخانے ، ہوائی جہاز بنانے کی فیکٹری جس میں لاکھوں آدمی کام کرتے ہیں ، جہازرانی ، سینما ، یہاں کس چیز کی کمی ہے ۔ ایک صاحب نے بتایا کہ لاس اینجلس میں گذشتہ سال اتنے آدمی دوسری جگہوں سے آباد ہونے کے لئے

آئے کہ ان کی اوسط ایک ہزار روزانہ سے زیادہ پہونچتی ہے اور مجھے تعجب نہیں۔ اس شہر میں پھیلنے اور بڑھنے کی بہت گنجائش ہے۔ آب و ہوا اُس پر مستزاد ہے۔ اس لاس اینجلس سے میں ۱۲ر فروری کو چلا، شہر سے باہر ہوتے ہی میلوں تک صنعتی کارخانے ملتے گئے، ان کا سلسلہ ختم ہوا تو میلوں تک سنگترے کے باغ — فضا بدلتی رہی، دوسرے دن پہاڑوں پر برف اور پھر ہر جگہ برف ہی برف۔ ایک دن پہلے ادھر سے برف کا طوفان گذرا جو برف کے تودوں اور گرے ہوئے درختوں کی شکل میں اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ اس مرتبہ میں جس ٹرین سے آیا ہوں وہ جنوبی ریاستوں سے ہوکر گذرتی ہے، یہاں امریکہ کے قدیم باشندوں یعنی رِڈ انڈین کی بڑی آبادی ہے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں سے اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ مجھے رنج ہے کہ میں جنوبی حصّہ میں نہ جا سکا لیکن لوگوں سے گفتگو کرکے اندازہ ہوا ہے کہ وہاں ابھی ترقی کی اتنی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہے جتنی سفید فاموں کے علاقہ میں۔ مناظر میں سب سے اہم تبدیلی یہی ہے کہ جو سبز درخت، پودے اور پھول کیلی فورنیا میں نظر آتے تھے اب وہ پھر غائب ہیں تاہم نیویارک پہونچ کر جس ٹھنڈک کا خطرہ تھا وہ بھی نہیں ہے۔

تھکن کے باوجود آج ہی راک فیلر سنٹر گیا تو وہاں بہت سی ڈاک ملی، نقوش اور سویرا لاہور کے نئے نمبر، جناب اثر لکھنوی کی نئی کتاب مطالعہ غالب اور راجندر شیدا کے مضامین کا مجموعہ مطالعے اور جائزے۔ دوستوں اور عزیزوں کے خطوط — سوچتا ہوں کہ جب یہ دولت یہاں بھی ملتی جا رہی ہے تو میں اُداس کیوں ہوں!

۲۶ر فروری جمعرات — دو دن کوئی خاص کام نہیں کیا۔ کچھ خط لکھے کچھ پڑھتا رہا۔ ٹرانکور کے ایک مدراسی ڈاکٹر مل گئے تھے کل، اُن کے ساتھ گھومتا رہا۔ پھر سنیما چلا گیا۔

وہی ہنگامہ آرائیاں، وہی طوفان خیزیاں۔ بے معنی اور بے جان۔ خیال تھا کہ آرام کروں گا لیکن آرام کے مفہوم میں آرام بھی نہ کر سکا۔

ایک رسالہ میں حافظ شیرازی کی ایک مختصر مثنوی آہوئے وحشی پر ایک مضمون دیکھا۔ میں نے یہ نظم کبھی حافظ کے مطبوعہ کلیات میں نہیں دیکھی ہے، ممکن ہے میری کوتاہ نظری ہو لیکن انگریزی ترجمہ سے اِس مثنوی کے متعلق کچھ زیادہ اندازہ نہ ہو سکا۔ مضمون نگار نے تو وہ تاویلات کی ہیں کہ واقعی غور کرنا پڑا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے قرآن مجید، مثنوی مولانا روم، مثنوی دقیقی، سکندر نامہ نظامی کے بہت سے متوازی اور مماثل مقامات پیش کئے ہیں اور مثنوی کے آخری اشعار سے حافظ کا نظریۂ شاعری اَخذ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہو سکتا ہے کہ فن کار وہ ہے جس کی خواہشوں کی پیاس کبھی نہیں بجھتی، تکمیل نہ ہونا ہی، فراق ہی اُس کی اِس پیاس کی بنیاد ہے، وہ جان بوجھ کر اپنی خواہش کی چیزیں کھو دیتا ہے تاکہ ان کے ہجر سے فکر اندوز ہو اور اپنے خیالات کو پرِ پرواز عطا کرے۔ یہ نظم فارسی میں ملے تو رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔

آج خواتین کا لباس فروخت کرنے والی ایک دوکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے بالا قد اور موزوں جسم کی عورت کے لئے ایک نئی تشبیہ نظر پڑی۔ "ایسی جیسے دیا سلائی کی تیلی"! اور ساری دوکان میں بہت بڑی بڑی تیلیاں نمائشی مجسموں کے برابر لٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے ہندی اُردو فارسی کے مشرقی شعراء یاد آ گئے اور ان کی خیال آفرینیاں۔ شائد کوئی ماہر نفسیات اس جدت میں یہاں کے ذہنی رجحانات کا عکس ڈھونڈھ نکالے مجھے تو محض بد ذوقی معلوم ہوتی ہے۔

۲۸/ فروری سینیچر — کچھ پڑھتا ہی لکھتا رہا - تنہا کہاں وحشیوں کی طرح گھومتا پھروں - دو ایک میوزیم نہیں دیکھے ہیں کسی دن دیکھ لوں گا، کچھ لوگوں سے ملنا ہے ایک ایک کر کے مل لوں گا - ہندوستان اور پاکستان کے متعدد آدمیوں سے اِدھر اُدھر ملاقات ہوتی رہتی ہے لیکن پھر بھی تنہائی کا احساس کم نہیں ہوتا نہ ہم خیال ملتے ہیں نہ ہم زبان -

ایک حیرت خیز بات! میں نے جنوری میں یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو لکھا تھا کہ میں نے اپنے سفر کی مدت کم کرالی ہے جولائی میں واپس آجانا چاہتا ہوں اس لئے میری سال بھر کی چھٹی میں دو مہینے کی تخفیف کر دی جائے، آج جواب آیا ہے کہ درخواست نامنظور کی جاتی ہے - مجھے حیرت ہے کہ معاملہ کیا ہے - دو ایک دوستوں کو لکھ رہا ہوں کہ ذرا معلوم کر کے مفصل لکھیں -

۲/ مارچ دوشنبہ — میرا ڈائری کا جو تصوّر ہے اُس طرح نہیں لکھ رہا ہوں کیونکہ حقیقتاً میں اسے کئی چیزوں کا مجموعہ بنانا چاہتا ہوں میرے دل میں جو کچھ ہے اُس کے ساتھ بہہ نہیں جانا چاہتا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں خود اس میں سے غائب ہو جاؤں، یہ سطریں اُسی سمجھوتہ کے ماتحت لکھی جا رہی ہیں - دل و دماغ میں نہ جانے کیا کیا گذر رہا ہے، کیسے کیسے خیالات آتے اور گذر جاتے ہیں، نہ سب اس روزنامچہ یا سفرنامہ میں جگہ پا سکتے ہیں نہ یہ ضروری ہے - یہ میری سوانح عمری نہیں ہے اور نہ اعترافات - دنیا کے پردے پر بہت کچھ ہو رہا ہے جس سے مجھے دلچسپی ہے، جس کا میرے اور میری ہی طرح کروروں انسانوں کے مستقبل سے تعلق ہے، چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں اس سلسلہ میں محسوس کرتا ہوں اُس کا ذکر کروں

لیکن پھر تو اس کی نوعیت ہی بدل جائے گی ، اس کے لئے میں کہیں اور موقع نکالوں گا۔ سڑکوں کے کنارے ، دفتروں کے اندر ، پارکوں میں ، تفریح گاہوں کی روشنی اور تاریکی میں بہت سے کھیل ہو رہے ہیں ، ان سے میرا تعلق نہ سہی ، میری آنکھیں تو بند نہیں ہیں لیکن میں ان کے بارے میں صرف اشارے کرنا چاہتا ہوں ، نہ جانے کتنے لوگوں سے ملتا ہوں ، کیسی کیسی باتیں ہوتی ہیں ، سب لکھوں تو ڈائری شیطان کی آنت ہو جائے ۔ پھر میں لکھتا کیا ہوں ! اس کے متعلق میں نے کوئی اصول وضع نہیں کیا ہے ، اتنا ہی لکھتا ہوں جتنا مجھے ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

چند دنوں سے پڑھنے میں کچھ زیادہ جی لگ رہا ہے ۔ جو کتابیں پڑھ رہا ہوں اُن میں سے ایک کا نام ہے "امریکہ اور اُس کے دانشور" بہت سے اہم لوگوں کے مضامین ہیں ، بحث یہ ہے کہ امریکہ کی تہذیب سے کیا مراد ہے ؟ دانشوروں کا رویہ اس کے متعلق پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے ؟ کیا عوامی تہذیب کو اپنایا جا سکتا ہے ؟ کیا یورپی تہذیب سے ہمارا پیچھا چھوٹ رہا ہے ؟ کتاب اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی ، پڑھ لوں گا تو میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں اُس کا ذکر کروں گا کیونکہ یہی اس وقت یہاں کے عقلا کے لئے سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہے ۔

کل رات ایک جگہ دعوت تھی اُس میں زیادہ تر وہ امریکی تھے جو ہندوستان میں غیر فوجی کی حیثیت سے رہ چکے ہیں ۔ چند ہندوستانی بھی تھے ، صحبت دلچسپ تھی ، غیر سیاسی اور تفریحی ۔ آج دو کالونی کا چکر لگاتا رہا ۔ شام کے وقت مسٹر لورڈ ، اڈیٹر نیو ورلڈ رائٹنگ سے ملنے گیا کیونکہ ان کے ذریعہ سے اور لوگوں سے ملنا ہے ۔ وہاں کتابوں کی نشر و اشاعت کا ذکر چھڑ گیا اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں

۳ر مارچ منگل — موسم کی خرابی کے باوجود کیسا خوبصورت دن! آج میں نے وہ موقع ڈھونڈھ نکالا جس کی تمنا مدت سے تھی صبح ماسز اینڈ مین اسٹریم کے دفتر گیا اور وہاں سلن، ہاورڈ فاسٹ، جروم اور میگل سے ملاقات ہوگئی اور دو گھنٹہ کام کی باتیں ہوئیں۔ یہاں چند آسانیوں کے باوجود ترقی پسندوں کی راہ بڑی دشوار گذار ہے، سرمایہ دار پریس کسی شکل میں بھی اُن کے کارناموں کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ نہ یونیورسٹیوں کے پروفیسر، نہ اخباروں کے تبصرہ نگار ان کا نام لیتے ہیں، اگر مخالفت میں لکھتے ہیں تو کتابوں کا نام نہیں لیتے، جملے نقل نہیں کرتے بلکہ ایک سرپرستانہ انداز میں اُنھیں گمراہ کہہ کر یا ہزارہا دفعہ کے دُہرائے ہوئے الزامات لگا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اسے یہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کسی حد تک اس علیحدگی کے ذمہ دار یہ خود بھی ہیں۔ گفتگو اس بات پر تھی کہ اس حصار کو کس طرح توڑا جائے۔ جو کچھ میں سمجھ سکتا تھا وہ میں نے اُنھیں بتایا کیونکہ مجھے سیکڑوں نقادوں اور ادیبوں سے مل کر بعض باتوں کا اندازہ ہو گیا ہے، انھیں یہ مواقع بھی فراہم نہیں ہیں۔ وہاں سے نکل کر ترقی پسند یہودی رسالہ جیوش لائف کے دفتر میں آیا، یہاں حقیقتاً لوئی ہیرپ سے ملنا تھا جن کی کتاب سوشل روٹس آف آرٹس میں نے پڑھی تھی اور جس کے بعض حصّوں سے متاثر ہوا تھا— وہاں ڈائرکٹروں کا جلسہ ہو رہا تھا، مجھے وہیں بلا لیا گیا اور وہاں بھی بہت سی ضروری اور دلچسپ باتیں ہوئیں۔ اِن جگہوں پر کھلے ذہن سے گفتگو ہوئی جس کے لئے یہاں ترس رہا ہوں۔ اِن لوگوں کو ہندوستان کے متعلق بہت کچھ جاننے کی خواہش ہے کیونکہ انھیں یقین ہے کہ وہاں صبح پہلے ہوگی۔ جن حالات میں یہ لوگ کام کر رہے ہیں

وہ لائقِ تحسین ہی نہیں سبق آموز بھی ہے۔ لوئی ہیرپ سے ادب کے متعلق کم
عام حالات کے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں۔
شام کے وقت ہارپر میگزین کے دفتر گیا اڈیٹر مسٹر جان فشر بڑے اخلاق سے
پیش آئے۔ ہندوستانی ادب کے امریکہ میں شائع کرنے کے متعلق باتیں ہوئیں،
بہت سے ناشروں سے زیادہ باخبر اور سُلجھے ہوئے انسان ہیں۔ گفتگو کے
درمیان میں پوچھنے لگے کہ آپ کے خیال میں چار نکاتی پروگرام ہندوستان میں ختم
کر دینا چاہیے یا باقی رکھنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بات کچھ اس طرح پوچھی گویا میرے
ہی جواب پر اس کا فیصلہ ہوگا۔ اگر میں کہہ دوں کہ بند کر دینا چاہیے تو بند ہو جائے گا،
اگر کہوں کہ جاری رہنا چاہیے تو جاری رہے گا۔ میں نے گول مول سا جواب دے کر
ٹال دیا لیکن میں نے اُنھیں یہ باور کرا دیا ہے کہ ہندوستانی امریکی حکومت کو سامراجی
حکومت سمجھتے ہیں۔ چلتے وقت انھوں نے پروفیسر زابل کی کتاب LITERARY
OPINIONS IN AMERICA دی جسے میں خریدنا چاہتا تھا لیکن آٹھ ڈالر
خرچ کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مجھے ان کی یہ شرافت پسند آئی، جو کتاب نذر کرے
اُس کی شرافت کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے!
۴؍ مارچ بدھ — صبح کے اخباروں میں استالین کی خطرناک بیماری کی اچانک
خبر نے رنجیدہ کر دیا۔ اس خبر سے متعلق یہاں کے اخبارات کی سرخیوں اور ان کے
پیچھے سے جھانکتی ہوئی شیطانی مسرت کو کبھی نہ بھولوں گا! مرنا تو سبھی کو ہے لیکن
افراد مرتے ہیں تاریخ نہیں مرتی! استالین اُن عوام کا بھی نام ہے جس کا وہ رہنما ہے۔
اخباروں میں اُلجھا ہی ہوا تھا کہ مسٹر رچرڈ دالش کا ٹیلیفون آیا کہ پرل بک

اتفاقاً آ گئی ہیں ملنا ہو تو آج تین بجے مِل لیجئے۔ بارش ہو رہی تھی میں لنچ کے بعد نکل پڑا، دو بجے راک فیلر سنٹر پہونچا اور تین بجے پرل بک سے ملنے پارک ایوینیو۔ ناول نگاری، ادب اور فن کے متعلق کم باتیں ہوئیں ہندوستان میں تعلیم، زبان، کتب خانے، نشر و اشاعت وغیرہ کے متعلق زیادہ ــــ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک برمی خاتون می می کھیا تنگ آ گئیں۔ اُنھوں نے برمی زندگی کے متعلق سوانحی انداز میں ایک کتاب اور چند کہانیاں لکھی ہیں، پرل بک نے غیر معمولی تعریف کی اور ناول لکھنے پر اصرار کیا۔ گفتگو کا یہ پہلو تجارتی معلوم ہوتا تھا۔ برمی خاتون ذہین اور معقول معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے پرل بک سے پوچھا کیا آپ کا جی نہیں چاہتا کہ نئے چین کو بھی دیکھیں۔ کہنے لگیں، نہیں، میں نے پھر پوچھا آپ کا کیا خیال ہے وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ وہاں کے لوگوں کے لئے مناسب ہے یا نہیں؟ کہنے لگیں، مجھے یقین ہے کہ جتنا اعتراض یہاں امریکہ میں کیا جا رہا ہے وہ صحیح نہیں ہے، مگر وہاں اتنی کامیابی بھی اتنے کم وقت میں نہیں ہو سکتی جتنی بتائی جاتی ہے۔ کوئی سوا گھنٹہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں نے خاص طور سے اُن امریکی مصنفوں کا ذکر کیا جن کی کتابیں ہندوستان میں پڑھی جاتی ہیں جیسے مارک ٹوین، ڈاس پیساس، جیک لنڈن، ہاورڈ فاسٹ، اسٹائن بک، پرل بک وغیرہ، فاکنر کے لئے میں نے کہا ہندوستان میں کم لوگ اُسے پڑھتے ہیں اور عام طور سے بہت پسند نہیں کرتے، کہنے لگیں یہی حال امریکہ میں بھی ہے۔

وہاں سے نکل کر میں نے جفرسن اسکول آف سوشل سائنسز کی راہ لی، ہاورڈ سلیسم سے ملنے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس خلوص، محبت اور بے تکلفی کے

ڈیڑھ گھنٹے گذرے، امریکہ میں ترقی پسندی، جمہوریت کے مستقبل، نیگرو سوال اور بہت سے دوسرے مسائل پر باتیں ہوئیں۔ اپنی نئی کتاب REVOLUTION IN PHILOSOPHY پریس بھیج رہے ہیں۔ میں نے سیکھنے اور سمجھنے کے لئے امریکی ادب اور تجرباتی عملیت کے متعلق اپنے خیالات پیش کئے جسے انھوں نے پسند کیا، ہندوستان میں وسیع تر ادبی تحریک اور مارکسی نقطۂ نظر کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا اُسے بھی اُنھوں نے مناسب بتایا۔ فکر اور محنت سے تھکا ہوا اور مطالعہ کی کثرت سے شکنوں سے بھرا ہوا چہرہ، لیکن سادہ اور ہنستا ہوا۔ میں نے اُن کی ہر کتاب کے ترجمہ کی اجازت لے لی ہے۔ اِن دوستوں کا خلوص، اندازِ گفتگو، بے ریا اخلاق ایسا ہے جسے "غیر امریکی" کہہ سکتے ہیں۔

۶ مارچ جمعہ ۔ آج صبح استالین کے مرنے کی خبر آئی۔ ایک بہت بڑا عالم، دانشور، انسان دوست، اَمن پسند، عوام کا محبوب رہنما دنیا سے اُٹھ گیا! اُس کے علم کی ضیا اور اُس کے یقین کی گرمی سے میرے شعور نے بھی کچھ نہ کچھ روشنی اور گرمی حاصل کی ہے۔ وہ اپنے کارناموں میں اور اچھے انسانوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا! کوئی یہاں کے اخبارات پڑھے تو اُس کی سمجھ میں بہت کچھ آجائے گا۔ کم سے کم یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سرمایہ دار اور سامراج پرست دنیا کے لئے کیوں قابل نفرت تھا اور عوام کو کیوں عزیز! یہاں کے سرکاری پروپیگنڈے کی ساری طاقت اس پر صرف ہو رہی ہے۔ (اور اسے یہ لوگ راز نہیں رکھنا چاہتے) کہ سویت دوستوں اور ہمدردوں کے ذہنوں میں ہر طرح کا انتشار پیدا کر کے اُن کے یقین کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ لاعلمی اور ابہام سے بے یقینی اور تاریکی کی طرف

راستہ جاتا ہے۔ یقیناً یہ بڑا نازک وقت ہے، شدید آزمائش اور مستقل مزاجی کا وقت، ذمہ دارانہ رہنمائی کا وقت! میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ موقع نہیں ہے۔ پھر لکھوں گا۔ کہیں نہیں گیا، کسی سے نہیں ملا، صرف بے ارادہ سڑکوں پر پھرتا رہا۔

۷ / مارچ سینچر ۔ یہاں کے اخبارات، اُن کی سرخیاں، ان میں شائع شدہ مضامین، اُن کے اندر چھپی ہوئی ناپاک اور انسان دشمنی سے مملو خواہشیں دیکھ دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے لیکن اُنھیں پڑھتا بھی ہوں۔ اشتراکی تنظیم کس طرح انفرادی شعور، ذاتی اور جماعتی نقطۂ نظر کو بدل دیتی ہے، اس کا انھیں اندازہ نہیں۔ یا ممکن ہے ہو اور محض دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے یہ سوچ رہے ہوں کہ رُوس اور اُس کے حلیف اشتراکی ملکوں میں انقلاب ہو جائے گا۔ میلنکوف کا انتخاب اس قدر جلد ہو گیا اس پر اُنھیں حیرت ہے اور اندر اندر ''تخت و تاج'' کے لئے جنگ ہوتی ہوئی بھی دکھائی دے رہی ہے، دیر ہوتی تو بھی وہ یہی کہتے۔ ایسے ہی موقعوں پر ضمیر ننگا ہو کر سامنے آتا ہے۔

۹ / مارچ دوشنبہ ۔ کل کا زیادہ حصّہ کاظم صاحب کے یہاں گذرا، وہ اتنی دُور رہتے ہیں، جاؤ تو دیر ہو ہی جاتی ہے۔ برفباری ہو رہی تھی لیکن میں نے وعدہ کر لیا تھا اس لئے چلا گیا تھا ورنہ ہمت جواب دے رہی تھی۔ میں نے اپنا ایک بکس اور کتابیں وغیرہ وہیں رکھ دی تھیں، کل لایا، بڑی اُلجھن ہو رہی ہے یہ بھاری بکس اور کتابیں لئے ہوئے کیسے پھروں گا۔ اِدھر معدہ کچھ غنیمت تھا آج پھر کھانے سے نفرت ہو رہی ہے، طبیعت گھبرا رہی ہے۔ آج صبح مسٹر فلپ ٹالبوٹ سے ملا،

یہ امریکن یونیورسٹیوں کی ایک انجمن کے سکریٹری ہیں جس کا کام یہ ہے کہ مختلف مُلکوں سے یونیورسٹیوں کے لئے معلومات فراہم کرلے۔ کئی سال ہندوستان میں رہ چکے ہیں، آدمی تیز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ جس ادارہ کو چلا رہے ہیں اُس کا کام کئی حیثیتوں سے امریکہ کے لئے مفید ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے بعض اہم باتیں ان لوگوں کے علم میں آجاتی ہیں۔ امریکہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ بھی کررہا ہے۔

دوپہر بعد مسٹر گل پیٹرک سے مِلنے گیا۔ دو مہینہ جاپان، ہندوستان پاکستان اور انگلستان کا دَورہ کرکے واپس آئے ہیں، خوش، چاق چوبند۔ دو سَو صفحوں کی ڈائری لکھ لائے ہیں جس میں بہت کچھ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کام کرنا جانتے ہیں۔ نئے تاثرات لے کر آئے ہیں، ہندوستان میں اُردو کی بقا کی طرف سے اندیشہ کا اظہار کرتے ہیں۔ مدراس، بنگلور اور کلکتہ میں بہت سے ادیبوں سے مِل کر آئے ہیں، کہتے ہیں کہ میں نے آپ کا ذکر اُن سے کیا ہے اور اُنھیں آپ سے مِلنے کا مشتاق بنادیا ہے۔ یہ خیال اِدھر مجھے خود برابر ہوتا رہا ہے کہ مختلف زبانوں کے لوگوں کا زیادہ اور بار بار ملنا، ہندوستانی ادب کی تنظیم کے لئے ضروری ہے۔

پھر نارمن کزنس سے ملا۔ مزے کے آدمی ہیں، امریکی تو ہیں ہی، ایک طرح کی عالمی حکومت میں عقیدہ رکھتے ہیں، حال ہی میں اپنا سفرنامہ لکھا ہے اُس میں بھی یہی آرزو ظاہر کی ہے اور اپنے انداز میں یہ کہا ہے کہ انسانوں نے جنگ ایجاد کی ہے وہی امن بھی قائم رکھ سکتے ہیں۔

انگلستان جانے کو صرف چند دن رہ گئے ہیں لیکن طبیعت گھبرا رہی ہے۔ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اگر وہاں بھی جی نہ لگا تو!

یہاں کا زمانۂ قیام ختم کے قریب ہے لیکن اب بھی کبھی کبھی جب دل سوال کرتا ہے کہ یہاں آنے سے کیا فائدہ ہوا اور جب سود و زیاں کا یہ جھگڑا نہیں چکتا تو غالب کا ایک شعر تسکین کے لئے آجاتا ہے ؎

دِل مت گنوا، خبر نہ سہی، سَیر ہی سہی　　اے بے دماغ آئینہ تِمثال دار ہے

۱۱ مارچ بدھ — دو دن میں کئی آدمیوں سے دلچسپ ملاقاتیں ہوئیں۔ کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈارف مین سے اصول لسانیات کے متعلق گفتگو ہوئی۔ کل ہی ڈاکٹر لطف علی صورتگر سے بھی ملا۔ یہ تہران یونیورسٹی کے ادبیات کے پروفیسر ہیں اس وقت کولمبیا میں پڑھا رہے ہیں۔ لندن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں اور پروفیسر ابر کرامبی کے شاگرد۔ اِدھر مجھے یہی دُھن ہے کہ ایرانی اصولِ شاعری میں یونانی اور عربی اثرات کا پتہ لگا کر اُس کا سلسلہ اُردو میں ڈھونڈھا جائے اور پھر اُس کا مقابلہ سنسکرت کے جمالیاتی فلسفہ سے کر کے کوئی نظریہ قائم کیا جائے جو تاریخی اور سماجی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور و فکر کے لئے بنیاد کا کام دے سکے۔ یہ کام مشکل ہے لیکن اِس میں کچھ وقت لگانا مفید ہی ہوگا۔ ڈاکٹر صورتگر سے میں نے دریافت کیا کہ ایرانی تنقید نگاری کی کوئی اچھی تاریخ بھی لکھی گئی ہے، انھوں نے جواب دیا جس قسم کی آپ چاہتے ہیں ویسی کوئی کتاب نہیں ہے۔ خود انھوں نے ایک کتاب شائع کی ہے "سخن سنجی"۔ اس میں مغربی اصولِ تنقید سے فارسی ادب کو جانچا ہے، نقطۂ نظر غیر تاریخی اور غیر سماجی ہے۔ اسی سلسلہ میں پروفیسر کاظم کیہانی سے بھی ملا، اُن سے ایرانی تہذیب اور سیاست کے متعلق باتیں بہت سی ہوئیں لیکن اس مسئلہ میں مدد نہ مِل سکی۔ آج ڈاکٹر برنہارڈ گائگر سے مِل کر بیحد خوشی ہوئی۔

یہ ویانا یونیورسٹی کے مستشرق ہیں۔ ایران شناسی میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ ہٹلر کے ستائے ہوئے تقریباً پندرہ سال سے امریکہ میں ہیں۔ فارسی قدیم اور سنسکرت وغیرہ کے عالم ہیں۔ ایرانی فکر اور فلسفہ کا مطالعہ خاص طور سے نہیں کیا ہے لیکن باتیں دیر تک ہوئیں بوڑھے آدمی ہیں اور اس جلاوطنی کے عالم میں مستقبل کے خیال سے پریشان کیونکہ جن جواہرات کے تاجر ہیں اُن کے گاہک اور قدرداں بہت کم ہیں۔ ویانا میں ٹیگور سے اچھے تعلقات ہو گئے تھے اب بھی اکثر ہندوستانیوں کو جانتے ہیں، اشوک کے ایک کتبہ پر اور ایک قدیم پہلوی کتبہ پر مضامین لکھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان مضامین سے ایک ڈالر بھی نہیں ملتا۔

اور کیا لکھوں۔ اِدھر چند دن یہاں کے اخباروں میں جو خیال آرائیاں ہوتی رہی ہیں اور یہاں کے زعماء جو متضاد بیان دیتے رہتے ہیں اُنھیں دیکھ کر اُن ماں بیٹے کا خیال آتا ہے جو نجومی ہونے کے مدعی تھے۔ بادل دیکھ کر ماں کہتی تھی بارش ہوگی، بیٹا کہتا تھا نہیں اور دو میں سے ایک کی پیشین گوئی سچ نکلتی تھی، دونوں مل کر نجومی تھے یہاں اُس کی شکل یوں ہے۔ رُوس کمزور ہے، رُوس مضبوط ہے۔ اُس کے پاس ایٹم بم ہیں، نہیں ہیں۔ چین والے دیکھ لینا الگ ہو جائیں گے، ماؤ اور میلنکاف میں پہلے ہی سے دوستی ہے گذشتہ سال اُن کی تصویر ایک ساتھ شائع ہوئی تھی۔ روس لڑائی چھیڑ دے گا، روس اندرونی ہنگاموں کے ڈر سے لڑائی نہیں شروع کرے گا۔

۱۳ر مارچ جمعہ — نہایت بُرا موسم، بارش ہوا، ٹھنڈک اور گھبراہٹ پیدا کرنے والی فضا۔ پھر بھی نیو امریکن لائبریری گیا اور اُس کے پریسیڈنٹ مسٹر کرٹ انک

سے مِلا۔ پہلے ہی سے وعدہ تھا۔ یہ لوگ سستی اور اچھی کتابیں شائع کرتے ہیں، ہندوستان میں بھی اُن کی کتابیں خوب بکتی ہیں۔ مسٹر اِنگ جرمن ہیں، ہٹلر کے زمانہ میں جلاوطن ہوئے، آدمی معقول اور ذہین ہیں۔ ہندوستان ہو آئے ہیں، پھر جانے والے ہیں۔ بہت سی کتابیں دے رہے تھے میں نے بوجھ کے خیال سے صرف چند لے لیں۔ اچھا ہندوستانی ادب شائع کرنا چاہتے ہیں۔ شام کو مسٹر ہاروے برائٹ سے مِلا۔ یہ ابھی ہندوستان سے واپس آئے ہیں، نیویارک ٹائمز کے ادبی شعبہ میں اسسٹنٹ اڈیٹر ہیں۔ ہندوستان ورلڈ فاؤنڈیشن والوں نے اس لئے بھیجا تھا کہ وہاں سے ادبی مضامین اور افسانے وغیرہ لائیں جو یہاں شائع ہوسکیں زیادہ تر بمبئی میں رہے وہیں سے کچھ چیزیں لائے ہیں، جو نام لیتے ہیں اُن میں سے کئی وہ ہیں جنھیں میں نہیں جانتا۔ یہ لوگ کبھی یہ نہیں بتا سکے (غالباً دل میں ہے صاف کہنا نہیں چاہتے) کہ ہندوستان کے کس قسم کے ادب کی اشاعت مدّ نظر ہے۔ میں برابر کہتا رہا ہوں کہ ہمارا اچھا ادب سماجی اور سیاسی جڑیں رکھتا ہے، یہاں کے لوگ اسے پروپیگنڈا کہہ کر الگ کردیں گے۔ اس کا فیصلہ کیسے ہوگا کہ ہندوستان کا نمائندہ اب کون سا ہے! میرا خیال ہے کہ جو کچھ یہاں شائع ہو سکے شائع کرانا چاہیئے۔

بمبئی کے لاکالج کے پروفیسر چتالے آج کل یہیں ہیں، پاکستان کے ڈاکٹر نذیر احمد جنجوعہ (محکمۂ زراعت) بھی یہیں مقیم ہیں کافی تجربہ کار اور جہاں دیدہ معلوم ہوتے ہیں، دیر تک تاثرات پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔

۱۵ مارچ اتوار — دونوں دن موسم خراب رہا پھر بھی میں کل کتابوں کی

دو کانوں کا چکر لگا تا رہا۔ حیرت ہے کہ کتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں اور اُس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ کتنی کتابیں بیکار چھپتی ہیں۔ مشکل سے ایسی کتابیں نظر آتی ہیں جو اشارے کرتی ہوں کہ مجھے اُٹھا لو اور دامن پکڑتی ہوں کہ مجھے خریدلو۔

آج اتوار تھا۔ سخت بارش اور ہوا۔ کہیں نہیں نکلا۔ یہیں وائی ایم سی اے میں نیویارک یونیورسٹی کے مذہبیات کے ایک پروفیسر کی تقریر سُنی۔ موضوع تھا "تاریخ اور ارتقا کا مفہوم" چند پیش یا اُفتادہ باتوں کے بعد انھوں نے تان اِس پر توڑی کہ تاریخ نے امریکہ کو خدا کی پسندیدہ قوم بنا دیا ہے اور ہمیں اسی طرح جینا ہے — کیا اِس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہے!

۱۶ر مارچ دوشنبہ — اِنکم ٹیکس کے دفتر سے پروانۂ روانگی حاصل کیا کہ یہ شخص امریکہ سے جا رہا ہے اس پر اِنکم ٹیکس کی کوئی رقم باقی نہیں ہے —

آج فاؤنڈیشن جا کر جہاز کا ٹکٹ، ضروری کاغذات وغیرہ لئے۔ مسٹر گل پیٹرک سے کسی قدر تفصیل سے باتیں ہوئیں — یہاں کی ادبی زندگی کے متعلق، لوگوں کی ہندوستان سے دلچسپی کے متعلق، ہندوستان میں زبان اور ادب کے متعلق، اُردو کے مستقبل کے متعلق، انگلستان کے قیام اور کام کے متعلق —

فاؤنڈیشن سے نکلا تو خیال ہوا کہ وقت کم رہ گیا ہے، دو ایک معقول لوگوں سے اور مل لینا چاہئے۔ پال رابسن کی تلاش میں ہارلم پہونچا، وہ باہر گئے ہوئے ہیں، مگر وہاں نیگرو اخبار فریڈم کے اڈیٹر برنہم اور ماہر افریقیات ڈاکٹر ہنٹر سے امریکہ میں تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کے بڑھانے کے متعلق گفتگو کا موقع ملا۔ جمعہ کو پال رابسن سے ملاقات ہوگی وہ سفر سے واپس آجائیں گے۔

۱۸ ر مارچ بُدھ ـــ کل موسم غنیمت تھا۔ میں نے اپنی کتابیں لے جا کر فاؤنڈیشن والوں کے گودام میں ڈھیر کر دیں کہ ان کے بھجوانے کا انتظام کریں۔ اس سے فراغت ہوئی تو سیر کی سوجھی۔ ہندوستانی قونصل خانہ چلا گیا۔ سینٹ پیٹرک ڈے (آئرلینڈ کے ایک سینٹ کا دن) ہونے کی وجہ سے پانچویں ایوینیو کو سجایا گیا تھا۔ پولیس، فوج، اسکاوٹ، طلبا پریڈ کر رہے تھے، اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے کیمرے سیکڑوں کی تعداد میں مناظر کو قید کر رہے تھے۔ مجھے اس تیوہار کے متعلق کچھ معلوم نہیں اور نہ معلوم کرنے کی فکر ہوئی۔ یہ اندازہ ضرور ہوا کہ ہمارے خواجہ خضر کی طرح ان کا پسندیدہ رنگ بھی سبز ہے کیونکہ اس کا اظہار عورتوں، مردوں، بچّوں کے لباس اور سجاوٹ سے ہوتا تھا۔

قونصل خانہ سے نکلا تو اقوام متحدہ چلا گیا۔ کئی دن سے جی چاہتا تھا کہ ن م راشد سے ملاقات کروں اور موقع ملے تو احمد شاہ بخاری پطرس کے درشن کروں کچھ نہ ہو تو جنرل اسمبلی کا جلسہ دیکھوں۔ عجب اتفاق ہے کہ تینوں باتیں پوری ہوئیں راشد صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ اقوام متحدہ کے ریڈیو اسٹیشن میں اُردو کی خبروں وغیرہ کے نگراں ہیں، دلچسپ باتیں ہوئیں۔ انھیں کے ذریعہ سے اسمبلی کا پاس مل گیا، وہاں گیا تو ابھی اسمبلی شروع ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ بخاری صاحب کچھ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے میں نے جرأت رندانہ سے کام لے کر اُن سے بھی ملاقات کر لی۔ تھوڑی دیر تک علمی اور ادبی باتیں کرنے کا موقع ملا۔ مختصر سی گفتگو میں اندازہ ہوا کہ وہ ذوق کی ترتیب میں بہت سے عناصر کی کارفرمائی کے قائل ہیں اور ادیب کے ذاتی اخلاقی نقطۂ نظر کو

اہمیت دیتے ہیں۔ سیاسی دنیا نے اُنھیں ایسا گھیر رکھا ہے کہ غالباً اب ادب کو اُن سے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اسمبلی کا سیشن مختصر تھا۔ میں تو محض تماشا دیکھنے گیا تھا وہ دیکھ لیا۔ جس بات کا ذکر ضروری ہے وہ یہ کہ تقریر کے ساتھ ہی ساتھ مترجم اُس کا ترجمہ بھی کرتے جاتے ہیں اور آپ پانچ چھ زبانوں میں سے جس زبان میں چاہیں ہیڈ فون لگا کر تقریر سُن سکتے ہیں۔ یہ مترجم مجھے ملیں تو میں اُنھیں گلے لگا لوں اُن کا کمال خود مقرر کی تقریر سے زیادہ حیرت خیز ہے۔

رات کو چند محض رسمی طور پر شناسا "مارل ری آر مامنٹ" والوں کے ساتھ ایک سویڈش ہوٹل میں کھانا کھایا، اُن لوگوں نے میری مادیت اور گمراہی پر رحم کھا کر بہت سی اخلاقی اور روحانی تبلیغ کی اور کئی کتابیں پڑھنے کو دیں۔ یہ دیکھ کر مجھے البتہ حیرت ہوئی کہ ہند و مدراس، بمبئی کرانکل اور فری پریس جرنل بمبئی نے اپنے خاص نمبر اس تحریک کے سلسلہ میں شائع کئے۔ یہ وہی چیز ہے جس کے نام لیوا معلّم اخلاق بن کر ہر دَور اور ہر ملک میں اُبھرتے رہے ہیں اور انسانوں کو اصل مسائل سے دُور رکھتے ہیں۔ کم سے کم اس وقت یہ لوگ تو اِسی کام میں مصروف ہیں۔

آج راشد سے پھر ملنے اور ساتھ کھانے کا وعدہ تھا، دوپہر اُن کے ساتھ گذری۔ انھوں نے کچھ نئی نظمیں کہی ہیں مگر افسوس ہے کہ سُن نہ سکا۔ رات کو کاظم صاحب کے یہاں رخصت ہونے کو گیا واپسی میں بارش ہونے لگی اور گیارہ بجے رات کو واپس آیا۔ دو دن اور گذارنے ہیں۔

پکاسو نے استالین کی جو تصویر بنائی ہے وہ آج نظر سے گذری۔

اصل سے کوئی مناسبت ہی نہیں ، بے جان اور غلط لکیریں ہیں ، اگر لوگ اِس پر برہم ہیں تو بہت ٹھیک ہے ۔ میرے دل میں ایک چور مدت سے ہے آج کہہ دینا چاہتا ہوں ۔ مجھے پکاسو کے نئے کارنامے نہ جانے کیوں پسند نہیں آتے ۔

۲۰ مارچ جمعہ ۔۔ آج امریکہ میں آخری رات ہے ۔ میں کیا سوچ رہا ہوں واضح نہیں ، کیا محسوس کر رہا ہوں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ نہ وہ بے چینی ہے جو کل تک تھی نہ رنج ہے ۔ کوئی خوشی بھی نہیں ہے ۔ ذرا دُور ہٹ کر اپنے تاثرات کا جائزہ لوں گا اور خیالات پر دو بارہ نظر ڈالوں گا ۔ اتنا جانتا ہوں کہ کچھ نقش ذہن اور دل پر بنے ہیں ۔ آہستہ آہستہ اکثر نقش دُھندلے ہو جائیں گے ، اکثر یادیں محو ہو جائیں گی اور جو کچھ باقی رہے گا وہی یہاں کا تجربہ ہوگا ، وہی شعور کا جُز بنے گا ۔ ویسے وقتی تاثرات تو ان صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں ۔

کل موسم بے حد خراب تھا ، ایسی بارش میں نے یہاں کبھی نہیں دیکھی مگر مجھے انٹر کلچرل پبلی کیشن کے ڈائرکٹر مسٹر جیمس لافلن سے ملنا تھا ، گیارہ بجے اُن کے یہاں پہونچا ۔ ہندوستانی ادب اور زندگی کے متعلق جو باتیں کیں اُن سے متاثر معلوم ہوتے ہیں ، بہت اصرار رہا کہ کچھ لکھوں ۔ اُن سے ملنے سے ایک ذاتی فائدہ بھی ہوا ۔ اب سال بھر تک وہ سات آٹھ اہم ادبی رسائل مجھے مفت بھجوائیں گے ۔

پال رابسن سے ملنے کی کوشش آج پھر رائگاں گئی وہ سفر سے واپس نہیں آئے مگر دیر تک فریڈم کے دفتر میں رہا ۔ THE IRON CITY کے مصنف لائڈ براؤن سے ملاقات ہوئی ۔ اُن کے ناول کی زبان سمجھنے کے سلسلے میں مجھے جو دشواریاں

پیش آئی تھیں میں نے بیان کیں، پھر نیگروؤں کی انگریزی بول چال اور اُس کی مسلسل تبدیلیوں کا ذکر ہوتا رہا۔ سچ یہ ہے کہ مجھے جروم کا LANTERN FOR JERMEY اس کے مقابلہ میں زیادہ پسند آیا، کیسی سادہ اور پُرکار، پُراثر اور جاندار کہانی ہے۔

آج آخری بار فاونڈیشن گیا، آیندہ کی ڈاک وغیرہ کے متعلق ہدایات کیں۔ رات کا کھانا مسٹر گل پیٹرک کے ساتھ کھایا، میں کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتا لیکن وہ مجھ سے جس طرح ملتے رہے ہیں اگر اُس میں زبردست ریاکاری نہیں ہے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ معقول آدمی ہیں۔

اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں، میں نے ابھی اسباب وغیرہ ٹھیک کر کے فرصت پائی ہے اور یہ سطریں لکھ رہا ہوں، ایک حساب سے کل کا دن شروع ہو گیا اور سفر میں دس گیارہ گھنٹے اور باقی ہیں۔ پہلا بحری سفر ہے، ایک طرح کی نامعلوم سی اُلجھن ہے۔ سفر کا ایک حصّہ، بڑا حصّہ ختم ہوا، دوسرا شروع ہونے والا ہے۔ سمندر پھر ساحل، پھر سمندر اور پھر ساحل۔ اور پھر خدا جانے۔ اندازہ ہوا کہ ذوقِ سفر اور سفر میں بڑا فرق ہے!

پُرانی دُنیا کی طرف

۲۱ مارچ سنیچر - جہاز گیارہ بجے دن کو روانہ ہونے والا تھا میں ساڑھے نو بجے
پہونچ گیا - کاظم صاحب رخصت کرنے کے لئے آ گئے اور جہاز چھوٹنے تک ساتھ
رہے بڑی شفقت اور مروّت کے انسان ہیں - اُن سے باتیں کرتے وقت اور
گذشتہ چھ ساڑھے چھ مہینے کی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ
یہاں کے قیام سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوا - پھر بھی اب یہاں سے چلتے وقت
رہائی کا احساس ہو رہا ہے - میں قید میں نہیں تھا پھر یہ قید سے چھوٹنے کا سا
احساس کیوں ہے؟ غالباً یہ اس بات کا ردِّ عمل ہے کہ کئی مہینوں سے میں یہاں
کی سیاسی رجعت پسندی اور حاکم طبقہ کی بدنیتی سے سخت بیزاری محسوس کرتا رہا ہوں -
کچھ بھی ہو یہاں سے نکل رہا ہوں - آج ایک حساب سے نوروز ہے، میرے
گھر میں بھی خوشیاں منائی جا رہی ہوں گی - بچّے رنگ کھیل رہے ہوں گے، نہا دھو کر
اچھے کپڑے پہن رہے ہوں گے - شاید مجھے بھی روزانہ سے زیادہ یاد کر رہے ہوں!
بہر حال آج آفتاب کا نیا سفر شروع ہے، اگر یہ کسی اچھے شگون کی علامت ہے

تو مجھے بھی خوشی ہے کہ میں بھی ایک نیا سفر شروع کر رہا ہوں۔

میرا جہاز کیونارڈ لائن کا مشہور جہاز کوئین الزبتھ ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مسافر جہاز، جس کا وزن ساڑھے تراسی ہزار ٹن سے زیادہ ہے۔ اسی لائن کا دوسرا جہاز کوئین میری ہے، اکیاسی ہزار ٹن سے اوپر اور پھر فرانس کا مشہور جہاز لبرٹی ہے پچپن ہزار ٹن ــ کوئین الزبتھ کو جہاز نہیں "شہر رواں" کہنا چاہیئے۔ ابھی مجھے اس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہوا، بس یہ معلوم ہوا کہ اس کی لمبائی ۱۰۹۰ فٹ اور چوڑائی تقریباً ۲۰۰ فٹ ہے، چھوٹے بڑے چودہ عرشے ہیں۔ جہاز کے ملازموں کے علاوہ بائیس سو مسافروں کی جگہ ہے۔ مسافروں کی دلچسپی اور آرام کی جتنی باتیں ہو سکتی ہیں سب ہیں اگر کوئی دلچسپی لینا چاہے۔ سمندر آج نسبتاً ساکن ہے مگر خود جہاز لمبی، اونچی نیچی لہریں پیدا کر رہا ہے۔ کچھ دور تک امریکہ کے ساحل نے نگاہوں کا ساتھ دیا پھر پانی ہی پانی۔ ہزاروں مربع میل میں پانی۔ سمندر اور آسمان، سمندر اور آسمان، طبیعت بحال ہے اور میں ڈک پر کھڑا سمندر کو دیکھے جاتا ہوں، جی چاہتا ہے دیکھتا ہی رہوں مگر اس اندھیرے کی چادر کا کیا علاج ہے جو ہر طرف سے گھیرے لیتی ہے!

میں ایک فرسٹ کلاس کیبن میں ہوں، دیکھوں کچھ پڑھ لکھ سکتا ہوں یا نہیں۔

۲۳ مارچ دوشنبہ ــ سمندر کی وسعت میں جہاز ایک تنکے کی طرح بہتا جا رہا ہے اس کی رفتار تیس ناٹ سے کم ہے لیکن کل سے ہوا تیز ہے، لہریں اونچی ہیں اور جہاز ڈانوا ڈول ہو رہا ہے۔ آج صبح طبیعت بڑی خراب معلوم ہو رہی تھی، متلی اور چکر، میں نے سمجھا تھا کہ اب میں بچ گیا اس سمندری آزار سے لیکن غالباً حملہ

ہلکا ہے، بہت سے لوگوں کی حالت قابلِ رحم ہے۔

۲۵ مارچ بدھ — بس ایک ہی دن تکلیف رہی، کل سے ٹھیک ہوں پھر بھی کھانے پینے میں احتیاط برت رہا ہوں۔ جہاز کی دلچسپیوں میں برائے نام شرکت کر سکتا ہوں۔ ناچنا مجھے نہیں آتا، یہ رقص مجھے دیکھنے میں بھی بھلا نہیں معلوم ہوتا، کہاں یہ رقص اور کہاں ہمارا ہندوستانی رقص، جو رقاصہ کے ساتھ ساتھ دیکھنے والوں کے جسم میں بھی انگڑائی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ مجھے اِس موسیقی سے دلچسپی نہیں، اس کو سُن کر جان کہاں تن سے نکلنے لگتی ہے۔ مختلف قسم کے جُوے کھیلے جا رہے ہیں۔ میں نہ تو واقف ہوں اور نہ دلچسپی ہے، کہاں تک پڑھوں کہاں تک سمندر کو دیکھوں، جو لوگ دیکھے جانے کے قابل ہیں اُنھیں دوسرے دیکھ رہے ہیں۔ سارے جہاز میں پانچ ہندوستانی ہیں، دو ٹورِسٹ کلاس میں ہیں، یہاں درجوں کی ایسی تفریق ہے کہ اُن سے ملاقات نہیں ہوتی۔ دو کیبن کلاس میں ہیں، نوجوان بنگالی تاجر، مزاج کے اچھے اور ملنسار ہیں کھانے کی میز پر ساتھ ہوتا ہے، ڈِک پر باتیں ہوتی ہیں، کھانے کی میز پر مدقوق سی ایک فلپائینی لڑکی بھی آتی ہے۔ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ مسافر بہت ہیں ہم سفر کوئی نہیں ہے۔ جن لوگوں سے اس جہاز میں ملاقات ہوئی وہ محض رسمی ہے اِدھر اُدھر کی عام اور سطحی باتیں ہو جاتی ہیں، ایک دوسرے کو دیکھ کر مُسکراتے ہیں اور بس۔

---

۲۶ مارچ جمعرات — جہاز کچھ دیر کے لئے فرانس کے ساحل شاربرگ پر ٹھہرا، فرانس جانے والے اُتر گئے۔ پھر چلا تو آہستہ، کیونکہ سمندر میں جوار کا انتظار کرنا تھا۔ ساڑھے نو بجے رات کو، یعنی ابھی کچھ دیر پہلے، ساؤتھمپٹن کے

بندرگاہ پر لنگر ڈالا گیا۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ رات جہاز میں گذاروں گا، صبح کو لندن جاؤں گا۔ آلِ حسن کو ریڈیو گرام بھی بھیج دیا تھا کہ واٹرلو کے اسٹیشن پر جمعہ کو ملو۔

۲۸ مارچ سنیچر — اور یہ لندن ہے! اس لفظ میں کتنی داستانیں، رنگین اور خونیں کہانیاں، تہذیبی مرقعے، تاریخی واقعات، شعر و ادب کے خزانے پوشیدہ ہیں، اس لفظ سے کتنی باتیں، کتنی یادیں متعلق ہیں، اسے تو خاص نظر سے دیکھنا ہے! لندن کو، دنیا کے سب سے بڑے شہر کو، جس کی رونق اور گرم بازاری میں ہمارا لہو بھی صرف ہوا ہے۔

کل ساؤتھمپٹن سے لندن آتے ہوئے یہ احساس ہوا کہ انگلستان کی ریلیں امریکہ کے مقابلہ میں چھوٹی ہیں اور کم رفتار، ممکن ہے اور علاقوں میں یہ بات نہ ہو۔ واٹرلو پہونچا تو اسٹیشن پر آلِ حسن مع کرشنا (بیوی) اور رُتن (بہن) کے موجود تھے۔ مانوس چہروں نے مانوس فضا پیدا کر دی اور وہ تحیّر جو ایک نئی جگہ۔ اور اتنی بڑی جگہ۔ پہونچ کر ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ بھی ہو کہ نہ جانے کب سے لندن کے متعلق پڑھتے اور سُنتے چلے آئے ہیں، سڑکوں کے نام اور عمارتوں کی تصویریں بچپن سے دیکھ رہے ہیں۔ بہر حال ہوا یہی کہ لندن کا پہلا اثر بہت اجنبی نہیں تھا۔ لندن اپنے موسم سے بھی پہچانا جاتا ہے لیکن کل یہاں دھوپ تھی، ہائڈ پارک کے خزاں زدہ درختوں میں کہیں کہیں ہری کونپلیں نظر آ رہی تھیں۔ بعض سڑکوں کے کنارے لکڑی اور لوہے کے ڈھانچے کھڑے کئے جا رہے ہیں کہ جشنِ تاجپوشی قریب ہے۔ یہ بھی کیسا اتفاق ہے کہ امریکہ پہونچا تھا تو صدر کے انتخاب کا ہنگامہ بپا تھا، یہاں آیا ہوں تو تاجپوشی کا غوغا ہے۔

ہاں وقتی طور پر کوئین میری کے انتقال نے ساری توجہ اُن کے جنازے کی طرف موڑ دی ہے۔ ہما ہمی وہی ہے۔ سچ کہا ہے غالب نے ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

کل کہیں نہیں نکلا، آج چند سڑکوں پر پھرا، بی بی سی کے دفتر گیا اور وہاں بعض ہندوستانی پاکستانی احباب سے ملاقات بھی ہوئی۔

۳۰ مارچ دوشنبہ ۔ موسمِ بہار آنے کے ساتھ ساتھ یہ کیسی خوشگوار صدائیں آرہی ہیں! اِن خبروں کا خیر مقدم کس طرح کیا جائے! ہر طرف سے امن امن کی آواز اُٹھ رہی ہے، چین، روس، اور دوسرے امن دوستوں نے امن کی فضا پیدا کرنے کے لئے جو قدم اُٹھائے ہیں اُن کا اثر سامراجی اور سرمایہ دار ملکوں پر بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہت دنوں سے میں یہی سوچ رہا ہوں کہ دنیا کے عوام کو متاثر کرنے اور سرمایہ دار ملکوں کو آزمانے کے لئے اِس اقدام کی شدید ضرورت ہے۔ امن دوستوں کو وہ سب کچھ کرنا چاہیے جس کے بعد جنگ جوئی کی خواہش کا دھبہ سرمایہ دار ملکوں کے دامن سے دھویا نہ جا سکے یا پھر وہ امن کی فضا قائم رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ یقیناً انسان اجتماعی طور پر چاہیں تو امن قائم ہو سکتا ہے اور دنیا جنّت بن سکتی ہے۔

انڈیا ہاؤس گیا۔ شاندار عمارت ہے اور بہت بڑا دفتر۔ انور جمال قدوائی اور فیروز جبیں سے ملاقات ہوئی۔ پکیڈلی سرکس دیکھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تھوڑی دیر یہاں کھڑے رہو تو جس سے ملنا ہے وہ ضرور یہاں سے گذرے گا۔ کوئی خاص بات نہیں بس قدیم مرکزی جگہ ہے اور بڑی بارونق۔

عشق کے دیوتا EROS کا مجسّمہ جو صاف کرنے کے لئے اُتارا گیا تھا، اپنی کمان کے ساتھ پھر اپنی جگہ پر پہونچ گیا ہے - ٹریفالگر اسکوائر میں پھرا، تصویر کھینچنے والے تصویر کھینچ رہے ہیں، کبوتروں سے دلچسپی لینے والے اُنھیں اپنے سر اور کندھوں پر بٹھا رہے ہیں، بڑے بڑے چار شیر نلسن کالم کی حفاظت کر رہے ہیں اور تیز ہَوا فوّاروں کے پانی اُڑا کر تفریح کرنے والوں کے شوق کا امتحان لے رہی ہے - قریب ہی اور بہت سے مجسّمے، تاریخی عمارتیں اور اہم جگہیں ہیں - پاس ہی نیشنل گیلری آف آرٹس ہے، اِسے تو اطمینان سے دیکھوں گا لندن کو پہچاننے اور اُس سے لُطف اندوز ہونے کے لئے اُس سے مانوس ہونے اور اُسے پرچانے کی ضرورت ہے -

موسم عجیب ہے، دھوپ چھاؤں، تیز دھوپ، گھرے بادل، ہلکی بارش، سرد ہَوا -

آج ہی ہندوستان کے مشہور فلم ڈائرکٹر سہراب مودی سے ملاقات ہوئی - آلِ حسن نے کھانے پر بلایا تھا - آدمی دلچسپ ہیں - اَنا کا زور کسی قدر زیادہ ہے -

یکم اپریل بُدھ - پڑا پڑا باتیں کرتا ہوں، تھکن مٹانے کے نام پر کاہلوں کی طرح آرام کر رہا ہوں - فرید جعفری میرے بچپن کے دوست ہیں، کل اُن سے ملنے کا وعدہ کیا تھا نہیں گیا - یہ میری عادت نہیں لیکن بارش کے بہانے کاہل بن جانے کا کیا علاج! کچھ خط لکھے، کچھ پڑھتا رہا، ابھی یہ اندازہ نہیں کہ یہاں کس کس سے ملنا ہے، کہاں کہاں جانا ہے اور کیا کیا دیکھنا ہے طبیعت گھبرا تو نہیں رہی ہے لیکن کوئی زبردست ولولہ بھی نہیں ہے کہ تھوڑے

وقت میں بہت کچھ کر ڈالوں ۔

آج ٹہلنے نکلا تو اس حصے میں پہونچ گیا جس کی سڑکوں کے نام انگریزی ادب میں زندہ ہیں ۔ ریجنٹ اسٹریٹ ، آکسفرڈ سرکس ، اسٹرینڈ ، چیرنگ کراس ، اور سب سے بڑھ کر فلیٹ اسٹریٹ ، جس پر اس وقت یہاں کے تقریباً سبھی اخباروں کے دفتر ہیں ۔ اسی پر وہ جگہ ہے جہاں ڈاکٹر جانسن اور اُن کے دوست اکٹھا ہو کر علم و ادب کے گُل کھلاتے تھے ۔ قریب ہی اُن کا مکان بھی ہے جو زیارت گاہِ عالم بنا ہوا ہے ۔ بی بی سی کے دفتر پہونچا تو قرۃ العین حیدر ، صدیق احمد صدیقی ، محمد علی خاں ملیح آبادی (جو مدتوں سے لندن میں مقیم ہیں) ساجد علی راز ، یاور عباس وغیرہ سے ملاقات ہو گئی ۔ قرۃ العین کی گفتگو اُن کے پچھلے افسانوں سے بہت مختلف معلوم ہوئی ۔

۳ اپریل جمعہ — کل لندن سٹی کے علاقہ میں جانے کا اتفاق ہوا ۔ گذشتہ جنگ کی بہیمانہ بمباری کے نشانات کھنڈروں کی صورت میں اب بھی موجود ہیں اور بہت ہیں ۔ تعمیر کا کام تیز رفتار نہیں معلوم ہوتا ۔ یوں تو بعض اوقات سارا شہر دھوئیں میں جھلسا ہوا اور بم زدہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس علاقہ میں پہونچ کر اس کا زیادہ احساس ہوا ۔ قریب ہی بڑے بڑے انگریزی اور غیر ملکی بینک ہیں اور کچھ دُور ہٹ کر سینٹ پال کا مشہور گرجا گھر — مکانوں اور گلیوں کے ہجوم میں دبے ہوئے ہونے کے باوجود نمایاں — اندر جا کر اُس کے حُسنِ تعمیر اور تاریخی عظمت کا احساس ہوتا ہے ۔ گوشہ گوشہ سے تاریخ وابستہ ہے اور انگریزی شہنشاہیت کے لئے جان دینے والوں کے مجسّمے اِس کے نوادر میں سے

ہیں۔ گنبد کا حسن اور نقاشی کے نمونے سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کو بھی متوجہ کرتے ہیں۔ اس کی تعمیر تو اٹھارویں صدی کے ابتدائی حصے میں نشاۃ الثانیہ کے تعمیری اصولوں کے مطابق سر کرسٹوفر رن نے کی تھی لیکن اس کی آرائش میں ڈھائی صدیوں کے انگریزی صناعوں اور فن کاروں کا ہاتھ ہے۔

ایک صاحب ہیں ڈاکٹر مارس کارسٹیرس، انھیں امریکہ سے میرے آنے کی اطلاع مل گئی تھی وہ ملنا چاہتے تھے آج دوپہر کو ان کے ساتھ کھانا کھایا، ہندوستان میں رہ چکے ہیں، ہندوستانی بول لیتے ہیں، تحلیل نفسی کے طریقۂ علاج سے دلچسپی لیتے ہیں، اُنھوں نے اپنی گفتگو سے کچھ ایسا متاثر نہیں کیا گو آدمی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی ایک عزیز ادھیڑ عمر کی خاتون نے پوچھا "آپ نے ملکہ میری کا جنازہ بھی دیکھا؟" میں نے افسوس کا اظہار کیا، کہنے لگیں "دیکھ لینا چاہئے تھا، ایسے مواقع زندگی میں کم آتے ہیں" میں نے سوچا تو اس میں واقعی سچائی نظر آئی اور انگریزی ذہن کا کچھ بھید بھی کھلا۔

انور انصاری صاحب مع اپنی اہلیہ کے آگئے، دیر تک امریکہ کے تجربات اور تاثرات، ادب اور نفسیات کے متعلق باتیں ہوئیں۔ سوچتا ہوں تو روح کانپ جاتی ہے کہ یہ باتیں کب تک اور کہاں کہاں دُہرانی پڑیں گی!

۵ / اپریل اتوار ۔ کل گھر ہی پر پڑا رہا۔ دوپہر کو غوث انصاری آگئے، وہ گئے تو ڈاکٹر عمار حسن۔ سہ پہر کے بعد انھوں نے اپنی کار میں لندن کی بیرونی مغربی حدوں کی سیر کرادی۔ رات کا کھانا فرید جعفری کے یہاں کھایا۔ بارہ سال کے بعد ملاقات ہوئی تھی، بہت سی باتیں ہوئیں، اختلاف خیال کے باوجود

مخلصانہ - ابھی بار بار ملیں گے - بیگم فرید کی خاطر داری فریدؔ کی محبت سے ہم آہنگ تھی - فریدؔ بچپن کے دوست ہیں اور میرے مضمون نگار بننے کے شوق میں ان کی ترغیبات شامل ہیں -

آج کٹے پتنگ کی طرح لندن کی سڑکیں ناپتا رہا، ہلکی بارش اور تیز ہوا کے باوجود گھر میں نہ رہا گیا - کوئی خاص چیز نہیں دیکھی لیکن ہائڈ پارک کے مختلف حصّوں کی سیر کی اور اُس مشہور SPEAKER'S CORNER میں وقت گذارا جہاں مختلف مذہبی سیاسی اور سماجی جماعتوں کے مقرّر اپنی اپنی کہتے ہیں اور سُننے والے کسی کو محروم نہیں رکھتے - تین چار ٹولیوں میں مختلف عیسائی مشنوں کے پادری دھمکیاں اور بشارتیں دے رہے تھے، کمیونسٹ پارٹی کے مقرّر امن کا پیغام سُنا رہے تھے - یہاں تقریر کرنے والے کو مشّاق اور روادار ہونا چاہیئے کیونکہ مجمع کے لوگ ہر قدم پر ٹوکتے اور فقرہ بازی کرتے ہیں -

اِس وقت اخباروں میں، راستہ چلتے ہوئے لوگوں میں، جلسوں میں یہی ذکر ہے کہ رُوسؔ نے اُن ڈاکٹروں کو چھوڑ دیا جن پر رُوسی رہنماؤں کے قتل کی سازش کا اِلزام تھا - روسی رہنماؤں نے کچھ بھی نہیں چھپایا —— طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں ہو رہی ہیں اور مجھے حیرت ہے کہ اگر یہ بات معلوم ہوگئی کہ وہ ڈاکٹر بے قصور ہیں اور انھیں رہا کر دیا گیا تو اس سے ڈرنے اور اُلجھنے کی کیا بات ہے - انگلستان اور امریکہ کے اخبار اس کے متعلق کچھ نہیں لکھتے کہ روس میں مسلسل ضروری چیزوں کی قیمتیں گھٹ رہی ہیں اور اس کے برعکس دوسری جگہوں پر —— ؟

۷ر اپریل منگل —— لندن کا جادو مجھ پر کام کرنے لگا ہے - مجھے یہاں کی

عمارتیں خوبصورت معلوم ہو رہی ہیں، سڑکوں پر چلتی ہوئی عورتوں کا حسن اُنھیں کئی بار دیکھنے کی خلش پیدا کرتا ہے، پارک دلکش ہیں، گلیوں کے پیچ و خم اچھے معلوم ہوتے ہیں، سڑکوں کے اَن جانے موڑ پر پہونچ کر اچانک کسی تاریخی عمارت یا مجسمہ کا نظارہ دلفریب ہے — اب نگاہیں بعض علاقوں سے مانوس ہو رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ لندن کی اصل کشش کا راز دریافت کرنے میں وقت لگے گا۔ خبر نہیں میرے اور اُس کے درمیان کون سے حجاب حائل ہیں اور کتنے!

آج میں نے سارا دِن کتابوں کی دوکانوں میں صرف کیا۔ فوائلس، جسے دنیا کی سب سے بڑی کتابوں کی دوکان کہا جاتا ہے، واقعی بڑی ہے، سکنڈ ہینڈ کتابیں زیادہ ہیں مگر کچھ بے ترتیبی سی معلوم ہوتی ہے۔ نیو یارک میں اِسکرِبنر، ڈبل ڈے اور یورنٹو نو کی دوکانیں بھی بہت بڑی تھیں۔ کون سب سے بڑی ہے، میں نہیں کہہ سکتا! مغربی لندن میں گولڈ ہاک روڈ پر مقیم ہوں اور آرام سے ہوں۔ دن تو زیادہ تر گھومنے پھرنے میں گذر جاتا ہے۔ رات کے وقت کوئی آ جائے تو دلچسپ منظر دیکھیے۔ سیاسیات، سنیما، لندن، لکھنؤ، پیرس، امریکہ اور بی بی سی کی باتیں ہوتی ہیں، چھوٹی چھوٹی بحثیں اور بڑے بڑے فیصلے جو ہنسی مذاق کی نذر ہو جاتے ہیں، کبھی غالب کا دیوان کھُلتا ہے اور بارہ بجے رات تک وہ شمع محفل بنتا ہے اور پھر جماہیوں اور تھکے ہوئے بوجھل پپوٹوں کے ساتھ سب اپنے اپنے بستروں کی راہ لیتے ہیں —

۸ر اپریل بُدھ — ناشتہ کر کے نکل پڑا کہ برٹش میوزیم دیکھوں گا۔ بارش

راستہ کاٹتی رہی، کتابوں کی دوکانیں دامنگیر ہوتی رہیں پھر بھی میں چکّر کھاتا ہوا بلومسبری پہونچ گیا۔ برٹش میوزیم کی وسیع اور پہاڑ کی طرح کھڑی ہوئی عمارت نے خود متوجہ کیا۔ قبل اس کے کہ میں اُس میں داخل ہوں، میں نے اُس کے گرد وپیش کا چکّر لگایا، یہ رسّل اسکوائر ہے، وہ یونیورسٹی کی عمارت، یہ لندن اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز ہے، وہ آگے یونیورسٹی ہال۔ اور نہ جانے کہاں سے یکایک نگاہوں کے سامنے سجاد ظہیر کے ناول "لندن کی ایک رات"، کے صفحات کھُل گئے اور ذہن دُور دُور بھٹکنے لگا۔ بہت سے ہندوستانی طلبا، آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں، معلوم نہیں ان کے سینوں میں بھی کوئی آگ بھڑک رہی ہے یا نہیں، چہرے تو کچھ نہیں بتاتے! نہیں مجھے برٹش میوزیم پلٹ چلنا چاہئے، سوچنے کے لئے تو وقت پڑا ہے۔

دُور کھڑے ہو کر میں نے اس کی وسعت کا اندازہ لگایا، سامنے اونچے برآمدے کی منڈیر پر بنے ہوئے سنگی مجسموں کو دیکھا جو یونانی اور رومن انداز میں علم وفن کی علامتیں ہیں۔ کچھ لوگ برآمدے میں بنچوں پر بیٹھے ہوئے کھا پی رہے ہیں یا اخبارات دیکھ رہے ہیں۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ خوشی اور حیرت کا عجیب جذبہ مجھ پر طاری ہے اور یہ خوف سا کیوں ہے؟ میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے؟ بڑے ہال میں ابھی صرف ایک طرف ہندوستانی مجسمے اور دوسری طرف یونانی اور رومی مجسمے دکھائی دے رہے ہیں مگر میں تو اس کشمکش میں ہوں کہ کیا دیکھوں اور کس طرح! گھنٹہ بھر تک اُنھیں کو دیکھتا رہا، تصویروں کے چند کارڈ خریدے، داہنی جانب ایک نمائش گاہ میں گیا جہاں اہم لوگوں کے دستخطی خطوط، مسوّدات

اور قدیم کتابوں کے نایاب نسخے رکھے ہوئے ہیں، کچھ وقت وہاں گذارا اور یہ سوچ کر واپس آیا کہ اِس میوزیم کے متعلق کچھ پڑھ لوں گا، اس کے نقشے کو سمجھ لوں گا تو پھر آؤں گا۔ سب کچھ دیکھنا تو محال ہے۔ مجھے گھبراہٹ کیسی ہے؟ کمتری کا احساس کیوں ہے؟ پسپائی سی کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ علم کم ہے تو کیا، اُس کی پیاس تو بہت ہے، پھر آؤں گا۔

۱۰ اپریل جمعہ۔ کچھ نہیں، اِدھر اُدھر کے چکر ہیں اور میں — بہت کچھ دیکھ رہا ہوں اور بہت کچھ دیکھنا ہے۔ یہاں کے اخبار مجھے زیادہ پسند نہیں آتے، سبھی دیکھ لئے، بہت سی اُلجھنوں اور تاریکیوں کے درمیان یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اَمن اور ترقی کی قوتیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ اس وقت شائد افریقہ کی باری ہے اُس کے ہر گوشے میں ہیجان ہے۔ اُس اندھیرے ملک میں بھی تو صُبح کے پُجاری موجود ہیں۔

بی بی سی میں ہندوستانی سکشن کے انچارج مسٹر جے لنڈن ہیں، اُن سے ملا۔ ہندوستان کے لسانی ادبی اور سماجی مسائل کے متعلق باتیں ہوئیں۔ بی بی سی کے ہندوستانی پروگرام کا تذکرہ آیا — باتیں یونہی سی رہیں۔ انھوں نے کل اِنڈیا آفس لائبریری لے چلنے کا وعدہ کیا ہے۔ صورت یہ ہے کہ یہاں ایک انڈیا کلب ہے، اُس کی طرف سے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ باقاعدہ اس نادر ذخیرہ کو دیکھ سکیں۔ ضرور جاؤں گا۔

۱۱ اپریل سنیچر — انڈیا آفس لائبریری کا شوق گیارہ بجے وہائٹ ہال کی سڑکوں پر لے گیا، کبھی یہیں سے ساری دنیا کی نبضیں دیکھی جاتی تھیں، یہ

۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ ہے ، بالکل غیر مرعوب کُن ، یہ انڈیا آفس ہے ، اب اسے کامن ویلتھ ریلیشنس آفس کہتے ہیں ، اور یہ لارڈ کلایو کا مجسمہ ہے ۔ کئی ہندوستانی اور انگریز اکٹھا ہو گئے ، مسٹر لنسٹن بھی آ گئے اور ہم لوگ انڈیا آفس میں داخل ہوئے ۔ کیسی بڑی ، پیچیدہ اور مضبوط عمارت ہے ۔ مختلف راہوں سے گذرتے ہوئے ہر طرف کتابوں کے ڈھیر ، تصویریں ، مجسمے نظر آ رہے ہیں پھر لائبریری کا اصل حصہ ملتا ہے ۔ کتابوں کا ، تصاویر اور نوادر کا کتنا بڑا ذخیرہ ہے ! خدا کی پناہ ! کوئی مانے یا نہ مانے ، میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ یہاں یہ چیزیں محفوظ ہیں اگر ہندوستان میں ہوتیں تو اب تک کب کی تباہ ہو چکی ہوتیں ۔ کیا دیکھوں اور کیا نہ دیکھوں ۔ دو صدیوں میں ہر طرف سے مخطوطات اور مرقعے سمٹ کر یہاں آئے ہیں ۔ اور یہ تو محض ایک مرکز ہے ، ایسی نہ جانے کتنی جگہیں ہیں ۔ جن لوگوں نے انفرادی طور پر یہ چیزیں ہندوستان میں حاصل کیں انھوں نے یا تو ہدیۃً دے دیں یا بیچ دیں ۔ خود اس لائبریری کا سلسلہ ۱۸۰۱ء شروع ہوا تھا اس وقت اُس میں تقریباً ڈھائی لاکھ مطبوعہ کتابیں اور اکیس ہزار مخطوطے ہیں ۔ بیس ہزار مشرقی مخطوطوں کے علاوہ اصل ہندوستانی اور ایرانی تصاویر ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں ہیں ۔ مخطوطوں میں سب سے بڑی تعداد سنسکرت کی ہے ، آٹھ ہزار تین سو ، اس کے بعد فارسی چار ہزار آٹھ سو ، عربی تین ہزار دو سو ، اُردو دو سو ستّر اور ہندی ایک سو آٹھ ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دَوران کی خط و کتابت ، ضروری کاغذات ، نجی روزنامچے نہ جانے کتنے ہیں ۔

وقت کم ہے اور دیکھنا بہت ، میں نے شاہنامہ ، کلیاتِ اہلی شیرازی ،

پدماوت (ہندی رسم خط) وغیرہ جلد جلد دیکھ کر اُس البم کو ہاتھ لگایا جو داراشکوہ نے اپنی محبوب بیوی کے لئے تیار کرایا تھا۔ اُس کا حسن بیان کرنے کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے، تصویریں بھی ہیں اور وصلیاں بھی، زرکار، منقش، رنگین اور مرصع ـــ ہر تصویر دیر تک دیکھے جانے کی ہے مغل مصوری اور راجپوت مصوری کے اتنے حسین اور بہت سے مرقعے میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ دیکھنا ہے کہ تقسیم کے بعد یہ خزانہ ہندوستان کو ملتا ہے یا پاکستان کو۔ شائد پاکستان داراشکوہ سے دلچسپی نہ لے! مطبوعہ اُردو کتابوں کا بھی بڑا ذخیرہ ہے۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ کئی دن یہاں آؤں گا اور جو کچھ دیکھ سکوں گا دیکھوں گا۔ لائبریری سے نکل کر دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ انڈیا کلب میں کھایا۔

رات کا کھانا انور انصاری کے یہاں تھا۔ بیگم انصاری نے اتنا اہتمام کیا تھا اور اتنے آدمی بُلا لئے تھے کہ فرنگی محل کی روایات لندن میں تازہ ہوگئیں۔ نام کی مناسبت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ کِس کِس کے نام لکھوں سبھی تھے، ایسے ایسے لوگ جن کے موجود ہونے کا گمان بھی نہیں تھا۔ اور ایسی بے تکلف فضا جو ہم زبان اور ہم خیال قسم کے لوگوں کے یکجا ہونے ہی سے پیدا ہوسکتی ہے۔

۱۴ / اپریل منگل ـــ بہت سے جاننے والوں کا پتہ چل رہا ہے دیکھوں کس کس سے ملاقات ہوتی ہے۔ اتوار کو ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی کے یہاں پہونچ گیا۔ وہ لندن اسکول آف اورنٹیل سٹڈیز میں پانچ سال کا قیام پورا کر رہے ہیں، دس گیارہ سال کے بعد ملاقات ہوئی۔ وہی ہنسی مذاق، وہی بے تکلفی اور بہت سی پرانی صحبتوں کی یاد ـــ ہم لوگ ایک دوسرے کو تقریباً بیس سال سے جانتے ہیں۔

بلگرامی اُس وقت بھی نمازیں پڑھتے تھے اور امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کا غور سے مطالعہ کرتے تھے، اب بھی یہ اشغال جاری ہیں بلکہ ان میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اُن کے ساتھ تھوڑا سا وقت ریجنٹ پارک میں گذرا، بیگم بلگرامی نے کھانا کھلا کر رخصت کیا۔

یونہی بے ارادہ پھر رہا ہوں۔ کل پھر اورنٹیل اسکول پہونچ گیا۔ ڈاکٹر دُوبے (پہلے لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے اب عثمانیہ میں ہیں) مِل گئے، ان کے ساتھ گلاسگو یونیورسٹی کے اینتھراپالوجی کے پروفیسر مسٹر اِسٹی وِنسن بیٹھے باتیں کر رہے تھے، میں بھی بات چیت میں شامل ہوگیا اور وقت اچھا کٹا ــــ یہ سب کچھ تو ہے مگر کیسی بے ترتیب اور بے مقصد زندگی ہے! میں کیا کر رہا ہوں ــــ کتابیں پڑھ رہا ہوں اور کتابوں کی دوکانوں کے درشن کر رہا ہوں ــــ مگر یہ تو ہندوستان میں بھی کر رہا تھا اِدھر جو کتابیں پڑھیں اُن میں پروفیسر لیوی اور مس سپالڈنگ کی نئی کتاب LITERATURE IN AN AGE OF SCIENCE قابل ذکر ہے۔

۱۷ اپریل جمعہ ــــ کل سے طبیعت سُست سی ہے، بیمار ہونے کا احساس ہے۔ نہ جانے کیوں بار بار خیال دِل کی طرف جاتا ہے دل کی بیماری، شاعرانہ مفہوم میں نہیں، واقعی ــــــــ پڑا ہوا پڑھتا رہا۔ خاص طور سے رادھا کرشنن کی ادارت میں مرتب کی ہوئی ہسٹری آف فلاسفی۔ ایسٹ اینڈ ویسٹ، دو جلدوں میں ہزار صفحوں سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ وزارت تعلیمات حکومت ہند کے زیر اہتمام تقریباً ساٹھ لکھنے والوں کے تعاون سے یہ کتاب تیار ہوئی ہے۔ میں اس وقت بھلا اسے کیا پڑھتا مگر بی بی سی کے لئے اس پر تبصرہ کرنا ہے۔

حلقہ اربابِ ذوق لندن والوں سے وعدہ کرلیا تھا کہ موجودہ امریکی ادب پر ایک مضمون اُن کے جلسے میں پڑھوں گا، وہ بھی کل ہی پڑھنا ہے، کچھ لکھ لیا ہے کچھ لکھوں گا، جی نہیں لگ رہا ہے - پھر تضیع اوقات کا احساس دامنگیر ہے۔

آج انڈیا کلب میں ڈاکٹر دوبے نے "موجودہ ہندوستانی قبائل اور اُن کے مسائل" پر تقریر کی، تقریر اچھی تھی - ڈنر بھی تھا، میں اس کلب کا ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی شرکت کرلیتا ہوں کہ شائد کسی معقول آدمی سے ملاقات ہوجائے۔ ذرا یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اب انگریزوں کا رویہ ہندوستان کی طرف کیا ہے۔ مگر یہاں زیادہ تر وہی لوگ ملتے ہیں جو ہندوستان کے دوست کہے جاسکتے ہیں۔

۱۸ اپریل سنیچر — دن میں اُلٹا سیدھا وہ مضمون لکھ ڈالا جو آج پڑھنا تھا، کچھ وقت نکال کر ریڈیو ٹاک کا بھی کچھ حصہ لکھ ڈالا، مشکل ہندی ہیں - عملاً ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ سنجیدہ علمی مضامین یا تو مشکل اُردو میں ہوتے ہیں یا مشکل ہندی میں - پھر بھی میرا عقیدہ ہے کہ چونکہ دونوں زبانیں بنیادی طور پر ایک ہی ہیں اس لئے دونوں کبھی ایک ہو جائیں گی مگر کب، کس طرح اور کس شکل میں، ابھی یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے - خیر یہ مسئلہ بہت نازک ہے، یہاں تخیئل کے پَر جلتے ہیں۔

طبیعت بہت سست ہے، کہیں نہیں گیا، حلقہ اربابِ ذوق کے جلسے میں کچھ پڑھا، کچھ باتیں کیں۔ مجلس مختصر تھی لیکن یہ کیا کم ہے کہ کچھ لوگ یہاں اکٹھا ہوکر اُردو کا چراغ جلا دیتے ہیں اور ہم زبانی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔

۲۰ر اپریل دوشنبہ - بے دلی سے یوں ہی انتقام لیا جا سکتا ہے کہ کچھ کرتے رہا جائے - کل بی بی سی میں تقریر کر کے ایک آرٹ تھیٹر دیکھنے چلا گیا - ایک فرانسیسی "خاموش تماشا" تھا، مسرف بیٹا - قصّہ کے لحاظ سے بالکل بے جان، اداکاری اور کمالِ فن کے لحاظ سے بے مثال - صرف چار کردار، محض اشاروں سے محبّت، نفرت، بے دلی، بے چارگی، غم اور خوشی کے مرقعے دکھا کر جادو کرتے رہے - کیا اس پُر اثر سادگی کو "سہل مُمتنع" کہہ سکتے ہیں، بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر شخص یہ سب کچھ کر سکتا ہے لیکن غالباً یہ محض خیال ہے - اسٹیج کی سادہ بناوٹ سے ہندوستانی اسٹیج بہت کچھ سیکھ سکتا ہے -

آج بھی چکّر لگاتا رہا - کتابوں کی دوکانوں میں رُکتا رُکتا نیو بانڈ اسٹریٹ پر پہونچ گیا، دو آرٹ گیلریوں میں نمائش ہو رہی تھی - کچھ وقت وہاں گذارا کوئی غیر معمولی چیز دیکھنے کو نہیں ملی لیکن یہ اندازہ ضرور ہوا کہ ہر جگہ اور ہر دور میں ایک آدھ اچھا تخلیقی عمل ظہور میں آجاتا ہے - شام کو برٹش کونسل کے دفتر پہونچ گیا، ان لوگوں سے ادیبوں، نقّادوں اور پروفیسروں سے ملنے میں مدد لینا ہے - اِس معاملہ میں امریکہ بہتر تھا، لوگ زیادہ تر آسانی سے مل جاتے تھے، یہاں مِلنے جلنے میں وضع کی پابندیاں چلی جا رہی ہیں - برٹش کونسل میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پُرانے انگریزی پروفیسر مسٹر بریڈنر سے ملاقات ہوئی، بڑی محبت سے لکھنؤ کے ایک ایک جاننے والے کو پوچھتے رہے، ان سے پھر ملنا ہے - طبیعت کا وہی حال ہے، اگر دو ایک دن اور یہی صورت رہی تو کسی ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا ہوگا -

۲۲ر اپریل بدھ - کل لندن کی اقبال سوسائٹی کی طرف سے اسلامک کلچر

انسٹی ٹیوٹ میں یوم اقبال تھا۔ ڈاکٹر حامد بلگرامی اور فرید جعفری سے وعدہ تھا، میں بھی چلا گیا۔ دن منانے کے لحاظ سے جلسہ کامیاب تھا ادبی نقطۂ نظر سے ناکام۔ انسٹی ٹیوٹ کے کتب خانہ میں عربی فارسی تاریخوں کا ذخیرہ بہت اچھا ہے، عمارت بڑی اور خوبصورت ہے، پہلے پورا نظم ونسق مصریوں کے ہاتھ میں تھا، اب سبھی اسلامی ممالک چندے سے اسے چلا رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ چند وظائف مقرر کرکے اسلامی تاریخ پر تحقیقی مقالات لکھوائیں تو ایک کام ہو جائے۔

آج کا دن زیادہ تر اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز میں گذارا۔ رالف رسل سے اسکول کے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں ان سے ہندوستان میں کافی ملاقات ہو چکی تھی اور حیدرآباد، اورنگ آباد، اجنتا، ایلورا میں کئی دن تک ڈاکٹر علیم رسل اور میں ساتھ وقت گذار چکے تھے۔ آج پھر تھوڑی دیر کے لئے برٹش میوزیم گیا۔

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں   حالت اک اضطراب کی سی ہے

صرف مصنفوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں، تصانیف کے مسودے، خطوط، مہریں، فرامین، انجیل مقدس کے قدیم نسخے دیکھے۔ ملٹن، ورڈسورتھ، کیٹس، شلی، مل، ڈارون اور ہزارہا دوسرے ادیبوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں دیکھنا کیسا دلچسپ مشغلہ ہے۔ دوسری چیزوں سے الگ یہ ذخیرہ خود اپنی جگہ پر عجیب وغریب خزانہ ہے۔

۴ار اپریل جمعہ۔ کل دن بھر پڑا رہا، صرف چند خط لکھے۔ فکر ہے کہ لوگوں سے ملنے، آکسفرڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے لئے پروگرام بنانے کا کام شروع کردینا چاہئے۔ بعض باتیں معلوم کرنے کے لئے انڈیا ہاؤس گیا کہ ان لوگوں سے تھوڑی بہت مدد ملے گی۔ کئی ہندوستانیوں کے نام معلوم ہوئے جو آکسفرڈ اور کیمبرج میں موجود ہیں۔

وہاں سے نکل کر نیشنل گیلری چلا گیا۔ تصاویر کا یہ بہت بڑا ذخیرہ دنیا کی صرف چند گیلریوں سے نیچے رکھا جا سکتا ہے۔ میں نے یہاں پانچ گھنٹے صرف کئے۔ جرمن بمباری نے اس گیلری کے بھی بعض حصوں کو تباہ کر دیا ہے۔ یہاں یونانی، ڈچ، فرانسیسی، اطالوی، انگریزی، ہسپانوی مصوّروں کی بہت سی اصل تصویریں محفوظ ہیں۔ اس ذخیرہ کے متعلق چھوٹی بڑی سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، میں چند سطروں میں کیا لکھوں اپنے تاثرات! اظہار میں جہل کا خطرہ ہے لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ حسن اور حسنِ تصوّر، رنگ اور آہنگ کی اس دُنیا میں پہونچ کر فنِ مصوّری اور مجسمہ سازی کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور انسان کی تخلیقی قوتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ پروازِ خیال کے باوجود جو فن کار حقیقت سے زیادہ قریب ہے وہی زیادہ متاثر کرتا ہے۔ ریمبراں، لیونارڈو ڈا ونچی، رینوائے، روبنس کی بعض تصویروں نے عالمِ خیال میں نہ جانے کہاں کہاں پہونچا دیا۔

۲۵ اپریل سنیچر۔۔ طبیعت کی سُستی اور اُلجھن سے ہار مان کر آخر آج ڈاکٹر کو دکھانا پڑا۔ کچھ نہیں غالباً معدہ کی خرابی ہے، اور یہ تو پُرانا سلسلہ ہے۔ آج بمبئی کی سماجی کارکن کلثوم سیانی سے بھی ملاقات ہوئی۔ پیرن کیپٹن کے ساتھ مل کر گاندھی جی کے نظریات کے مطابق ہندوستانی پرچار کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔

شام کو ٹیٹ گیلری گیا۔ اس وقت یہاں دو نمائشیں ہو رہی ہیں۔ ایک میکسکو آرٹ کی دوسری جدید آرٹ کی، بلکہ ماورائے جدید مجسمہ سازی کی۔ یہ دوسری نمائش دلچسپ ہے۔ جدید آرٹ کے حامیوں کی طرف سے ٹیٹ گیلری کے زیرِ اہتمام مجسمہ سازی کے ایک مقابلہ کا اعلان کیا گیا۔ موضوع تھا "نامعلوم سیاسی قیدی"

ساری دنیا میں اس کی اشاعت ہوئی اور مقابلہ میں ستاون ملکوں نے شرکت کی، ساڑھے تین ہزار فن کاروں نے اپنے "زادہ ہائے فکر" پیش کئے۔ اُن میں ملکوں ملکوں سے انتخاب کرکے تقریباً ڈیڑھ سو "مجسمے" لندن لائے گئے اور اِن میں سے اسّی چھوٹے بڑے انعامات کے مستحق قرار پائے۔ سب سے پہلا انعام انگلستان کے فن کار رِگ بٹلر کو ملا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس نمائش کو نہ دیکھا تو بہت سے لوگ بدذوق کہیں گے چنانچہ گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ "فنِ محض" یا "شُدھ کلا" کے ان نمونوں میں میرا وہ حال تھا جو علما کی محفل میں ایک جاہل کا ہوگا، حالانکہ وہاں ہم شکل ہونے کا احساس کچھ تو اشتراک پیدا کرے گا، یہاں وہ بھی نہیں تھا۔ جو چند مجسمے اچھے قرار دئے گئے تھے اُن کے علاوہ چھوٹے چھوٹے انعامات حاصل کرنے والوں میں بعض خیال انگیز تھے لیکن چونکہ وہ موضوع سے کچھ تعلق رکھتے تھے اِس لئے ججوں کی نظر میں زیادہ نہیں جچے! اِس نمائش کے سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یہ پیش آیا کہ ایک دن ایک نوجوان تماشائی نے اوّل قرار دئے جانے والے مجسمے کو دیکھتے دیکھتے غصہ میں آکر زمین پر پٹک دیا اور وہ چُور چُور ہوگیا۔ تھوڑے سے تار تھے، کچھ پیتل اور کچھ پتھر — نوجوان کو سزا ہوگئی اور فن کار نے دو دِن کے اندر پھر ویسا ہی مجسمہ بنا کر لا کھڑا کیا۔

نمائش کے اِن کمروں سے الگ، رودؔاں کا مشہور سنگ مرمر کا مجسمہ "بوسہ" رکھا ہوا تھا، میرا عقیدہ ہے کہ تنہا یہ کارنامہ لاکھوں جدید کارناموں کی ندرت، جدّت، خیال انگیزی اور فنّی کرتب پر بھاری ہے۔ دو جسموں کا حسین پیچ و خم، ہونٹوں کا وصل، جسم کے خطوط کا جھکاو، چہروں پر صحت مند شباب کا جلال اور

محبت کی نرمی ۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اِس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار۔
اگر فن کا مقصد فن کار اور دوسروں کے درمیان کوئی رشتہ قائم کرنا ہے تو نئے
مجسموں میں سے اکثر اظہار کا بہت ناقص نمونہ ہیں ۔ نہ ان میں موضوع کا تصوّر ہے
نہ ہیئت کا حُسن ـــ مجھے تو شک ہے کہ انھیں فن برائے فن بھی کہا جاسکتا ہو یا نہیں
ٹیٹ گیلری میں اور بہت کچھ ہے ، ٹیمس کے کنارے یہ اونچی عمارت
چھپّن سال سے اپنا دامن نئے نئے پھولوں سے بھرتی جا رہی ہے اس میں انگریزی
اور فرانسیسی مصوری اور مجسمہ سازی کے اکثر بہترین کارنامے محفوظ ہیں ۔

۲۷ر اپریل دوشنبہ ـــ کل دن بھر پڑا رہا ، کچھ پڑھا ، کچھ خط لکھے ۔ شام کو
ابو سالم صاحب (شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی) سے ملنے گیا اور رات گئے پلٹا۔
آج اورئنٹیل اسکول کا کتب خانہ دیکھا ۔ اِسے دیکھنا بھی نہیں کہہ سکتے ، پھر بھی یہ
اندازہ ہوا کہ جن کتابوں کے لئے ہندوستان میں آنکھیں ترستی ہیں وہ یہاں موجود
ہیں ۔ آج برٹش میوزیم میں کئی گھنٹے گذارے ۔ کیسے بتاؤں کہ یہاں کیا کیا ہے ۔
ملکوں ملکوں کے تہذیبی آثار ، لباس ، ظروف ، مہریں ، زیورات ، نقاشی کے
نمونے ، مجسمے ، اسلحہ جات ، کیا نہیں ہے ! کتابوں اور مخطوطوں کے نوادر سے
الگ اِن چیزوں کی قیمت کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے ۔ آج میں نے پھر کتابوں سے
جان بچائی ، تھک کر چُور ہو رہا تھا ۔ رات کا کھانا فیروز جبین کے یہاں کھایا ۔

۲۹ر اپریل بُدھ ـــ طبیعت ٹھیک نہیں ۔ ہے کیا ، مجھے خبر نہیں ، ڈاکٹر
کے یقین دلانے کے باوجود اُلجھن ـــ کل دن بھر پڑا رہا ۔ شام کو برٹش کونسل گیا ۔
چائے مسٹر برینڈر اور مسٹر الٹن کے ساتھ پی اور انگلستان اور امریکہ کی تعلیمی حالت

اور ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ رہا۔ کچھ نام معلوم ہوئے جن سے ملنا دلچسپ ہوگا۔

آج سخت بارش کے باوجود اورنٹیل اسکول گیا اور اسکول کے سکریٹری کرنل بارٹلٹ، اسکول کے ڈائرکٹر سر رالف ٹرنر شعبۂ لسانیات اور صوتیات کے صدر پروفیسر فرتھ، ہند آریائی زبانوں کے شعبہ کے صدر پروفیسر برُف اور دوسرے اساتذہ سے ملا۔ اِن حضرات کو میں نے ہندوستان میں زبانوں کے موجودہ مسائل کی طرف متوجہ کیا، وہاں زبانوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں جس قسم کی لاعلمی ہے اُس کا ذکر کیا، اصلاحات، قومی زبان، لسانی صوبہ جات، اُردو کی جگہ، غرض کہ جن باتوں کا ذکر کرسکتا تھا سبھی کا تذکرہ آیا۔ اُنھیں اُکسایا کہ ان مسائل پر مضامین لکھیں، ہم تو لکھ ہی رہے ہیں لیکن حالات ایسے ہیں کہ بہت سے لوگ ہماری باتیں نہیں سُننا چاہتے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ مسئلہ ان کے لئے محض علمی ہے، وہ براہِ راست اس سے متاثر نہیں ہوتے اِس کے علاوہ ایک خالص علمی انداز میں مطالعہ کرنے کی وجہ سے وہ زبان کو ایک زندہ حقیقت کی طرح نہیں دیکھتے بلکہ محض چند آوازوں، لفظوں، قدیم تحریروں کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ زبان کے متعلق یہ سوچنا کہ کسی سماج میں اُس کی کیا جگہ ہے، اُس کا عمل کیا ہے، اُس کے بننے بگڑنے میں سیاست اور زبردستی کا کتنا ہاتھ ہے، اِن باتوں سے اُنھیں سروکار نہیں۔ گو ہر ایک نے کہا کہ اُردو ہندوستان کی زبان ہے اُسے مع اپنے رسم خط کے بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دینا چاہئے، ہندی کو لوگوں پر لادنا نہیں چاہئے، اُسے سنسکرت آمیز نہیں بنانا چاہئے، لیکن اِس کے متعلق یہ لوگ لکھنا نہیں چاہتے۔ لسانیات میں سارا زور زبان کے — اور خاص کر غیر ملکی زبان کے — سیکھنے،

آوازوں میں تغیر پیدا ہونے، تلفظ اور قواعد پر ہے اور جن دو طریقوں یعنی
PALATEOLOGY اور KYMOLOGY سے کام لیا جا رہا ہے
اور اُن پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے، اُن میں زبان کے ارتقا اور
سماجی یا تاریخی تصوّر کی کہانی اہم جگہ نہیں رکھتی۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ
زبان کے مطالعہ کے یہ بھی بڑے اہم پہلو ہیں لیکن صرف یہی تو نہیں ہیں۔
بعض اساتذہ کی باتوں سے تو یہ اندازہ ہوا کہ وہ زبان اور سماج کے تعلق کی
بحث کو عالمانہ موضوع گفتگو ہی نہیں سمجھتے۔ خیر مجھے یہ تسکین ہے کہ میں نے
ان لوگوں کے سامنے سب کچھ رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر ٹرنر اگلے مہینہ ایک غیر رسمی
لسانی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے ہندوستان جا رہے ہیں، میں نے ان سے
درخواست کی ہے کہ وہ اس غیر رسمی گفتگو میں ان مسائل کو بھی چھیڑ دیں اور
موصوف نے نیم رضامندی ظاہر کی ہے۔

یکم مئی جمعہ۔ دو دن اورنٹیل اسکول ہی کی نذر کئے۔ صوتیاتی معمل خانہ دیکھا،
فارسی، مراٹھی اور ہندی کے اساتذہ سے ملا۔ بعض کی لگن اور محنت دیکھ کر
رشک آتا ہے۔ ہندوستان میں بھی ایک ایسے اعلیٰ درجے کے ادارہ کی سخت ضرورت ہے۔
کون اِدھر متوجہ ہوگا! دو دن سخت بارش ہوئی، ہوا اور ٹھنڈک کا مقابلہ کرنا پڑا۔
میں ٹھیک ہوں، کس چیز کی کمی محسوس کرتا ہوں کہہ نہیں سکتا۔ یہ بے دلی تو
ہمیشہ کی رفیق ہے، اِس سے محبت ہوگئی ہے۔ مجھے ہو یا نہ ہو اِسے تو ہے۔
یہاں یکم مئی کا جلوس اگلے اتوار کو نکلے گا، ہو سکا تو دیکھوں گا۔

۳ مئی اتوار۔ پروفیسر راؤلینڈ کی کتاب ART & SCULPTURF OF INDIA پر

بی بی سی کے لئے ہندی میں تبصرہ کرنا تھا، کل اُس کی ریکارڈنگ کے لئے گیا۔ کتاب دلچسپ اور معلومات افزا ہے لیکن ہندوستان میں صرف جین، بدھ، اور ہندو مصوّری اور فن تعمیر کو شامل کیا گیا ہے اور ہندوستان کے باہر جہاں کہیں بھی بودھی اثرات پہونچے ہیں اُن کا ذکر بھی اس طرح کیا گیا ہے جیسے ہندوستان ہی کے فنونِ لطیفہ کا ذکر ہو۔ یہ باتیں کیوں پیدا ہوئیں اس کا اہم سبب یہ ہے کہ پروفیسر راؤلینڈ نے ان فنون کو مذہبی علامت کی شکل میں دیکھا ہے اور اسی طرح نقوش، خطوط، مجسموں، عمارتوں کی تشریح اور تعبیر کی ہے۔ بعض مقامات پر اس سے دلکشی پیدا ہوگئی ہے لیکن ہر جگہ تو یہ منتر کام نہیں دے سکتا! سترھویں اٹھارھویں بلکہ ابتدائی انیسویں صدی کے راجپوت اور کانگڑہ مصوّری کا ذکر ہے اور ایک جگہ ہلکے سے اشارے کے سوا اور کہیں بھی ہند اسلامی مصوّری کے ملے جُلے تصوّر کا ذکر نہیں ہے، یہی حال تعمیرات کے سلسلہ میں بھی ہے۔ اِس ارتقائے فن کی یہ کہانی ادھوری اور بعض اوقات بے حقیقت معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ تبصرہ آج نشر ہوا، میں نے لکھنؤ بچوں کی اطلاع تو دے دی تھی اگر وہ سُن سکیں گے تو خوش اور متعجب ہوں گے ایسی زوردار ہندی پر!

آج وقار، بیگم وقار، عصمت اور عزت آگئے اور گھنٹوں ہندوستان پاکستان، امریکہ اور انگلستان کا ذکر رہا۔

۱۳ مئی دوشنبہ۔ گھر سے اس نیت سے نکلا تھا کہ انڈیا ہاؤس جاؤں گا، پکیڈلی کے قریب رائل اکیڈمی کی نمائش عناں گیر ہوگئی اور تین گھنٹے میں نے وہاں صرف کر دیئے۔ یہ نمائش صرف برطانوی مصوّروں کے بنائے ہوئے مجسموں اور

مرقعوں کی تھی ۔ دو تین کے علاوہ مجھے برطانوی مصوروں سے کبھی کوئی مخصوص دلچسپی نہیں پیدا ہو سکی ہے ۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ ان کے خطوط میں زندگی کا وہ بہاؤ ، ان کے رنگوں میں وہ حسن نہیں ملتا جس سے تخلیقی کارنامہ وجود میں آتا ہے ۔ سوچتا ہوں تو مجھے ان میں تخئیل کی بھی کمی نظر آتی ہے ۔ جیسی شاندار ان کی ادبی روایات ہیں ، مصوری اور مجسمہ سازی اُس کا پاسنگ بھی نہیں ہیں ۔

سارا وقت گذار کر انڈیا ہاؤس پہونچا تو جن لوگوں سے ملنا تھا وہ ملے نہیں ، تھکتا ، کتابوں کی دوکانوں میں رُکتا ، ریجنٹ اسٹریٹ پر ایک اطالوی سینما دیکھنے چلا گیا ۔ INFIDELITY ، خوبصورت ، خیال انگیز ، فن کارانہ اور عام راستوں سے ہٹا ہوا ، جگہ جگہ پر عُریاں مگر اپنے مرکزی تصوّر سے دست و گریبان ۔

۶ مئی بُدھ ۔ خطوں کا پھر ڈھیر لگ گیا ، کل خط ہی لکھتا رہا ، لمبے ، مختصر ، پیچیدہ ، سادے ، سوچ بچار والے اور غیر رسمی خط ۔ کوئی اور کام نہ ہو تو یہ مشغلہ بڑا دلکش ہے ، اس بہانے کون کون آجاتا ہے ، کیا کیا باتیں ہوتی ہیں ، کیا چھپایا جاتا ہے ، کیا لکھا جاتا ہے ، دل میں کیسی بحثیں چھڑتی ہیں کہ یہ بات کس طرح لکھی جائے ، جی لگ جاتا ہے تو ع کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے ۔ کا منظر پیش ہو جاتا ہے ۔ ورنہ روکھے پھیکے جملے ، بے جان الفاظ ، کاروباری انداز ۔ جبر اور اختیار کی کشمکش ، جُراتِ رندانہ اور بُزدلی یا احتیاط پسندی کے تماشے یہیں دیکھنے میں آتے ہیں ۔ کبھی ایک طرف در بند نظر آتا ہے اُسے کھولنا پڑتا ہے ، کبھی کھُلا دروازہ بند کرنا ہوتا ہے کبھی روٹھے کو منانا اور کبھی رُوتے بسورتے کو تسکین دینا ہوتا ہے ، شاید دُو بدُو زبان نہ کھُلے خط میں تو کھُل ہی جاتی ہے ۔ بہر حال ہے دلچسپ مشغلہ مگر بہت نازک ،

کارگہ شیشہ گری سے بھی زیادہ!

دیوان غالب پڑھتا رہا، دستِ صبا پڑھتا رہا، آہنگ پڑھتا رہا۔ غالب کا یہ شعر کیوں ذہن میں دھنس گیا؟

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا ‏ ‏ رکھ لیجو میرے دعوی وارستگی کی شرم

آج انڈیا ہاؤس گیا، جن لوگوں سے ملنا تھا کسی سے ملاقات نہیں ہوئی، اچھا خاصا وقت وہاں کے کتب خانے میں گذارا، انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندوستان کے متعلق بہت اچھا ذخیرہ یہاں بھی موجود ہے۔ شام ہو چکی تھی اور جی اُداس تھا، ایک فرانسیسی فلم NIGHT BEAUTIES دیکھنے چلا گیا، ایک خیال پرست فن کار کی کہانی، جو گذری ہوئی صدیوں کا سارا حُسن اور ساری لطافت اپنے وجود میں مرکوز کر لینا چاہتا ہے۔ یہ صدیاں خوابوں میں اُس کا پیچھا کرتی ہیں۔

۹ رمئی سنیچر ۔ دُو دن بھر اورنٹیل اسکول اور برٹش میوزیم کی نذر کر دئے۔ گھر پر بھی پڑھتا ہی رہا، کتنی باتیں ذہن میں آتی ہیں کیا کبھی اُنھیں لکھ سکوں گا! ناکامی اور نامرادی کا نہیں بے دِلی اور بے حوصلگی کا احساس ہے۔ جاگتا ہوں، سو جانا چاہتا ہوں، اُٹھتا ہوں گر پڑتا ہوں، ذہن میں سخت جنگ ہوتی ہے، جیتتا ہوں ہار جاتا ہوں، مقدمہ عجیب ہے، خود ہی مدعی خود ہی مدعا علیہ، خود ہی وکیل اور خود ہی گواہ اور خود ہی فیصلہ کرنے والی عدالت اور خود ہی سزا کا نفاذ کرنے والا حاکم ——— آج آلِ حسن وغیرہ کے ساتھ KEW GARDEN دیکھنے گیا، پھولوں کا خوبصورت چمن اور اونچے سایہ دار درختوں کا حسین باغ، کیسے کہوں کہ جی نہیں لگا۔ پھر انھیں لوگوں کے ساتھ ایک اطالوی فلم 2 PENNIES WORTH OF HOPE دیکھا۔

اس فلم کو گاؤں کے لوگوں نے مِل کر بنایا ہے، کوئی پیشہ ور اداکار اس میں شریک نہیں، بے حد دلکش ہے۔

۱۱ مئی دوشنبہ ۔ کل دن بھر گھر ہی پر رہا فیروز جبین آگئی تھیں، گھنٹوں شخصیتوں، سیاسی اور ادبی مسئلوں پر باتیں ہوئیں۔ پرشوق سُننے والے کان مِل جائیں تو کون بکواس پر مائل نہ ہوگا! وہ یہاں رتن ناتھ سرشار پر کام کرنا چاہتی ہیں، بہت سا ایسا مواد مِل جائے گا جس کا ہندوستان میں خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔

لیڈس یونیورسٹی میں مسٹر آرنلڈ کیٹل انگریزی پڑھاتے ہیں، انگریزی ناول کی تنقیدی تاریخ دو جلدوں میں لکھی ہے ایک صاحب کے مشورے سے اُنھیں خط لکھ کر یہ پوچھا تھا کہ لندن، کیمبرج اور اکسفرڈ میں کن نقادوں سے ملنا مفید ہوگا۔ اُن کا خط آیا تھا کہ ۱۱ کو اتفاقاً لندن آنے کی صورت ہو گئی ہے پکیڈلی میں مل لیجئے تو کہیں اکٹھا بیٹھ کر گھنٹہ بھر باتیں ہوں۔ چنانچہ آج اُن سے ملاقات ہوئی، ایک جگہ کافی پی گئی اور باتیں ہوئیں۔ اُن سے چند ناموں کا پتہ چلا اور وہ جو میرا خیال تھا کہ انگلستان میں اعلیٰ پیمانہ پر ادبی سرگرمیاں کمی پر ہیں، اس کی تائید کیٹل نے بھی کی۔ سب سے بڑی کمی تو یہ نظر آئی کہ یہاں سے اچھے ادبی رسائل بہت کم شائع ہو رہے ہیں، اس لئے نئے لکھنے والوں کو اُبھرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ترقی پسندی کسی تحریک کی شکل میں نہیں ہے لیکن ایسے ادیب امریکہ کی طرح ادبی دنیا سے باہر بھی نہیں کر دئے گئے ہیں تاہم میرا خیال ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں تنظیم کی ضرورت ہے۔

آج صبح کے اخباروں میں برطانیہ کی خارجی پالیسی پر چرچل کا پُر زور بیان

شائع ہوا ہے، امریکی اور برطانوی دوستی میں کوئی نہ کوئی ایسا شگاف ضرور پڑ رہا ہے کہ اس بوڑھے قدامت پسند کو بھی اپنا لہجہ بدلنا پڑا مجھے یقین ہے کہ امریکہ میں اس کا اچھا خیر مقدم نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اصل معاملہ تجارت کا ہے، یہی رقابت امریکہ اور برطانیہ کے مفاد میں تصادم کا سبب بنے گی۔ انگلستان ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے امریکہ کے مقابلہ میں کافی پسپا ہو چکا ہے، آسانی کے ساتھ اپنی موت قبول نہیں کرے گا۔ بہر حال دیکھنا ہے کہ یہ محض زبانی جمع خرچ ہے یا واقعی انگلستان کی سیاست کا رُخ بدل رہا ہے، چرچل پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

۱۲ مئی منگل ۔ اورینٹیل اسکول میں تاریخ اور اقتصادیات کے اساتذہ سے ملا۔ ان کے وسیع مطالعہ اور علم نے متاثر کیا۔ کافی کام کر رہے ہیں خاص کر مسٹر ہارڈی نے ایک دلچسپ کام کیا ہے۔ ہندوستان کی چند اہم فارسی تاریخوں (مثلاً بدایونی، ابوالفضل وغیرہ) کا مطالعہ کر کے اُن مورخوں کے فلسفۂ تاریخ اور نظریہ واقعہ نگاری کے اصول اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ معلوم نہیں کام کیسا ہوگا اور خود ہارڈی کا نقطۂ نظر کہاں تک درست ہوگا لیکن یہ کام ہے دلچسپ۔ اس کے متعلق پھر باتیں کرنے کا وعدہ ہے۔

یونیورسٹی کالج گیا تھا وہاں اپنے محترم استاد الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبۂ انگریزی پروفیسر ایس سی دیب سے ملاقات ہو گئی۔ یہاں اعتراف کرنے کو جی چاہتا ہے کہ میرے ادبی ذوق کی نشوونما میں پروفیسر دیب کی کیمیا ساز نگاہوں کا فیض بھی شامل ہے۔ آج اُن سے مل کر اور دو ایک انگریزی کے اساتذہ سے اُنھیں باتیں کرتے دیکھ کر ذہن بیس سال پیچھے چلا گیا اور اپنی طالب علمی کے دن

یاد آگئے - مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں کے انگریزی کے اساتذہ ان کی وسعتِ مطالعہ پر متحیّر ہیں، بس سُنے جا رہے تھے۔ کیا یہ خوش ہونے کی بات نہیں ہے!

۱۳ ارمئی بدھ - آج پروفیسر ہائی من لیوی نے پولش کلب میں لنچ پر بلایا تھا۔ کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ لیوی کون ہیں؟ امپیریل کالج لندن یونیورسٹی میں ریاضیات کے پروفیسر ہیں، اُن کی چند تصانیف میں نے بھی پڑھی ہیں - ابھی لندن پہونچ کر اُن کی نئی کتاب دیکھی LITERATURE IN AN AGE OF SCIENCE اِس کتاب کے لکھنے میں مس ہیلین اسپالڈنگ بھی اُن کی شریک تھیں - لنچ میں وہ بھی موجود تھیں۔ پروفیسر لیوی کی ہر کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مشکل ترین مسائل کو آسان ترین الفاظ میں لکھتے ہیں، سو فیصدی مارکسی ہیں لیکن مارکس کا نام لئے بغیر سب کچھ کہتے ہیں۔ - اتنے بڑے عالم سے ملتے ہوئے کچھ خوشی اور کچھ اُلجھن کا احساس تھا، دو گھنٹہ اِس بے تکلفی سے باتیں ہوئیں جو یاد رہیں گی - گفتگو کے موضوع تھے ہندوستان کے لسانی اور ادبی مسائل، انگلستان میں جدید ادب، چرچل کا بیان (جس سے وہ زیادہ امید نہیں رکھتے) امریکہ میں ترقی پسندوں کی حالت، ادبی تنظیم، ادب میں ترقی پسندی کا مفہوم وغیرہ ـ مس اسپالڈنگ بھی ذہین اور ہوشیار معلوم ہوتی ہیں - یہ لوگ ایک نیا لفٹ بک کلب شروع کر رہے ہیں، ہندوستانی افسانوں کا مجموعہ شائع کرنا چاہتے ہیں، میں نے مدد کا وعدہ کیا ہے۔ دیکھوں کس حد تک پورا ہوتا ہے - میں نے بھی ایسے کلب کے متعلق اپنے خیالات انھیں بتائے۔ کاش ہم ہندوستان میں بھی چھوٹے ہی پیمانے پر سہی ایسی ہی ادبی تنظیم کر سکتے!

۴ ارمئی جمعرات ۔۔ اپنی موسمی روایت کے مطابق لندن بارش میں نہارہا تھا مگر میں ناشتہ کرکے باہر نکلا۔ کئی دن سے وکٹوریہ البرٹ میوزیم کا پروگرام بن بن کر رہ جاتا تھا۔ آج اسے پورا کرہی دیا۔ یہ میوزیم بھی غضب کا نکلا۔ ہر طرح کے نوادر، لباس، اسلحے، ظروف، تصاویر، سامانِ آرائش۔ یہاں بھی بہت کچھ ہے اور دیکھنے کے لئے بہت وقت چاہیئے۔ پھر بھی اپنی معلومات اور اپنے ذوق کی مناسبت سے ایک شخص دیکھنے کے لائق چیزوں کا انتخاب کرسکتا ہے۔ اندر بہت خوبصورت رِسٹراں ہے، وہاں وقت اچھا گذر سکتا ہے کیونکہ میوزیم کے نوادر دیکھتے ہوئے شائد آپ کو انسانی چہروں کے دیکھنے کا وقت نہ ملا ہو، یہاں بیٹھے بیٹھے نگاہوں کو اِس گستاخی کا اِذن بھی دیا جاسکتا ہے اور اگر جگہ کی کمی کی وجہ سے آپ کے میز پر کوئی زہرہ جبین آپ سے اجازت لے کر بیٹھ جانا چاہے تو پھر موسم کی بے کیفی، گھنٹوں چلتے رہنے کی تھکن کا احساس بھی باقی نہ رہے گا۔ اس میوزیم کا وہ حصّہ جس میں ہندوستانی نوادر ہیں ایک دوسری عمارت میں کچھ فاصلے پر ہے۔ وہاں جی نہ لگنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ مختلف زمانوں کے چوبیں مکانات کے نمونے، مجسمے، تصاویر، لباس، ظروف اور تمام ایسی چیزیں موجود ہیں جن کا آپ کسی میوزیم میں تصوّر کرسکتے ہیں۔ مغل، راجپوت اور کانگڑہ اسکول کی تصویروں کے علاوہ دکن کی مصوّری کے اچھے نمونے یہیں دیکھے۔ وہ مصوّری جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دَور اور "انگریزی نوابوں" کے درباروں میں جنم لیا اُس کا بھی بہت بڑا ذخیرہ یہاں موجود ہے۔ خیّامی انداز کی ایک تصویر جو مغل عہد میں بنی تھی کچھ دِن تو ضرور نگاہوں میں پھرتی رہے گی۔ ایک شخص ایک کُنج کے قریب،

بغل میں کتاب ایک ہاتھ میں سرود ایک میں جام لئے ہوئے اپنی ابیقوریت کے ختم ہونے پر ماتم کر رہا ہے۔ چہرے کے نقوش زندہ اور واضح ہیں اور تصویر کے نیچے یہ شعر ہے ؎

من بودم و کنجے و کتابے و سرودے　　غم را کہ خبر کرد و بلا را کہ نشاں داد؟

اسی جگہ کنسنگٹن میں نیچرل ہسٹری اور سائنس کے میوزیم بھی ہیں، کچھ وقت وہاں گذار کر میں انڈیا ٹوڈے کے مصنف رجنی پام دت سے ملنے چل دیا۔ وقت مقرر کر چکا تھا، ٹھیک وقت پر پہونچ گیا اور میں نے اس مصروف رہنما اور مصنّف کا ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت ضائع کیا۔ کچھ امریکہ کے متعلق باتیں ہوئیں کچھ ہندستان کی لسانی گتھّی کے متعلق، کچھ انگلستان میں ترقی پسند قوتوں کے منظم ہونے اور ادب، اور زندگی کے تعلق کے بارے میں۔ میں نے پام دَت کو کسی حد تک اس پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ بالکل علمی اور بے لاگ انداز میں ہندوستان میں زبان کے مسئلہ پر ایک نظریاتی مضمون لکھیں کیونکہ جہاں تک اُردو ہندی کا تعلق ہے ترقی پسندوں کے ذہن میں بھی انتشار ہے۔ ایک مسئلہ پر میں مطمئن نہ ہو سکا اور وہ تھا ہندوستانی ادب میں اُن جمہوری تقاضوں کی جھلک کا جو بظاہر بڑھ رہے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ خود جمہوری تقاضے واضح شکل میں ادیبوں اور شاعروں کے شعور کا جُز نہیں بنے ہیں ـــ طے ہوا کہ اس کے متعلق مارس کارن فورتھ سے باتیں کروں، کل کے لئے وقت مقرر ہو گیا۔ پام دت سے مِل کر نکلا تو کمیونسٹ پارٹی کے کلچرل سکریٹری مسٹر سیم کلیر ڈ نووِچ سے ملاقات ہو گئی۔ زیادہ تر گفتگو یونٹی تھیٹر کی تحریک کے متعلق ہوئی۔

شام ہو چکی تھی، بارش تھم گئی تھی اور مجھے تھکن کا احساس تھا لیکن پکیڈلی میں پہونچا تو یکایک لندن کی خوبصورت شام کا احساس مجھ پر پھٹ پڑا۔ زندگی کی عظیم الشان چہل پہل اور دلکشی! مجھے ہمیشہ افسردہ کر دیتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ ایک بھلے چنگے آدمی کو فلسفی بنا دے۔ آج بھی مجھ پر یہی کیفیت طاری ہوئی، پکیڈلی کے ایک رسٹران میں بیٹھ گیا۔ کون کہتا ہے کہ زندگی حسین نہیں ہے! یہ خوبصورت دن اور یہ حسین راتیں، یہ پُر جلال آفتاب اور یہ چاند ستاروں کا حُسن، یہ نور و نکہت کی فراوانی اور یہ بادلوں کی ہما ہمی، یہ گُل بیز چمن اور پھولوں کے یہ عناں گیر رنگین تختے، یہ نغموں کا بہتا ہوا سیلاب اور یہ مصوّری اور مجسمہ سازی کے معجزے، یہ شاندار عمارتیں اور یہ ہنستے ہوئے بے فکر لوگ، یہ تفریح کدے اور یہ رقص گاہیں، یہ کتب خانے اور میوزیم، یہ تہذیب کی برکتوں سے مالامال زندگی — کون کہتا ہے کہ زندگی حسین نہیں ہے!

یہ انسانی حسن یہ جامہ زیب جسم، یہ گوشت اور پوست کے اندر تھرکتی ہوئی جوانی، یہ اختلاط اور پیار کے نظارے، یہ جرات شکن بے اعتنائی، یہ رنگین ہونٹوں کے دلاویز خطوط اور یہ آبشار کی طرح گرتی ہوئی زلفیں، یہ جسم کے اندر نہ سمانے والا شباب (سینۂ شمشیر سے باہر ہے دَم شمشیر کا!) کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی حسین نہیں ہے!

یہ علم و فضل کا دریا بہانے والے دانشور، یہ قربانیاں دینے والے سیاسی کارکُن، یہ زندگی اور سماج کے دلوں کی دھڑکن سننے والے انسان دوست، یہ آگے بڑھنے کے لئے جد وجہد کرتی ہوئی انسانیت! کیا ان میں حُسن نہیں ہے؟ لیکن ٹھہرو! میرے اندر کوئی اور بولنے لگا — یہ مفلسی کا شباب اور یہ بکتے ہوئے جسم،

یہ جوانوں کے زرد چہرے اور پھیکے تبسّم ، یہ بھیک مانگتی نگاہیں یہ بیمار بچّے ، یہ سرمایہ داری کے ماتھے کی شکن اور مزدور کے جسم کا پسینہ ، یہ ہونٹوں پر سوئے ہوئے سوال اور یہ اظہار حقیقت پر پابندیاں ، یہ ارمانوں کے مدفن بن جانے والے سینے اور یہ دھڑکتے دلوں کی دُوری ، یہ طاقت کا نشہ اور کمزور کی بے بسی ، یہ رنگ اور نسل کی خلیج اور قتل و غارت کی گرم بازاری —— کیا میں یہ سب کچھ اس لئے سوچتا ہوں کہ افسردہ ہو جاؤں ، مجھے افسردگی عزیز ہوتی جا رہی ہے ؎

تجھ کو لگ جائے گی یہ بیماری میری افسردگی سے پیار نہ کر
میں نے باتوں میں زہر گھولا ہے میری باتوں کا اعتبار نہ کر

عجیب مُوڈ ہے اب نہیں لکھوں گا !

۱۵ مئی جمعہ — آج بھی صبح کے حصّہ میں کل والا موڈ طاری رہا لیکن میں نے اُس پر قابو پانے کے لئے ہائڈ پارک کی چہل پہل میں خود کو کھونا چاہا ۔ موسم غنیمت تھا ۔ وہاں ٹہلتے ٹہلتے بیکاری اور تضئیع اوقات کا احساس ہوا تو میں اورنٹیل اسکول چلا گیا ، کچھ وقت اساتذہ سے باتیں کرنے میں ، کچھ وہاں سے نکل کر برٹش میوزیم میں گذارا ۔ کتابوں کی دوکانوں میں پھرا اور گھر آ گیا ۔ آج ریجنٹ پارک میں اوپن ایر تھیٹر دیکھنے کا پروگرام تھا ۔ شیکسپیر کے ڈرامے TWELFTH NIGHT کی باری تھی ۔ لوگوں کا ہجوم تھا ، کچھ کرسیوں پر بیٹھے تھے کچھ گھاس پر ، کچھ کھڑے تھے کچھ تقریباً لیٹے ہوئے ۔ میں بھی آلِ حسن وغیرہ کے ساتھ پہونچا ۔ لطف آ گیا ۔ نہ کوئی ساز نہ سامان ، نہ اسٹیج کا جھگڑا ، نہ گرین روم نہ مختلف پردے لیکن سب کچھ ایسے سادہ طریقے پر ہو جاتا ہے کہ ڈرامے اور شاعری کی

روح نمایاں ہو جاتی ہے۔ ایک ذرا سی اونچی جگہ ہے جسے اسٹیج کہہ لیجئے۔ چند سیڑھیاں ہیں۔ جھاڑیوں کی دیوار ہے جس میں مختلف دروازے ہیں، دو ایک سیمنٹ اور پتھر کی کرسیاں اور بنچ ہیں — یہی ساری کائنات ہے۔ میز وغیرہ سب کے سامنے ہی اُٹھا کر لاتے ہیں اور پھر واپس لے جاتے ہیں۔ میرے لئے بالکل ہی نئی چیز تھی اور واقعی اس نئے تجربے نے جی خوش کر دیا۔

۱۶ر مئی سینچر — دوپہر کے بعد مارس کارن فورتھ سے ملنے لارنس وِشارٹ کمپنی گیا۔ شدید بارش ہو رہی تھی لیکن میں نے فون کر دیا تھا اور وہ میرے منتظر تھے۔ اُن سے بھی انگلستان میں جدید ادبی رجحانات اور ترقی پسند دانش وروں کی تنظیم کے متعلق باتیں ہوئیں۔ اِدھر انھوں نے دو جلدوں میں جدلیاتی مادیت پر ایک کتاب لکھی ہے، پہلا حصّہ ابھی شائع ہوا۔ حال ہی میں مارکسزم کے مطالعہ کے لئے حوالہ جات کی ایک کتاب بھی شائع کی ہے۔

بارش تیز ہو رہی تھی، میں چانسری لین میں اُن سے مل کر نکلا تو فلیٹ اسٹریٹ پر آ گیا اور خیال ہوا کہ ڈاکٹر جانسن کا مکان دیکھ لوں۔ ایک گھنٹہ وہاں صرف کیا۔ یہ آخری مکان ہے جس میں ڈاکٹر جانسن رہتے تھے اور جس میں اُن کے وہ دوست جو لندن کی جان تھے اکٹھا ہوتے تھے۔ بہت سی کتابیں، خطوط، میزیں، کرسیاں، تصاویر سب نمائش کے لئے موجود ہیں۔ مکان بھی اُسی حالت میں محفوظ ہے۔ میکس بیربام نے ایک تمثیلی مکالمہ باسول اور جانسن کے درمیان اس موضوع پر کرا دیا ہے کہ اِس طرح جانسن کے مکان کا قومی ملکیت قرار دیا جانا کہاں تک ٹھیک ہے۔ باسول کے پوچھنے پر جانسن اس سے اختلاف ظاہر کرتے ہیں

اور بیس پچیس سطروں کا ایک دلچسپ مکالمہ وجود میں آتا ہے۔ دیوار سے وہ بھی آویزاں ہے۔

آج ہندوستانی مجلس کی طرف سے ٹیگور جینتی کا جلسہ تھا میں بھی گیا اور ٹیگور سنگیت سے لطف اندوز ہوا۔ پروگرام اس سے بہتر ترتیب دیا جا سکتا تھا جیسا پیش کیا گیا۔ جس طرح ٹیگور کے نغمے بنگال کی زندگی کا جزو بن گئے ہیں اُسے دیکھ کر ٹیگور کی تہذیبی اہمیت اور عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ اُردو ہندی میں ہم کس کا نام لے سکتے ہیں! یہ مسئلہ غور طلب ہے یا نہیں؟ شعر و ادب، نغمہ و رنگ کے عام تہذیبی زندگی میں داخل ہونے اور اُس کا جزو بن جانے کی منزل کب اور کس طرح آتی ہے؟

۱۸ مئی دوشنبہ۔ کل کا دن باتوں اور خطوں کے جواب میں گذر گیا۔ صوبۂ سرحد کے ایک نوجوان فاروق صاحب، جو یہاں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ستھرا ادبی ذوق رکھتے ہیں، آ گئے، وقار مع بیگم وقار کے آ گئے اور وقت گذر گیا

آج میں کوئین میری کالج کے صدر شعبۂ انگریزی پروفیسر جیک آئزکس سے مِلا۔ ایسے مواقع پر اکثر باتیں وہی ہوتی ہیں جو کئی بار ہو چکی ہیں۔ دیب صاحب بھی اُن سے ملے تھے اور میں نے دیکھا کہ پروفیسر آئزکس ان سے بہت متاثر تھے۔

۲۰ مئی بُدھ۔ کیا مجموعۂ اضداد ہوں بہ قولِ جوشؔ:-

گر جاتا ہوں ذرات کی ٹھوکر کھا کر — اور گاہ پہاڑوں سے گذر جاتا ہوں

کل سے پھر یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے کہ چلتے چلاتے پیرس بھی دیکھ لوں اور کبھی دِل چُپکے سے سوال کرتا ہے اگر نہ دیکھا تو کون سا نقصان ہو جائے گا؟ یہ نقصان

فائدے کی اُلجھن بہت بُری ہوتی ہے۔طالب علمی کے وہ دن یاد آگئے جب مضمون کا عنوان اِس طرح دیا جاتا تھا، دیہات کی زندگی کے فائدے اور نقصان، دولت کے فائدے اور نقصان پر مضمون لکھو۔ یہ انداز نظر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بہر حال پھر وہی آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے کی بات۔میں نے سوچا جی نہ چاہے گا تو نہ جاؤں گا کوئی زبردستی تو ہے نہیں لیکن احتیاطاً فرانس کا ویزا بنوالینا چاہیئے۔چنانچہ گھر سے نکلا تو ایک جگہ سے ہوائی جہاز سے پیرس جانے کا کرایہ وغیرہ دریافت کیا، فرانسیسی قونصل خانہ جاکر ویزا حاصل کیا دوپہر بعد برٹش کونسل جاکر آکسفرڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے متعلق کچھ مُلاقاتوں کا بندوبست کیا۔کل ہی فاروق صاحب نے میاں افتخارالدین (پاکستان) سے ملانے کے لئے چند آدمیوں کو کمبرلینڈ ہوٹل میں چائے پر بُلایا تھا۔ میاں صاحب کے نام اور کام سے تو میں بہت دنوں سے واقف تھا لیکن مُلاقات پہلی دفعہ ہوئی۔ پاکستان کی سیاسی اور ادبی زندگی کے متعلق کچھ ضروری باتیں ہوئیں اور امید ہے کہ ان کا سلسلہ جاری رہ سکے گا۔

آج مشہور تاریخی ٹاور آف لندن دیکھا۔تاریخ انگلستان کے وہ نقوش جو ذہن پر گہرے ہیں اُن میں اس عمارت کی بھی جگہ ہے۔ ہنری ہشتم، اُس کی بدقسمت بیوی، حسین جین گرے، ڈڈلے، سروالٹر ریلے، سب کے نام اُس سے وابستہ ہیں۔ٹمیس کے کنارے یہ قلعہ نُما عمارت پُراسرار معلوم ہوتی ہے۔ اُس مقام سے لے کر جہاں شہزادوں کے سر کٹے تھے اور غدّار قید کئے جاتے تھے، شاہی جواہرات رکھنے کے کمرے تک ہر چپّہ اپنی داستان رکھتا ہے۔ اسلحوں کا بہت بڑا ذخیرہ نارمن قلعہ کے اندر محفوظ ہے۔ سرکاری رہنما نے اپنی ہزارہا دفعہ کی

سنائی ہوئی کہانی، مزے لے لے کر سنائی اور بار بار قدیم دورِ جہالت کا مذاق اُڑایا۔ اُس کو کیا خبر کہ اب بھی قید خانوں کی تاریکی سے لوگ موت کی آغوش میں پہونچ جاتے ہیں اور ارباب اقتدار کی مخالفت وہ سزائیں تجویز کراتی ہے جس سے نامور ظالموں کی رُوحیں لرز جائیں۔ کون ماضی قریب کی خونیں داستانیں دُہرائے۔

شام کے وقت ایک انگریز اُردو داں مسٹر برن کے یہاں چائے تھی، کئی دن سے وعدہ تھا وہ غالب پر انگریزی میں مقالہ لکھنا چاہتے ہیں گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اُن کے لئے یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ میں نے مشورہ دیا ہے کہ تنقیدی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے محض سوانح حیات مرتب کریں اور محض ایک باب میں اُن کی شاعری پر عام تبصرہ کر دیں۔ انگریزی میں ایسی کتاب بھی دلچسپ ہو سکتی ہے۔

۲۴ مئی اتوار۔ جہاں تک گھومنے پھرنے، ہائڈ پارک میں وقت گذارنے، بہت کچھ جان لینے کے لئے چیزوں کے دیکھنے، چہروں کو پڑھنے اور دل ہی دل میں بڑی بڑی کہانیاں لکھ ڈالنے کا تعلق ہے، اُس کا سلسلہ تو جاری ہی رہتا ہے، گھر پر بھی جب چار آدمیوں کی مختصر سی انجمن بیٹھتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے کئے ہوئے فیصلے دُور دُور تک اثر انداز ہوں گے اور اگر کبھی کوئی آجاتا ہے تو اپنی اور آنے والے کی اُفتادِ طبع کے مطابق دلچسپ باتیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن اِدھر لکھنؤ نے پھر افسردہ کر دیا ہے۔ چھوٹا بچّہ جسے آٹھ دن کا چھوڑ کر آیا تھا سخت بیمار ہے۔ علاج اور تیمار داری مہیا ہیں لیکن طبیعت بہت پریشان ہے۔ کل مجھے آکسفرڈ جانا ہے۔

ہاں یہ کہنا بھول گیا، پرسوں ایک تھیٹر دیکھا تھا جس میں انگلستان کا سب سے

مشہور ایکٹر گل گڈ کام کرتا ہے۔ ڈرامہ تھا وِنیس پری زروڈ، اسٹیج کی بناوٹ اور سارے ڈرامے نے بہوت کر دیا۔

۲۵ مئی دوشنبہ۔ صبح لکھنؤ سے خط آگیا، بچّہ خطرے سے باہر ہے اور میں آکسفرڈ یونیورسٹی کی زیارت کے لئے چل نکلا۔ یہ زیارت ہی تو ہوگی، نہ لکچروں میں شرکت، نہ اُن تمام علماء سے ملنے کا انتظام جن سے ملنے کی خواہش ہے، نہ کتب خانے سے فائدہ اُٹھانے کی صورت۔ تین دن رہنا ہے، کیا کیا ہو سکے گا۔ اس مرحلۂ شوق کے لئے تو عمر درکار ہے۔ تقریباً دو گھنٹے میں لندن سے آکسفرڈ پہونچا۔ ایک مسٹر آچن ہیں، خط سے تعارف ہو چکا تھا، ہوٹل میں اسباب رکھ کر اُن کو تلاش کیا اور انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے تین گھنٹوں میں آکسفرڈ کے بہت سے کالجوں کی سیر کرادی۔ پانچ چھ سو سال سے یہاں سے علم کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ معلوم نہیں میری نگاہ حیرت دیکھ رہی تھی، یا تخئیل کی سحر کاری تھی کہ میں ان قدیم عمارتوں سے کارواں درکارواں علماء مشعلیں ہاتھ میں لئے زندگی کے گوشوں کو منوّر کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ان سیکڑوں سال کی عمارتوں کو دیکھ کر یہاں کی علمی روایات اور قدامت پسندی کی طرف بھی ذہن جاتا ہے اور دونوں کا تعلق کسی حد تک سمجھ میں آنے لگتا ہے۔

شام کو طول و عرض میں آکسفرڈ کے پورے قصبے کا چکّر لگا لیا، چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے جس کی ساری رونق اور شہرت یونیورسٹی کی رہینِ منّت ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ شہر کے باہر صنعتی کارخانے بڑی تعداد میں کھل گئے ہیں۔ تنہائی اور تنہائی کا احساس ہو تو میں کتنا چلتا ہوں، اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوتا ہے

جب میں مجبوراً اپنے مستقر پر واپس آتا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت تھک گیا ہوں - ایک پھیکی، بے جان اور نا آسودہ بنائے رکھنے والی تھکن ——

۲۶ مئی منگل - صبح کو برٹش کونسل کے آفس میں گیا تو معلوم ہوا کہ آج کسی سے ملنے کا پروگرام نہیں ہے، کل کا دن اس کے لئے ہوگا - میں نے ذرا سا وقت بھی ضائع نہیں کیا، وہاں سے نکل کر اشمولین میوزیم میں ایک نمائش دیکھی اور شیکسپیر کا گھر دیکھنے کے لئے اسٹریٹفورڈ اپان ایون کے لئے روانہ ہو گیا - یہ ادبی زیارت گاہ آکسفرڈ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے - بس سے جانے والا بڑے خوبصورت دیہاتوں، فارموں اور جنگلوں کے درمیان سے گذرتا ہے - میں شیکسپیر کی جنم بھوم میں پہونچا تو خوشی اور حیرت کے ملے جلے احساس سے میرا دل دھڑک رہا تھا - قصبہ کا ایک حصّہ پار کرنے کے بعد چھوٹی سی ندی ہے، اُس کے پُل پر سے گذرتے ہی ایک پارک میں شیکسپیر کا مجسمہ نظر آتا ہے جس کے چاروں کونوں پر فلسفہ، تاریخ، المیہ اور مزاح کے نام سے ہیملٹ، پرنس ہال، لیڈی میکتھ اور فالسٹاف کے خیالی مجسّمے بنے ہوئے ہیں - وقت کم تھا، میں نے کھانا بھی نہیں کھایا اور بس سے اُتر کر سب سے پہلے اس پارک میں آیا، لکڑی کا پُل پار کر کے اُس تھیٹر میں گیا جو شیکسپیر کی یادگار کے طور پر بنایا گیا ہے، اس وقت انگلستان کے مشہور شیکسپیر ایکٹر بیچ ایش کرافٹ کی نگرانی میں ڈرامے ہو رہے ہیں اور جشن تاجپوشی کی وجہ سے وہ سرگرمی ہے کہ باوجود کوشش کے تھیٹر کے لئے ٹکٹ نہ پا سکا - لندن میں بھی اس کی کوشش کر چکا تھا - زیادہ تر ٹکٹ پہلے سے بِک چکے ہیں - یہ عمارت نئی وضع کی ہے، حالانکہ اس کا سلسلہ

اٹھارویں صدی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ وہاں سے نکل کر میں نے شیکسپیر کے گھر کا رُخ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ دل یہی دیکھنے کے لئے دھڑک رہا تھا۔ یہ شیکسپیر کا گھر ہے اور حتی الامکان اپنی اصل حالت میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں بہت سے نوادر محفوظ ہیں، لکڑی کی میزیں اور کرسیاں، بنچ، صندوقچے، آتشدان سے متعلق لوہے اور دوسری دھاتوں کے برتن وغیرہ، بہت سی دستاویزات، اُس مکان کی تاریخ، شیکسپیر کے چند قدیم نسخے، کچھ پُرانی تصویریں، اور مُہریں وغیرہ۔ چھوٹے چھوٹے کمروں، نیچے نیچے دروں کا یہ چھوٹا سا مکان جس نے دُنیا کے سب سے بڑے تمثیل نگار کو اپنی آغوش میں لیا، یہی اُس کی عظمت ہے۔ ساڑھے تین سَو سال سے یہ مکان بڑے بڑے انقلابات دیکھ رہا ہے۔ آنے جانے والوں کے قدموں کی آہٹ سنتا ہے لیکن اس کا وہ ساکن آسودۂ خواب ہے جو نبض کی ہر جنبش اور دل کی ہر دھڑکن، ماتھے کی ہر شکن اور چہرے کی ہر لکیر کا رازداں تھا۔ اس مکان کا طواف کرنے ہی کتنے ہملیٹ آتے ہوں گے اور کتنے آتھیلو، شاہزادے، بادشاہ اور فاتح نہ سہی، وہ انسان جن کے جذبات کا تلاطم اور جن کے سینے کی کشمکش کسی عظیم الشان ڈرامے کا موضوع بن سکتی ہے۔ تھوڑی دیر اس مکان میں ٹھہر کر فخر کا احساس ہوا اور عالم خیال میں بہت سے محشر بپا ہوئے۔ کاش یہ لفظوں میں ڈھل سکتے!

شام ہونے کو آئی اور آکسفرڈ کی واپسی ضروری نظر آئی، پھر بھی دو ایک اور جگہیں جو کسی نہ کسی طرح شیکسپیر کے نام سے منسوب ہیں دیکھ لیں۔ شیکسپیر کی تاریخ پیدائش یعنی ۲۱ اپریل کو یہاں ایک اہم جلسہ ہوتا ہے، تھیٹر کا سلسلہ

شروع کیا جاتا ہے، لکچروں کا انتظام ہوتا ہے اور ایک قومی یادگار کے طور پر شیکسپیر دوست جمع ہو کر اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ہر سال اُس جماعت کی طرف سے کچھ نہ کچھ ہنگامہ ہوتا ہے جو اب بھی یہی کہتی ہے کہ شیکسپیر کے ڈراموں کا مُصنف شیکسپیر نہیں بلکہ بیکن تھا۔ اس سال اس جماعت نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا، کالی جھنڈیوں کا جلوس نہیں نکالا بلکہ محض ایک تار بھیجا جس کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا کے سب سے بڑے ادبی فریب کی یادگار منانا نامبارک ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک علمی جھگڑا تھا اور ختم ہو گیا لیکن یہاں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ میں نے امریکہ میں بھی ایک کتاب دیکھی تھی جس میں ازسرِ نو یہ بحث چھیڑی گئی ہے۔

۲۷ مئی بُدھ ۔ آج آکسفرڈ سے لندن واپس آگیا لیکن آکسفرڈ میں میں نے ایک ایک لمحہ قیمتی دفت کی طرح گذارا۔ صبح چائے پی کر نکلا تو سب سے پہلے انڈیا انسٹی ٹیوٹ کا میوزیم اور کتب خانہ دیکھا۔ بہت اہم تو نہیں لیکن کچھ نوادر یہاں بھی ہیں قلمی کتابیں یہاں نہیں ہیں لیکن چھپی ہوئی کتابوں میں بعض نایاب چیزیں موجود ہیں جن کے نسخے غالباً ہندوستان میں نہ ملیں۔ ساڑھے دس بجے بوڈلین لائبریری میں انگریزی کے پروفیسر ڈیوس سے ملا۔ ساڑھے گیارہ بجے برٹش کونسل کے مسٹر ہاروی سے، جن کے ساتھ لنچ بھی کھانا تھا اور جن کے توسط سے پروفیسر ہیٹ سن سے ملنا تھا۔ لنچ سے پہلے اور لنچ پر انگلستان اور امریکہ کی ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوتا رہا۔ انگلستان کے نقادوں میں جو علمی اختلافات ہیں کچھ ان کا بھی اندازہ ہوا۔ پروفیسر سی ڈے لیوس جن سے ملنے کی بہت خواہش تھی، بیمار نکلے اور اُنھوں نے ملاقات سے معذرت اور سلام کہلا بھیجا۔ اس طرح

تین بج گئے۔ لائبریری کے ایک افسر کے ساتھ میں نے آکسفرڈ کی مایۂ ناز بوڈلین لائبریری دیکھی۔ دیکھنے کا لفظ محض دیکھنے ہی کے معنی میں استعمال کر رہا ہوں، یعنی عمارت دیکھی، کتابوں کی الماریاں دیکھیں، بعض کتابوں کو چھوا، بعض پر نگاہِ حسرت ڈالی، بعض تصاویر پر حیرت طاری ہوئی اور عہد جہانگیری کے دو البموں نے دِل چھین لیا —— اسے دیکھنا نہیں کہہ سکتے۔ یہ عظیم الشان کُتب خانہ ساڑھے تین سو سال سے بڑھتا جا رہا ہے، تحائف، وصایا، سرکاری قوانین، تبادلہ اور خریداری کے ذریعہ اِس میں اضافہ ہو رہا ہے گو صرف بیس لاکھ کتابیں ہیں لیکن ایسی نادر اور اہم کہ مشکل سے کوئی کُتب خانہ اُس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مختلف زبانوں کے اسّی ہزار قلمی نسخے بھی اس میں محفوظ ہیں۔ اس لائبریری کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں سے کتاب باہر نہیں لے جائی جا سکتی۔

چھ بجے مَیں برٹش کونسل کے دفتر پہونچا کیونکہ کیمبرج کے پروگرام کی اطلاع وہیں آنے والی تھی۔ گاڑی میں چند منٹ باقی تھے کہ کونسل کے ایک خلیق افسر نے اپنی کار میں اسٹیشن پہونچا دیا۔ لندن پہونچتے ہی لکھنؤ کا خط مل گیا، بچّہ بہتر ہے۔

۲۸ مئی جمعرات - آخر تسکین حیرت کے جذبات بھی تو کچھ مطالبات رکھتے ہیں۔ جشن تاجپوشی لندن کی تاریخ میں سب سے اہم واقعہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ شاید یہ آخری جشن ہو، اسی وجہ سے سب سے بڑا بھی ہے۔ جشن سے ایک دن پہلے لندن کے اندر مختلف راستوں سے چالیس ہزار بسیں داخل ہوں گی۔ اس سے اس ہنگامہ آرائی کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ تاجپوشی کے متعلق اپنے تاثرات پھر

لکھوں گا لیکن آج جو بات میں نے محسوس کی، وہ تو لکھ ہی دوں۔ مجھے دو بجے دن کی گاڑی سے کیمبرج جانا تھا میں گیارہ ہی بجے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور عمداً وہ بس لی جس سے شہر کا زیادہ حصہ دیکھ سکوں اس بس نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں لیور پول اسٹریٹ اسٹیشن پر پہونچایا اور اکثر ایسے راستوں سے گذری جن سے کارونیشن کا جلوس گذرنے والا تھا — سڑکوں پر اتنی بھیڑ ہے کہ گذر مشکل ہے۔ باہر سے آئے ہوئے لوگ اجنبیت سے اور لندن کے لوگ غرور سے سڑکوں، دوکانوں اور مکانوں کی آرائش کو دیکھ رہے ہیں۔ اِس آرائش میں حسُن اور تناسب کم، رنگینی اور متوجہ کر لینے والی کیفیت زیادہ ہے، بہت زیادہ ہے اس لئے کوئی نظر انداز بھی نہیں کر سکتا — شام کے وقت کیمبرج پہونچ گیا ایک خاتون کے گھر ٹھہرنا طے ہوا تھا اسباب قیام گاہ پر رکھ کر شہر اور یونیورسٹی کا جائزہ لینے نکلا۔ تاریخ، علم و ادب میں کیمبرج کی بھی اسی طرح جگہ ہے جس طرح آکسفورڈ کی، اور دنیا کے ہر گوشہ سے طلباء کا ہجوم اور علماء کی علم پروری اس کا ثبوت ہیں۔ چھوٹا سا قصبہ ہے، میں نے دیکھ ڈالا، چھوٹی سی ندی بل کھاتی ہوئی کئی جگہ ملتی ہے، کالجوں کی بعض عمارتیں آکسفورڈ کے مقابلہ میں شاندار معلوم ہوتی ہیں، خاص کر کنگس کالج کے قریب کا وہ گرجا گھر جس کا ذکر ورڈسورتھ نے اپنی نظم میں کیا ہے۔

۳۰ مئی سنیچر — لندن میں ہوں، مگر اس لندن اور اُس" لندن میں فرق ہے جسے میں نے پہلے پہل دیکھا تھا۔ اب میں اِس سے مانوس ہوں، اِس کی چہل پہل کا وہ عالم ہے کہ لوگ بدمستی کے عالم میں چلتے اور نشہ میں جھومتے نظر آتے ہیں اپنے اوپر مسافرت کی کیفیت طاری رکھنا چاہتا ہوں لیکن کسی طرح جی لگ گیا ہے۔

کل کیمبرج میں پروفیسر رُوبن لیوی، پروفیسر آربری اور بعض دوسرے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ لیوی سے مختصر لیکن آربری سے مشرقی علوم اور ان کے مطالعہ کے متعلق تفصیل سے باتیں ہوئیں۔ شام کے وقت برٹش کونسل کی کیمبرج کی شاخ نے مجھ سے ملانے کے لئے چند ہندوستانی پاکستانی حضرات کو بلایا تھا، شام کا کچھ حصّہ دلچسپیوں میں کٹا۔ ہندی کے الہ آبادی شاعر بچن جی، دہلی یونیورسٹی کے مسٹر مدن گوپال بھلا، ایک جرمن پروفیسر اور برٹش کانسل کے ایریا آفسر ڈاکٹر کنگ سے انگریزی ادب کے متعلق دلچسپ گفتگو رہی۔ رات کو میں نے تنہائی سے بچنے کے لئے سینما دیکھ ڈالا اگرچہ آنکھوں میں تکلیف تھی۔

آج صبح پروفیسر حمیداللہ خاں (گورنمنٹ کالج لاہور) آگئے۔ اُن سے دیر تک اُردو اور انگریزی ادب کے متعلق، پنجاب کی ادبی اور سیاسی زندگی کے متعلق باتیں ہوئیں۔ وہ ورڈ سورتھ پر کام کر رہے ہیں اور اُس کے بعض اخلاقی اور فلسفیانہ تصوّرات کا تقابل مشرقی ادیبوں خاص کر فارسی شعرا سے کر رہے ہیں۔ کام دلچسپ ہے دوپہر کا کھانا برٹش کانسل کی طرف سے تھا۔ استاد محترم پروفیسر دیپ بھی آگئے تھے، پروفیسر ڈیشتر اور پروفیسر ہَیف سے ملاقات ہوئی اور دو گھنٹہ تنقید ادب کے بارے میں بے ربط سی باتیں ہوتی رہیں یہ باتیں زیادہ تر بے ربط اور ادھوری ہی ہوتی ہیں، پھر بھی مفید ہیں۔ پروفیسر دیپ کے ساتھ کیمبرج کا مشہور میوزیم فِٹز ولیم دیکھا اور میوزیم سے زیادہ دیب صاحب کی معلومات نے لُطف دیا۔ اُنھیں سترہ سال سے جانتا ہوں لیکن کل یورپ کی مصوری، ظروف سازی، یہاں کے عجائب خانوں کے نوادِر کے متعلق اُن کے

قاموسی تبحّر نے متحیّر کر دیا — میں سترہ اٹھارہ سال پیچھے واپس چلا گیا اور اُنھیں اُسی طرح باتیں کرتے اور تصویروں پر رائے دیتے سُنتا رہا جیسا طالب علمی کے زمانے میں۔

شام کو مسٹر بھلّا اور مسٹر شیو کمار کے ساتھ چائے پی۔ دونوں انگریزی ادب کے اچھے طالب علم ہیں ادب اور نفسیات، تجزیہ نفس اور اصول تنقید، اُردو ادب کی کوتاہیوں کی باتیں ہوئیں — شام کو واپسی میں لندن تک دیب صاحب کا ساتھ رہا۔ مفید اور دلچسپ باتوں میں وقت کٹ گیا۔

یکم جون دوشنبہ — کل دن بھر پڑا رہا۔ آنکھ میں سخت تکلیف تھی۔ یوں بھی کبھی کبھی پڑے رہنے ہی کو جی چاہتا ہے۔ پڑے رہنے اور سوچنے کو۔ لیکن زیادہ سوچنا بھی کتنا خطرناک ہوتا ہے!

آج بھی دن یونہی گذر جاتا لیکن کرشنا اور ربّن نے اُکسایا کہ "کارونیشن رُوٹ" دیکھ لیں چنانچہ ایک لامتناہی، عقیدتمند، تماشا پسند اور بے قرار ہجوم کے اندر ہم نے بھی خود کو ڈال دیا اور انتظامات کا کچھ حصہ دیکھ ڈالا۔ جو اِسے نہیں دیکھ رہا ہے وہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ ہنگامہ کیسا ہے!

۲ر جون منگل — امریکہ اور انگلستان میں بہت سے لوگوں نے مبارک باد دی تھی اور اُن آنکھوں پر رشک کیا تھا جو کارونیشن کی بہار دیکھیں گی کِس کِس سے کہتا کہ یہ آنکھیں جس جشن بہاراں کی منتظر ہیں وہ کچھ اور ہی ہے! اتنے شوخ رنگ نہ ہوں، دولت کا اتنا مظاہرہ نہ ہو، یہ ضبط اور نظم نہ ہو، یہ غیر ملکی تماشائیوں کا ہجوم نہ ہو لیکن اس جشن میں مستقبل کے یقین سے دھڑکتے ہوئے دِلوں کی موسیقی اور عام انسانوں کے احساس مسرّت کی سُرخی اور رنگینی شامل ہو گی! اُس کل کا رواں سفر میں ہے

اور کئی جگہ ڈیرے ڈال چکا ہے، کئی جگہ اُس کے پڑاؤ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کارواں ہر مُلک سے گذرے گا، اُس وقت جشن ہوگا، اُس وقت بہار آئے گی، اُس وقت میں بھی خوش ہوں گا!

پڑوس میں ایک صاحب کے یہاں ٹیلی ویژن ہے ہم لوگوں نے کچھ حصہ وہیں سے دیکھا۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ ایک مِٹتے ہوئے نظام کی حرکتِ مذبوحی ہے اور اس وقت جب تعمیری کاموں پہ قومی دولت صرف کرنے کی ضرورت ہے محض ملکہ کی تاجپوشی اور شاہی وقار کی نمائش پہ بے دریغ روپیہ خرچ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن ایک لحاظ سے دوسری جگہوں کی دولت سمٹ کر لندن کی بازاروں میں اسی بہانے سے آ بھی رہی ہے اور جشنِ تاجپوشی ایک تجارتی سودا بھی بن گیا ہے۔ دوکانیں صرف اس لئے نہیں سجائی گئی ہیں کہ ملکہ کا جلوس گذرے گا بلکہ اس لئے بھی کہ گاہک آئیں گے میرا خیال ہے کہ جب تک خود شاہی نظام ختم نہیں ہوتا محض کارونیشن سے بیزاری کا اظہار کوئی معنی نہیں رکھتا، یہ تو اسی کا سایہ ہے لیکن بہت سے لوگ جذباتی انداز میں محض تاجپوشی کی چہل پہل ہی سے متنفر معلوم ہوتے ہیں۔ زیادہ تر مکانوں پہ ملکہ کی تصویریں، یونین جیک اور دوسرے نشانات آویزاں ہیں۔ کیا یہ تمام لوگ ملکہ سے محبت اور وفاداری کا ثبوت دے رہے ہیں؟ میرا تو خیال ہے کہ بہت سے لوگوں نے محض رسماً ایک قومی تیوہار کی طرح اسے ایک خوشی اور دلچسپی کا دن قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو تین تین دن سے بارش اور سردی میں سڑکوں کے کنارے پڑے ہوئے جلوس کے گذرنے اور اُس کی ایک جھلک

دیکھ لینے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہزار ہا کتابیں، رسالے، کتابچے اس کے متعلق شائع ہوئے ہیں، تصاویر کی انتہا نہیں ہے۔ اخباروں میں جشن تاجپوشی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ تفصیلات ہیں جو مضحکہ خیز حد تک سطحی اور اوچھی ہیں لیکن لوگ انھیں کو پڑھ پڑھ کر آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں ۔۔۔ آخر اسے کیا کہتے ہیں؟ پیرس کے ایک گاؤں میں بیٹھ کر سابق ایڈورڈ ہشتم نے بھی ٹیلی ویژن پر سارا سماں دیکھا اور اپنی محبوب ڈچز کے پہلو میں بیٹھ کر آنسو بہائے۔ اس سے پہلے انھوں نے جشن تاجپوشی کے متعلق ایک معنی خیز مضمون میں یہ جملہ بھی لکھا "دل کی محض ایک دھڑکن نے مجھے تخت و تاج سے دور کر دیا"۔

ٹیلی ویژن پر دیکھنے سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ نہ صرف جلوس اور اس کے لوازم دیکھنے میں آئے بلکہ ویسٹ منسٹر ابے کے اندر جو تاریخی رسمیں ادا ہوئیں وہ بھی دیکھ لیں۔ میرے دل میں صدیوں کے ان فرسودہ مراسم کے لئے کوئی جگہ تو نہ نکل سکی لیکن ان کی تاریخی حیثیت اور شان و شکوہ نے ضرور متاثر کیا۔

۴ر جون جمعرات ۔ دو دن ہو گئے ہیں لیکن شاہراہوں، دوکانوں، گلیوں، بسوں، ٹرینوں اور تفریح گاہوں میں وہ ہجوم ہے کہ راستہ چلنا مشکل ہے۔ اب بھی قصر بکنگھم کے دروازے پر پچاس ہزار سے زیادہ آدمی ہر وقت موجود رہتے ہیں کہ ملکہ کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ یہ کس قسم کی عقیدت ہے، کس قسم کا جنون شوق ہے؟ یہی نہیں، ملایا میں لڑنے والے ایک انگریزی سپاہی نے اپنی ماں کو خط لکھا ہے کہ ملکہ ہماری محبوبہ بن گئی ہے۔ اور سینما کی حسین ایکٹرسوں کی جگہ ہر سپاہی نے ملکہ کی تصویر اپنے بستر کے قریب لگا رکھی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اتنا شاندار جشن تاجپوشی کبھی نہیں ہوا، اتنے آدمی کبھی باہر سے نہیں آئے۔ غالباً یہ ساری باتیں ٹھیک ہیں۔ میں غور کرتا ہوں تو بعض باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ زوال پذیر انگلستان کے لوگ کسی طرح اپنی خوش خیالی میں اس الزبتھ کے عہد حکومت کو اُس الزبتھ اوّل کے دَور کی طرح خوش حال دیکھنے کے متمنّی ہیں جس کے زمانہ میں انگلستان انگلستان بنا۔ یہ خیال ایک موہوم خواہش بن کر بہت سے دلوں میں جاگزیں ہے۔ کچھ لوگ ملکہ کے حُسن سے بھی متاثر ہیں، کچھ اُس کے کم عُمر ہونے اور عورت ہونے سے۔ بعض بڑی بوڑھیاں یہ بھی سوچتی ہیں کہ اس کم سِنی میں اُس کے کندھوں پر اتنی بڑی حکومت کا بوجھ رکھا جا رہا ہے۔ بہر حال بہت سی باتیں مل گئی ہیں اور یہ جشن انگلستان کی تاریخ میں یادگار بن گیا ہے۔

ایک طرف یہ ہے دوسری طرف امریکہ میں جیل کی تاریکی سے روشنی باہر آ رہی ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت دلیرانہ موت کا انتظار اس یقین کے ساتھ کر رہے ہیں کہ وہ بے گناہ ہیں اور اُن کا خون رنگ لائے گا۔ روزن برگ نے سرکاری وکیل کی اس پُر فریب پیش کش کو ٹھکرا دیا کہ اگر وہ حکومت سے تعاون کرے تو موت سے بچ سکتا ہے یا اگر وہ روس چلا جائے تو اُس کی جان بخشی ہو سکتی ہے۔ روزن برگ نے جواب میں کہا کہ وہ امریکی ہے، یہی اُس کا وطن ہے، وہ کہیں اور کیوں جائے!

۵ر جون جمعہ — آخر اپنے آپ سے لڑتا جھگڑتا، بحث کرتا فرانس جانے کے لئے تیار ہو گیا، صرف چار دن کے لئے۔ جانتا ہوں کہ چار دن میں نہ پیرس کو دیکھ سکتا ہوں نہ سمجھ سکتا ہوں، مگر جانا ضروری سا ہو گیا۔ آنے جانے کا ٹکٹ خرید لیا، ادھیکاری کو

قیام کے لئے تار دے دیا۔ دیکھوں کیا کیا دیکھ سکتا ہوں۔

شام کو فیروز جبیں اور قرۃ العین آگئیں اور وقت دلچسپ گذرا۔ بہت سی غیر مربوط باتوں کے ساتھ ساتھ تھوڑی دیر کے لئے فطرت انسانی کے خالص انفرادی پہلوؤں اور اُن کے اظہار میں تخلیقی فن کار کی ذمہ داریوں پر بھی بحث رہی۔ سوال یہ ہے کیا کوئی سماجی نظام مکمل طور پر ہر فرد کے خیالات، تصورات اور اعمال پر منطبق ہوسکتا ہے؟ غالباً نہیں، پھر ایسی حالت میں فن کار کو ان انفرادی پہلوؤں کو کس طرح پیش کرنا چاہیئے کہ دوسرے بھی ان تجربات میں شریک ہوسکیں۔

۶/جون سنیچر - کل دن کا بڑا حصہ انڈیا آفس لائبریری میں گذرا، کوئی مخصوص کتاب پیش نظر نہیں تھی، اس لئے اُلٹی سیدھی کتابیں دیکھتا رہا۔ چند مخطوطے بھی دیکھے۔ اس وقت لائبریری کی طرف سے ہندی مخطوطات کا کیٹیلاگ شائع کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں جسے مسٹر ماسٹرس اور مسٹر نیپیر نے مرتب کیا ہے، اُن لوگوں سے اس کی ترتیب وغیرہ کے متعلق دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اسی لائبریری میں پہلی دفعہ ہندی انسائیکلو پیڈیا دیکھی جو کلکتہ سے ۱۹۲۷ء میں اٹھائیس جلدوں میں شائع ہوئی تھی میں نے کبھی کسی سے اس کا ذکر نہیں سُنا تھا۔

گھومتے پھرتے چھ بج گئے، چھ بجے پروفیسر دیب سے اُن کے ہوٹل میں ملنے کا وعدہ تھا وہاں پہونچا تو معلوم ہوا کہ وہ سات بجے واپس ہوں گے، میں نے اور آلِ حسن نے ایک گھنٹہ ایک نمائش میں گذارا جہاں لندن میں ذرائع حمل و نقل کی تدریجی ترقی سے متعلق بہت سا سامان اکٹھا کیا گیا تھا۔ جب دیب صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ اُنھیں اپنی قیام گاہ بِلول کورٹ

لانے کا ارادہ ترک کرنا پڑا، وعدہ کیا ہے پھر کسی دن آئیں گے ۔

۷ رجون اتوار ۔ سارا دن گھر ہی میں گذارا، شام کو وقار کے یہاں کھانا تھا وہاں پہونچے، کھانا بہت اچھا، لوگ بہت اچھے، تھوڑی دیر کے لئے بالکل گھر کی فضا پیدا ہوگئی۔ گفتگو تو ایسے موقع پر ہوتی ہی ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ آج کل یہ گفتگو عام طور سے ہندی اردو کے جھگڑے اور اردو کے مستقبل سے وابستہ ہو جاتی ہے، فطری طور لوگ میری رائے چاہتے ہیں - بہت کچھ گھما پھرا کر بات کرنے کے بعد بھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرے پاس کوئی بالکل قطعی جواب نہیں ہے کہ اس گتھی کو کس طرح حل کرنا چاہئے - یہ کھلا ہوا اعتراف عجز ہے - مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذباتی اور علمی اندازِ نظر میں کوئی بڑی خلیج حائل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال کی نزاکت سے زیادہ میری کم علمی اور جہالت کا نتیجہ ہے ۔

۸ رجون دوشنبہ ۔ (۲ بجے دن) ایر فرانس کا چار انجنوں والا جہاز برٹش چینل کے اوپر پرواز کر رہا ہے، سبھی مسافر لندن سے پیرس جا رہے ہیں مجھے وہ لطف نہیں آرہا ہے جو بمبئی سے نیویارک جاتے ہوئے حاصل ہوا تھا۔ تنہائی ہے اور تنہائی کا احساس —— جب تک جہاز لندن کے اوپر تھا نیچے کچھ دکھائی دیتا تھا اب کچھ بھی نہیں، بھورے بادلوں کے سوا کچھ نہیں - ابھی لنچ بھی ملا ہے، بہت سا ہے لیکن میں نے بہت تھوڑا سا کھایا۔ مختصر سا سفر ہے، دیکھئے پیرس میں کیسی گذرتی ہے! طبیعت سست معلوم ہوتی ہے ۔

(رات)

ساڑھے چار بجے پیرس پہونچ گیا لیسٹن کوارٹرس میں ایک ہوٹل میں مقیم ہوں۔

اُسی میں لکھنؤ یونیورسٹی کے مسٹر ادھیکاری بھی ہیں اس لئے اطمینان ہے ورنہ پیرس کی سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ فرانسیسی نہ آتی ہو تو انسان احمق معلوم ہوتا ہے، پھر یہ بھی نہیں کہ آپ کتابوں سے دیکھ کر فرانسیسی بول لیں، تلفظ اور عام بول چال میں منجھا ہوا تلفظ نہ ہو تو نہ ہوٹل والا آپ کی بات سمجھتا ہے نہ ٹیکسی والا۔ تقریباً سارے اشارات بھی فرانسیسی ہی میں ہوتے ہیں۔ میں ہوٹل پہونچ گیا، ادھیکاری اسٹیشن پر مجھے تلاش کر کے واپس آئے میں شائد کسی اور دروازے سے نکل آیا۔ آدھ گھنٹہ باتیں کر کے پیرس دیکھنے نکلے اور تقریباً تین گھنٹے میں یونیورسٹی کا سارا علاقہ دیکھ ڈالا، بعض عمارتیں بھی دیکھ لیں جو راستہ میں پڑتی گئیں، لندن، امریکہ اور ہندوستان کی باتیں ہوتی رہیں۔ شام کو جو کچھ دیکھا، اُسی نے پیرس کی وہ خصوصیات واضح کر دیں جن سے معمولی واقفیت تھی۔ آج جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ پیرس کی شام تھی اور لکسمبرگ کا باغ۔ ایسا خوبصورت چمن میں نے ابھی تک کہیں نہیں دیکھا اور فرانس میں اس سے بھی خوبصورت باغ موجود ہیں۔ قطار اندر قطار گھنے اونچے درختوں اور پھولوں کے تختوں، فوّاروں اور مجسّموں کی یہ تفریح گاہ پیرس کی حُسن دوستی اور جمالیاتی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ اہم عمارتوں میں یونیورسٹی، پیلیس آف جسٹس اور اکیڈمی فرانس دیکھیں۔

۹ر جون منگل — صبح ۹ بجے نکلا۔ ادھیکاری نے لوور کے مشہور عالم میوزیم تک پہونچا دیا۔ تجربہ کے لئے آج یہاں کی مٹرو (یعنی زمین کے اندر چلنے والی ٹرین) بھی دیکھ لی۔ اب تک جو کچھ دیکھا ہے اُس سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ ٹرین امریکہ کی ٹرینوں سے بھی خراب ہے۔ یہی حال بسوں کا ہے لوور جاتے ہوئے مختلف علاقوں سے

گذرنا ہوا۔ کل بھی اندازہ ہوا تھا کہ شہر کے بعض حصے گندے اور زبوں حال ہیں، ان سے فرانس کی اقتصادی حالت کا پتہ چلتا ہے لیکن عمارتوں کا تنوع، امریکہ اور انگلستان سے مختلف کیفے، سڑکوں کی جانب باہر نکلے ہوئے ریسٹراں اور میکدے، سب اس کا بدل قرار پا جاتے ہیں اور پھر سین کے کنارے چلتے ہوئے جب لوور کے قریب "نئے پل" سے گذرے تو دنیا ہی بدل گئی اور لوور کے احاطے میں داخل ہو کر تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں زمین کے کسی ایسے خطے پر ہوں جو کبھی میرے تصور میں نہیں آیا تھا۔ ایک پُرجلال عظیم الشان عمارت، جس کے متناسب پھیلے ہوئے بازو سامنے کے حسین اور بلند پھاٹک سے ہم آغوش ہونے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ اس دروازے کو یوں تو پورٹ داکیراسول کہتے ہیں لیکن عام لوگ اسے چھوٹے "آرک دا ترائف" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہاں یونانی اور رومن وضع کے خوبصورت مجسموں کی بہتات ہے۔ لوور میوزیم بند تھا اس لئے میں نے پوری توجہ اسی طرف مبذول کر دی، اس دروازے کے باہر توئلریز کا مشہور باغ ہے۔ کیسا حسین چمن ہے جس نے صدیوں کی بہاریں دیکھی ہیں اور انقلاب فرانس کے زمانے میں سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے! اس سے نکلتے ہی پلیس دالاکان کارہے جہاں میری اینٹوائنٹ، ہنری شانزدہم، دانتوں، رابس پیر کے سر قلم ہوئے۔ اب یہاں پر وہ ستون نصب ہے جسے "کلوپیٹرا کی سوئی" کہا جاتا ہے، اور جن کے نمونے نیویارک اور لندن میں بھی ہیں۔ آج یہ سرزمین پھر کسی انقلاب کی منتظر ہے کیونکہ فرانس کا بیڑا اب انقلاب کے بغیر پار نہیں ہو سکتا۔ آگے سایہ دار درختوں کی سب سے خوبصورت سڑک شانزلیزے ہے جس کا ذکر

سُنتے سُنتے اس کی ایک ذہنی تصویر بن گئی تھی۔ لیکن اُس پر چلنے سے پہلے بائیں جانب مُڑ کر میں نے پیتت پیلیس اور گرانڈ پیلیس کے عجائب خانے بھی دیکھے۔ گرانڈ پیلیس میں فرانسیسی مصوّری کی اتنی بڑی نمائش ہو رہی تھی کہ میں تھوڑا سا حصہ دیکھ کر باہر نکل پڑا۔ پاس ہی بوربنوں کا محل ہے جس میں اب، وہاں کی پارلیمنٹ کے جلسے ہوتے ہیں۔ وہاں نہیں گیا، صرف دُور سے اسے دیکھ لیا، مجھے تو شانزلیزے کے دورویہ درخت بُلا رہے ہیں لیکن وہاں پہونچ کر ہمیشہ کی طرح اُداس ہو گیا اِس جنّت میں تنہائی کا کیا لُطف ہے۔ جدِّ اوّل حضرت آدمؑ کا جی بھی تو اکیلے گھبرایا تھا! اگر ہر درخت کے سایہ میں اور ہر مجسّمہ کو گواہ بنا کر "کسی" سے باتیں کرنے کا موقع نہ ہو تو سفر لعنت بن جاتا ہے اور دماغ "خندہائے بیجا" کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ شانزلیزے میں پیدا ہونے والی بہار میں کہاں سے رنگ بھروں! سامنے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر "آرک دا ترانفت" نظر آرہا ہے اور میں نے طے کیا ہے کہ سارا راستہ پیدل ہی طے کروں گا، اس کے سوا چارہ بھی نہیں اور میں اپنی سیر کی خواہش سے انتقام بھی لینا چاہتا ہوں۔

بارہ بجے آرک دا ترانفت، وہاں سے فاش اوینیو، متعدد چھوٹے چھوٹے عجائب خانے، پیلے شیلات (جس میں کئی عجائب خانے اور مشہور تھیٹر ہیں) یونسکو کی عمارتیں دیکھتا ہوا ایفل ٹاور پہونچ گیا۔ یہ اونچا مینار نہ جانے کہاں کہاں سے دکھائی دیتا ہے۔ ہزارہا تصویریں دیکھی ہیں، بارہا اس کا ذکر پڑھا ہے لیکن اس کی بلندی، اس کی آہنیں عظمت، اس کے تعمیری کمال کا اندازہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ سین ندی پار کر کے جب اُس کے قریب پہونچو تو معلوم ہوتا ہے کہ ساری عمارتیں

اس کے سامنے بے حقیقت ہیں۔ وہاں سے نکل کر ملٹری اسکول اور پھر نپولین کا مزار — میرا ذہن بیس بائیس سال پیچھے چلا گیا جب یورپ کی تاریخ میں نپولین میرا ہیرو تھا۔ خیالوں نے بڑے پلٹے کھائے ہیں لیکن اُس کے ایک حیرت خیز شخصیت ہونے کا احساس مجھے اب بھی ہے اور یہ مقبرہ دیکھ کر اطمینان سا ہوا کہ فرانس نے اس کی عزت کی ہے۔ ماضی کی تاریخی شخصیتوں کے کردار کئی پہلوؤں سے زیر بحث آسکتے ہیں لیکن اس وقت میرا ذہن اس کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ اسی مقبرہ سے ملی ہوئی لوئی چہاردہم کے زمانے کی وہ عمارت ہے جو فوجی اسپتال کا کام دیتی تھی اب وہ فوجی عجائب خانہ ہے۔ نپولین کے عہد کے متعلق ایک نمائش ہو رہی تھی وہ بھی دیکھ لی — شام کے پانچ بج رہے تھے اور بس اور ٹیکسی کے معمولی وقفوں کو چھوڑ کر تقریباً سات گھنٹے چل کر تھک چکا تھا۔

کچھ رات گئے ادھیکاری کے ساتھ ذرا دیر کے لئے پھر نکلا اور اُس سڑک پر گیا جسے بولیوار دامان پرناس کہتے ہیں۔ یہاں کے کیفے میں بہت دنوں سے دانشور اور فن کار جمع ہوتے ہیں، یہیں اس وقت کے "وجودیت پسند" رات رات بھر بیٹھ کر شرابیں پیتے اور فلسفہ تراشتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ فرانس میں اس کا زوال ہو رہا ہے اور یہاں آکر معلوم ہوا کہ گذشتہ نومبر میں بہت سے وجودیت پسندوں نے خود اس فلسفہ کا جنازہ نکالا — خود سارتر کو اس سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی اور وہ امن کی تحریک میں عملی طور پر حصہ لے رہا ہے۔ یہاں کے کیفے فرانس کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا جز ہیں یہیں کیفے روتوندے بھی ہے جس میں لینن کبھی کبھی اپنا وقت گذارتا تھا۔

۱۰ ارجون بدھ - قابل دید مقامات کی فہرست دیکھی تو خیال ہوا کہ بہت ہاتھ پاؤں پھیلانا ٹھیک نہیں، جو دیکھا جا سکے دیکھ لینا چاہئے اور جو بچ رہے اُس کی حسرت لے کر واپس جانا چاہئے - چنانچہ آج سب سے پہلے باستیل پہونچا - یہ اُس قید خانہ کی یادگار ہے جسے جولائی ۱۷۸۹ء میں انقلابیوں نے توڑ ڈالا تھا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا تھا - اب اُس کا ایک پتھر بھی محفوظ نہیں ہے صرف ایک ستون اُس کی یادگار ہے جس کی تعمیر ۱۸۳۳ء میں ہوئی - وہاں سے ری پبلک کی یادگار دیکھنے چلا گیا - یہاں آزادی کی دیوی اور کچھ دوسرے مجسّمے ایک مختصر سے پارک میں کھڑے ہوئے ہیں - مجسمہ کے چاروں طرف دیواروں پر ۱۷۸۹ء سے لے کر ۱۸۸۰ء تک کے مختلف تاریخی واقعات تانبے اور پیتل کے مرقعوں میں نقش ہیں - پاس ہی سنٹرل اسکول کی شاندار عمارت اور کچھ دور ہٹ کر سینٹ مارٹن کا گرجا گھر ہے جو فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتا ہے - یہاں سے چلا تو اوپرا پہونچا جو غالباً دنیا میں سب سے مشہور موسیقی اور رقص کا مرکز ہے - یہ عمارت بے حد جاذب توجہ ہے - سب سے پہلے تو اُس کی وسعت ہی اثر انداز ہوتی ہے پھر اُس کا حُسن ——— اندر عمارت کے کچھ حصے دیکھ لئے اور حیرت کرتا ہوا آگے بڑھ گیا - بغیر کسی سے پوچھے، نقشوں کے سہارے غلط راہوں پر چلتا، بھٹکتا، رُکتا ہر طرف دیکھتا رہا - قریب ہی مشہور گرجا گھر مادلین ہے، اُس کا حُسنِ جمال دیکھا اور پیلےِ وِندوم پہونچا جو بہت بڑا تجارتی مرکز ہے ـ اس علاقہ سے پیرس کی دولت اور دوکانوں کی نفاست کا اندازہ ہوتا ہے - اِس درمیان میں کھانا کھا لیا تھا اب بس لوور کا شوق مہمیز کر رہا تھا - لیکن وندوم سے نکلا تو ایک اور عمارت نے قدم روک لئے - یہ تھا سینٹ روش کا

گرجا۔ بہت ہی عظیم الشان اور بہت ہی پُراسرار سا — وہاں سے پیلیس رائل آیا، جس کے ایک حصہ میں کامیڈی فرانس کا تھیٹر ہے اور جس پر مولیر اور کارنیل کے بسٹ کھُدے ہوئے ہیں۔ پیلیس رائل بڑی عمارت ہے لیکن کوئی خاص بات نہیں، اندر کھلی کھلی سی معلوم ہوتی ہے صرف ایک باغ اور پارک ہے۔ پاس ہی ژاں دارک کا سُنہرا مجسمہ ملا۔ جو پوری طرح اُس کے نفس کی شعلہ باری اور اُس کے شباب کی حرارت کا آئینہ دار ہے۔ اور اب لوور —

جانتا ہوں کہ اس میوزیم کے دیکھنے کے لئے وقت کے علاوہ اچھی معلومات اور صلاحیت کی بھی ضرورت ہے اور میرے پاس ہر چیز کی کمی ہے لیکن شائد کوئی میرے اِس ذوق تشنہ کام کی داد دے کہ میں نے تھکے ہوئے جسم اور بوجھل دماغ کے ساتھ ساتھ وہاں شام کردی اور گہری تنقیدی نظر سے نہ سہی وہ سب کچھ دیکھ لیا جس کے دیکھنے کی لوگ تمنا کرتے ہیں۔ لوور کی کہانی بڑی بڑی کتابوں میں بیان ہوئی ہے میں کیا لکھوں۔ نہ جانے کتنی تصویروں اور کتنے مجسموں نے دامن تھاما اور آنکھوں سے بینائی کے علاوہ آگہی بھی مانگی، کہیں ذوقِ جمال کے سہارے میں نے بھی لُطف لے لیا اور کہیں سے ایک بدذوق کی طرح گذر گیا اور اب جو بدذوقی کا ذکر آگیا ہے تو یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے بعض تصویریں مونالیزا سے زیادہ پسند آئیں۔

اندھیرا ہو رہا تھا لیکن میں نوتردام کو پھر سے دیکھنا چاہتا تھا۔ پرسوں اسے صرف باہر سے دیکھا تھا۔ وہاں پہونچنے سے پہلے دو مشہور تھیٹروں شاتلے اور سارا برنہارڈ کی بھی زیارت کرلی اور اب میں سین ندی کے جزیرے پر تھا۔

نوتردام سامنے سے گوتھک طرز تعمیر کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اندر اندھیرے میں چل کر انسان شہ نشین تک پہونچتا ہے۔ ان سارے گرجا گھروں میں ایک پُراسرار کیفیت پیدا کرنے کے لئے اندھیرا رکھا جاتا ہے، بڑی بڑی موم بتّیوں کی روشنی میں کہیں کوئی سُنہری تصویر، نقش یا مجسمہ جگمگا اُٹھتا ہے اور زائر دبے پاؤں چلتے ہوئے ہر گام پر نگاہوں کے سجدے کرتے اور سینوں پر صلیب بناتے نظر آتے ہیں۔ اِس کے اندر بہت سے تبرکات بھی ہیں جن کی تاریخ ڈیڑھ ہزار سال پیچھے تک جاتی ہے۔

یہ آج کی سَیر ہے، باغ و بہار کے درویشوں کی طرح رنگین نہیں۔ سات بجے ہوٹل پہونچا تو جی نہ لگا۔ لکسم برگ باغ میں چلا گیا۔ سارے سفر میں تنہائی اور اُداسی کا سایہ میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے۔ اِس نے کہیں بھی مجھے تنہا اور ازخود رفتہ نہیں چھوڑا۔ یہاں اس تنہائی کے احساس میں زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم کی بے بسی کا اضافہ ہو گیا ہے!

۱۱ جون جمعرات —— کل لندن واپس جانا ہے، آج جو کچھ دیکھ سکتا ہوں دیکھ لوں، اِس خیال سے صبح سویرے ہی پیرس کا مشہور گرجا سیکرے کور اور رماں مارت دیکھنے کی نیت سے نکلا۔ نقشوں نے مدد کی تو بسوں نے اُلجھن میں ڈالا لیکن اِس طرح یہاں کی قومی لائبریری، مولیر کا مجسمہ اور پیرس ایکسچینج بھی دیکھ لئے۔ لائبریری کی وسعت کا کیا ٹھکانا ہے مگر مجھے کیا، صرف اس سرے سے اُس سرے تک گذر گیا، جاہلوں کی طرح ——

گیارہ بجے سیکرے کور پہونچا۔ یہ نسبتاً ایک نیا گرجا گھر ہے، پہاڑی کے

اوپر بنا ہوا، خوبصورت، جیسے سفید پتھر میں سے تراش لیا گیا ہو۔ پہاڑی کے نیچے اُتر کر سامنے سے اس کا خاموش وجود ایک لباس جمیل پہن لیتا ہے۔ آج اس میں ایک خاص عبادت ہو رہی تھی اور ہزارہا زائر عبادت میں مصروف تھے۔ کمسن خوبصورت لڑکیاں اپنی ڈھیلی ڈھالی سفید عباؤں میں پریوں یا فرشتوں کی طرح پہلی دفعہ عبادت گاہ میں داخل ہو رہی تھیں۔ کچھ فخر سے بن بن کر، کچھ حیا سے سر جھکا کر، کچھ تقدس کے احساس سے رک رک کر چل رہی تھیں۔ جب ہزارہا عورتوں، مردوں، لڑکوں، لڑکیوں نے ایک ساتھ ایک مذہبی بھجن گایا تو ذرا دیر کے لئے زندگی مجسم نغمہ معلوم ہونے لگی۔ سیکرے کور کے پُر پیچ راستوں سے اُترتے ہوئے ماں مارت کا خوبصورت باغ ہے۔ جس کی راہوں میں نشہ اور کیفیت ہے۔ یہاں بوڑھے تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور جوان اپنی محبوباؤں کو پیار کرنے کے لئے، بچّے کھیلتے ہیں اور مسافر یونہی چاروں طرف دیکھتے ہیں یا شائد شجرہائے سایہ دار کو مسافر نوازی کا موقع دیتے ہیں۔ آگے پیرس کا مشہور خطّہ ماں مارت ہے جو اپنے نائٹ کلبوں اور رقص گاہوں کے لئے دُور دُور تک مشہور ہے۔ یہاں کی زندگی سے لُطف اندوز ہونے کے لئے اس سے زیادہ کچھ چاہیئے جو میرے پاس ہے۔ یہاں بڑے بڑے فن کار اپنا وقت ایک بہ ظاہر پُر سکون فضا میں گذارتے اور پیرس کی رنگینی میں اضافہ کرتے ہیں۔ دو بج رہے تھے اور مجھے کچھ اور مقامات کی کشش کھینچ رہی تھی۔

بارش ہو رہی تھی، اسی میں ہوٹل واپس آیا تو ادھیکاری میرے منتظر تھے۔ شام اُن کے حوالے تھی۔ سب سے پہلے پینتھین پہونچے جو پیرس کی قومی یادگار ہے۔

اِس کی دیواروں پر بڑی بڑی خوبصورت تصویریں، ہال میں قومی رہنماؤں کے مجسمے ہیں جن کے دیکھتے ہی انقلابِ فرانس اور بعد کی زندگی ذہن میں جاگ اُٹھتی ہے۔ یہ سب دیکھ لیجئے تو ایک گائڈ تہہ خانے میں لے جاتا ہے۔ یہ تہہ خانہ اندھیرا اور پُرپیچ ہے جس میں قومی وقار میں اضافہ کرنے والے ادیبوں، شاعروں، سائنس دانوں اور محبانِ وطن کی قبریں (بلکہ قبروں کے نشانات) ہیں، اِن میں روسو، زولا، مولیر وغیرہ بھی ہیں۔ یہاں پہونچ کر احساسِ عظمت اور سنجیدگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور جب گائڈ کی آواز فرانسیسی میں گونجتی ہے تو چاہے کچھ سمجھ میں نہ آئے لیکن ایسی جگہ دیکھ لینے پر فخر کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ اس میں تین سو قبروں کی جگہ ہے ابھی صرف تریسٹھ بھری گئی ہیں۔ یہاں سے روداں میوزیم پہونچے۔ فرانس کے مشہور مجسمہ ساز روداں کا پہلا نمونۂ فن جو میرے ذہن میں نقش ہے وہ "سوچ" ہے جس کی تصویر میں نے غالباً بیس سال پہلے دیکھی تھی۔ پتھر میں صرف ایک خوبصورت عورت کا جھکا ہوا چہرہ تراش دیا گیا ہے اور باقی پتھر سوچنے کی محویت کی علامت بن جاتا ہے۔ میوزیم میں پہونچ کر تو حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ پتھر اُس کے ہاتھ میں موم یا گیلی مٹی ہے۔ جسم کے جھکاؤ، چہرے کے تاثرات، دو جسموں کے میل اور پتھر میں خیال آفرینی کی یہ کیفیات تو بہت سے مصور بھی پیدا نہیں کر سکتے اور پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ روداں نے ایک دو نہیں سیکڑوں مجسمے بنائے ہیں۔ ادیبوں میں ہیوگو اور بالزاک اُس کے پسندیدہ ادیب ہیں جن کے متعدد چھوٹے بڑے مجسمے ہیں۔ قریب ہی اُسی میوزیم کے احاطہ کے اندر ایک گرجا ہے وہ بھی میوزیم میں

تبدیل کرلیا گیا ہے۔ پارک اور باغ میں بھی اُس کے بعض مشہور مجسمے نصب ہیں۔ مجھے رودان کے یہاں شاعر کی نزاکتِ خیال، مصوّر کے خطوط کی کشش، نغمہ گر کا تاثر سب کچھ ایک جگہ ملا۔ اُس کے یہاں حقیقت پسندی اور تصوّر پرستی کی وہ آمیزش ہے جس سے تخلیقی فن وجود میں آتا ہے۔

پھر ہم سیتے یونیورسٹی دیکھنے چلے گئے۔ یہ پیرس کا جامعہ نگر ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی جگہ پر دُنیا کے کئی ملکوں نے اپنے طلباء کے لیے عمارتیں بنوادی ہیں اور عمارتوں میں اُن ملکوں کے فن تعمیر کی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ طلباء کی اتنی بڑی بستی دنیا میں غالباً اور کہیں نہیں ہے یہیں ہندستان کے دو اساتذہ مسٹر سنگھ (الہ آباد) اور مسٹر صدیقی (علیگڈھ) سے بھی ملاقات ہوئی۔ اچھی طرح گھوم پھر لینے کے بعد کھانا بلقان رسٹراں میں کھانا کھایا گیا۔

۱۲ر جون جمعہ ۔ اور اب پھر لندن میں ہوں۔ پیرس کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی خواب دیکھتا ہے۔ وہاں کی تہذیبی زندگی یا آدابِ معاشرت کے متعلق کچھ کہنا ممکن نہیں لیکن اپنے تاثرات ظاہر کرنے میں کیا نقصان ہے۔ اب تک میں نے جو شہر دیکھے ہیں، ان میں پیرس سب سے زیادہ پسند آیا۔ یہاں کے میوزیم، میخانے، عبادت گاہیں، تھیٹر اور اوپرا، رقص گاہیں، باغ، تاریخی مقامات تعداد میں اتنے اور اس قدر متنوع ہیں کہ اُن کے دیکھنے کے لئے بہت کچھ چاہیئے۔ پیرس ایک شہر نہیں، دُنیا ہے۔ ایک فضا ایک تاثر ہے۔ اس کا ایک مزاج ہے اور یہ سب کچھ صدیوں کے انقلابات کا نتیجہ ہے۔ اس میں شاہوں کے جلال اور انقلابیوں کے نفس شعلہ بار کے اثرات کی رنگ آمیزی ہے، اس کے اسٹیج پر

محض ڈراتے نہیں ہوئے ہیں، دنیا کی تقدیر بنتی بگڑتی رہی ہے۔ اس نے صرف اشیاء کی تجارت نہیں کی ہے بلکہ خوابوں اور خیالوں کا بیوپار بھی کیا ہے۔ تربیتِ ذوق اور فکر انگیزی میں پیرس کا بڑا حصہ ہے اس لئے اسے پسند نہ کرنا کفر ہوگا لیکن کفر یہ بھی تو ہے کہ کوئی فرانسیسی زبان نہ جانے، نائٹ کلبوں میں نہ جائے، فن کاروں کی انجمنوں میں نہ بیٹھے، پیرس کی رنگ رلیوں میں شریک نہ ہو، اور چار دن کے اندر اس کی روح میں اُتر کر، اس کے اندر جھانک کر اس کے راز معلوم کرنے کی کوشش کرے! بہرحال کہنے کے لئے میں نے پیرس دیکھ لیا۔

میری روح میں جو ویرانی اور اُداسی ہے وہ پھر پوچھتی ہے اگر تم نے پیرس نہ دیکھا ہوتا تو ـــــ؟ میرے پاس کوئی سیدھا سادا جواب نہیں، بس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جہاں بہت سی ناآسودگیاں دل کا زخم بن کر خلش پیدا کرتی یا بادل بن کر ذہن پر چھائی رہتی ہیں اُنھیں میں اس کا بھی اضافہ ہو جاتا، بس اور کیا ہوتا! جانتا ہوں کہ یہ جواب معقول نہیں مگر میرے پاس اور کوئی جواب ہے بھی تو نہیں!

لندن پہونچا تو معلوم ہوا کہ کنگس وے ہال میں پنڈت جواہر لال نہرو کا لکچر ہے، میں بھی چلا گیا، مشکل سے کوئی ہندوستانی ہوگا جس نے شرکت نہ کی ہو۔ پنڈت جی نے صاف بات نہیں کہی، امریکیوں اور دوسرے سامراجیوں کو جو کچھ کہا وہ اشاروں میں تھا اُنھوں نے دبی زبان تقریباً یہ بھی کہا کہ وہ ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں اور وزیر اعظم کو بہت سے پہلوؤں پر نگاہ رکھ کر کچھ کہنا چاہئے۔

۲۴ ارجون ۱۹۶۰ء ـــ اب واپسی کا خیال سر پر سوار ہے، لندن میں جی لگ رہا تھا لیکن ایک مسافر کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کہیں اس کا جی زیادہ لگ جائے۔

کل صبح کو رمیش موہن (شعبہ انگریزی لکھنؤ یونیورسٹی) اور شیر سنگھ آ گئے، تین چار بجے تک وقت اس طرح کٹ گیا کہ خبر بھی نہ ہوئی۔ کئی جگہ جانے اور بعض لوگوں سے ملنے کا خیال تھا، پورا نہ ہو سکا۔ ارادہ کی کمزوری اور عدم تنظیم کا شکار رہوں۔ کچھ دنوں سے اپنی تنقید آپ کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے، یہ ایسا بُرا تو نہیں لیکن بات حد سے گذر جاتی ہے کیونکہ یہ محض تنقید نہیں الزام طرازی ہے، قوتِ ارادی کا فقدان اور اپنی ذات پر بے اعتمادی ہے۔ اپنے اندر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر کمزوریاں نکالنا، یہ بھی کوئی بات ہے! بعض لوگ میرے متعلق مجھ سے متفق نہیں ہیں، اس سے تقویت پہونچتی ہے۔

آج عید ہے، میں ہندوستان میں بھی اس مسرتِ عام میں کبھی شریک نہیں ہو سکا، یہاں تو اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ دن بھر گھر ہی پر رہا۔ رات کو فاروق صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ بڑا اہتمام تھا، کئی نئے حضرات سے ملاقات ہوئی بارہ بجے رات تک وقت اچھا گذرا۔ یہ فاروق صاحب صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں، بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، خوش ذوق اور ترقی پسند ہیں۔

۱۶ جون منگل ۔ لندن میں قیام کے لمحے بَرافشاں ہیں۔ بہت سی جگہیں ہیں جہاں جانا چاہتا ہوں، نہیں جا سکتا، بہت سے لوگوں سے ملنا ہے، نہیں مل سکتا۔ کل زیادہ وقت اسباب کے درست کرنے میں لگا۔ اسباب کا کچھ حصہ جہاز راں کمپنی کے دفتر پہونچا کر چھٹکارا حاصل کر لیا۔ پھر چیرنگ کراس میں کتابوں کی دوکانوں کا چکر لگایا۔ شاید آخری چکر۔ چانسری لین میں قانون کی تعلیم کے مرکز دیکھے۔ کچھ چیزیں خریدیں۔ اِدھر برابر بارش ہو رہی ہے لیکن موسم خوشگوار ہے کاش میں اُداس نہ ہوتا!

لندن میں تین سال سے ایک ڈرامہ مسلسل ہو رہا ہے۔ نام ہے THE LITTLE HUT
اُس کی تعریف میں بہت سے قصیدے لکھے گئے ہیں۔ کئی بار جانے کا پروگرام بنا
اور فسخ ہو گیا، اب چونکہ وقت بالکل نہیں اس لئے طے ہوا کہ اسے دیکھ ہی لیں
چنانچہ آلِ حسن وغیرہ کے ساتھ شام کو وہاں گیا۔ ایک ایک لفظ سُننے کی کوشش
کی، پوری توجہ سے دیکھا لیکن حیرت ہے کہ مجھے اس میں کچھ زیادہ نہ ملا۔ ایسے ہی
مواقع پر اختلاف مذاق پسندیدگی کے لئے اپنے اپنے دلائل تراشتا ہے اور کوئی
معقول تنقیدی اصول کام نہیں آتا۔ مجھے اس کے ہر پہلو پر اعتراض ہے۔ سوا اس کے
کہ تین سال سے کام کرتے کرتے اداکار بالکل مشین ہو گئے ہیں اور کیا لکھوں!

تھیٹر سے نکل کر قریب ہی شیفٹبری ایوینیو پر ایک چینی رسٹراں "ہانگ کانگ"
میں کھانا کھایا اس میں رات کے بارہ بج گئے۔

۷ ارجون بدھ۔ آج لندن کا آخری دن تھا، چند چھوٹی موٹی چیزیں خریدنے
کے بہانے میں نے اِدھر اُدھر ایک چکر لگا لیا۔ آلِ حسن کا اصرار تھا کہ بی بی سی کے لئے
اپنے تاثرات لکھ دوں۔ پانچ منٹ کا ایک تاثر لکھ کر شام کے وقت ریکارڈ کرا آیا۔
چند اشارے ہیں جو کہیں کہیں ان صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جی لگا تو جہاز میں
انھیں سمیٹنے کی کوشش کروں گا۔ اب تو بس سفر کا خیال ہے، اُداس اور پریشان کُن۔
سمندر کی لہریں ابھی سے ذہن میں ایک مضطرب قسم کا رقص کر رہی ہیں۔ پانی میں
سترہ دن! جی گھبرائے گا تو کیا کروں گا اور میں اپنے جی سے واقف ہوں، ضرور
گھبرائے گا۔۔۔ دل کی اس ناشگفتگی کا علاج کس آبِ نشاط انگیز سے کروں گا؟
پڑھنے سے؟ سوچنے سے؟

۱۸ / جون جمعرات — میں پی اینڈ او کمپنی کے ۲۳ ہزار ٹن وزنی جہاز STRATHAIRD میں ہوں۔ لندن سے پچاس ساٹھ میل دور مسلسل عرشہ پر کھڑا رہا۔ انسانوں کے مجمع میں اضطراب اور ہل چل اور سمندر کی لہروں میں بے چینی کا مطالعہ کرتا رہا، جب اندھیرے نے جہاز کے باہر کی دنیا کو نگل لیا تو میں اپنے کیبن میں آیا۔ اندر گرمی تھی، پھر عرشہ پر ہوں۔ کبھی کبھی دور کوئی لہر زیادہ اُٹھ کر چمک جاتی ہے ورنہ اندھیرا ہے۔ بادل نہ ہوتے تو شائد چاندنی میں سمندر خوبصورت معلوم ہوتا۔ مجھ سے یوں ہی لوگوں سے ملا نہیں جاتا، کیا باتیں کروں گا۔ کوئی نہ ملے، کتابوں پہ تو زور چلے گا۔ میرے ساتھ شیکسپیر ہے اور غالب۔

ابھی چند گھنٹے پہلے لندن میں تھا، عزیز اور دوست اسٹیشن تک رخصت کرنے آئے تھے، اُن کی افسردہ نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ اور یہاں اتنی دور سے میں اُنھیں پھر الوداع کہہ رہا ہوں، وہ تنہائی میں اب بھی ساتھ ہیں لیکن اُنھیں رخصت کرنا ضروری ہے۔

آج لندن سے جاتے ہوئے میرے تاثرات عجیب ہیں، اُس انفعالی کیفیت سے بالکل مختلف جو امریکہ چھوڑتے ہوئے طاری تھے۔ لندن سے میں نے پہلی نظر میں محبت نہیں کی، اس کی پہلی جھلک نے مجھے حیرت زدہ نہیں کیا۔ میں جب لندن میں آیا وہ کہر کی تاریکی سے نکلا ہوا لندن تھا، نامانوس، ٹھنڈا اور بے رنگ۔ کہنے کو بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا لیکن اس بہار میں توانائی اور گرمی نہیں تھی، ایک سوگوار پُرانا پن تھا، ایک طرح کی خزاں زدگی۔ یہ اپنی قدیم روایات میں ڈوبا ہوا لندن تھا جس کی رفتار میں تیزی نہ تھی۔ میں نے تو کئی دن تک اُس لندن کو بھی نہیں پہچانا

جس کی کہانی ناولوں، تاریخوں، اخباروں اور سفرناموں میں پڑھی تھی، جس کے افسانے یہاں کی جا تراکرنے والوں کی زبانی سُنے تھے۔ چار چھ دن تک میں اُسے پہچانے بغیر اُس کی گلیوں اور سڑکوں پر پھر کر اُس کے خط و خال دیکھتا رہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ جُھلسے ہوئے درختوں میں سبزی کی نمود ہے، سورج کبھی کبھی اپنا مکھڑا دکھاتا ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اِس کے چہرے پر سے بھی آنچل ہٹ رہا ہے اور اجنبیت دُور ہو رہی ہے۔ اُس کا حُسن کہربائی ہے اور اس کی ادائیں جاذب۔ پھر میں اس سے اچھا خاصا مانوس ہونے لگا۔ ویسے تو اس کے ظاہری حُسن میں بھی بڑی کشش ہے۔ کون ہے جو اس کے حسین پارکوں، چوڑی سڑکوں، ٹیڑھی گلیوں، متنوّع مکانوں، خوبصورت دوکانوں سے متاثر نہ ہوگا، کون ہے جسے ریجنٹ اسٹریٹ کے موڑ، پکیڈلی کی چہل پہل (جہاں عشق کا دیوتا EROS بیچارے مسافروں کے سینے پر چھپ کر تیر مارتا ہے) ویسٹ منسٹر اور پارلیمنٹ کی عظمت، ٹاور برج کی شان، ہائڈ پارک کی رنگینی، افسانہ خیزی اور وسعت سے دلچسپی نہ ہوگی لیکن لندن کا حقیقی حُسن، اُس کی اصل عظمت اُس کی سنجیدہ سحرکاری، اُس کے ٹھہراؤ، صدیوں کی پروردہ علم و عمل کی روایات، میوزیموں، کتب خانوں، تھیٹروں اور علمی انجمنوں میں ہے۔ لندن کے باہر بھی بہت کچھ ہے اور ذہن ضرور اُدھر جاتا ہے لیکن اس وقت میں آکسفرڈ، کیمبرج، گلاسگو یا اڈنبرا کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، میرے سامنے صرف لندن ہے، جسے میں نے ذرا غور سے دیکھنے کی کوشش کی (اور افسوس ہے کہ بہت کم دیکھ سکا) مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اِس کے علمی خزانوں سے بالکل فائدہ نہیں اُٹھایا۔ وہ مجھے بلاتے رہے اور میں اُس

حریص کی طرح ان سے دُور رہا جو کم پر رضامند نہیں ہوتا، سب کچھ چاہتا ہے اور کچھ نہیں پاتا۔

میری لندن کی پسندیدگی خالص نہیں ہے۔ اُن سیاہ گھناؤنے دھبوں پر بھی نگاہ جاتی ہے جنھیں اس کے دامن سے دھویا نہیں جاسکتا۔ مجھے اس کی سامراجیت، قدامت پرستی، مخصوص اخلاقی تصوّرات، علیٰحدگی پسندی، نوآبادیوں میں ظالمانہ استحصال، سبھی سے نفرت ہے لیکن اپنے علمی خزانوں کی وجہ سے میں اُسے ایک اور نظر سے دیکھتا ہوں۔ میرے لئے تو یہی بہت تھا کہ اس کی مٹّی میں شیکسپیر، ملٹن، جانسن، سوئفٹ، ورڈسورتھ، کولرج، ڈارون، مارکس اور ڈکنس آسودۂ خواب ہیں لیکن اور بہت سی باتیں یاد رکھوں گا۔ ان چند دنوں میں جو یہاں خوش و ناخوش بسر ہوئے، جن میں نامعلوم قسم کی ناآسودگی اور اَن جانے غم کی دھیمی آنچ کا شکار رہا، جن میں ہمدردی، رفاقت اور خلوص کی ٹھنڈی چھاؤں زندہ رہنے پر اُکساتی رہی، شاید کبھی نہ بھولوں گا۔ میری ذہنی اور جذباتی زندگی میں لندن تھوڑا بہت داخل ہوگیا ہے۔ اِس میں نیویارک کی چمک دمک، بھاگ دَوڑ اور ہماہمی نہیں، پیرس کی نزاکت اور لطافت بھی نہیں، پھر بھی وہ سب کچھ ہے ایک انسان جس کی تمنّا کرسکتا ہے۔ یوں بھی لندن کو پسند کرنا ہی پڑے گا ورنہ ڈاکٹر جانسن کی رُوح اُن کا قول یاد دلائے گی۔ دوست تجھے لندن میں کس چیز کی کمی نظر آتی ہے اگر پسند نہیں آیا تو تیری انسانیت ہی مشکوک ہے!

وطن جا رہا ہوں اس لئے خوش ہوں، لندن سے اس قدر جلد جا رہا ہوں اس لئے اُداس۔ یقین ہے کہ یہاں سے کچھ یادیں پیچھا کریں گی اور کچھ چہرے

ساتھ جائیں گے اور بہت دنوں تک خیال و خواب کی دنیا میں اُن سے رونق اور کشمکش رہے گی، پھر وقت کے تقاضے ان پر نقاب ڈالیں گے، اُنھیں دُھندھلا کریں گے، مٹائیں گے اور میں حالات کے مطابق اُنھیں بھلاتا اور یاد کرتا رہوں گا۔

۲۰ر جون سنیچر — جس بات کا ڈر تھا وہ ہو کر رہی۔ امریکی حکومت نے روزن برگوں کو قتل کر دیا۔ بے رحم سرمایہ داری نے جولیس اور ایتھل دونوں کو برقی کرسیوں پر بٹھا کر اپنی درندگی کا ثبوت دیا۔ بین الاقوامی احتجاج، وکلا کی رائے، پوپ کے مشورے، یہودی ربیوں کی درخواست اور رحم کی التجا کے باوجود انھوں نے روزن برگوں کی اس شک میں موت کے گھاٹ اُتار دیا کہ اُن کے ذریعہ سے ایٹم بم کا راز روس پہونچا ہے۔ کاش وہ ان کے زندہ کی خواہش کا خیال کرتے، کاش انھوں نے ان کے یتیم بچّوں کی مایوس نگاہیں دیکھی ہوتی، کاش وہ تمام دنیا کے عام انسانوں سے پوچھتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں! مجھے یہ غم کیوں ذاتی معلوم ہوتا ہے؟ کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو عزیز دوستوں سے جدائی ہو گئی، کیوں ہر طرف اُداسی چھائی ہوئی نظر آتی ہے، میری آنکھیں درد سے کیوں بھیگ بھیگ جاتی ہیں، مرنے والوں نے تو مسکرا کر جان دی؟ کیوں؟ اتھاہ سمندر بہتا جا رہا ہے، لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں، ستارے پھیکے ہیں اور اندھیرے میں سرگوشیوں کی سی آواز آتی ہے جو میں سُن نہیں سکتا لیکن جی چاہتا ہے کہ یہ آواز مجھے ہمت دلا رہی ہو کہ زندہ رہنے کی خواہش کو تیز کرو، مرنے والے کے ساتھ تم یہ کر سکتے ہو کہ اُس صداقت کو پھیلاتے رہو جس سے اُن کے خیال روشن تھے، یقین کی وہ گرمی پیدا کرو جس سے اُن کے سینے منوّر تھے۔

میں کھڑا صرف لہروں کو دیکھ رہا ہوں - تنہا اور اُداس - ہلکی چاندنی سطحِ آب پر اس طرح دکھائی دیتی ہے جیسے کہکشاں تھکن سے چُور ہو کر گر پڑی ہو اور اُس کے ٹکڑے پانی پر بکھر گئے ہوں -

۲۲ رجون دوشنبہ - اسٹریلیا ، نیوزی لینڈ ، امریکہ ، برطانیہ ، سیلون ، جزائر سلیمان کے باشندوں کے علاوہ جہاز میں ہندوستانی بھی بہت ہیں بعض خلیق اور ملنسار بھی معلوم ہوتے ہیں ، بعض لوگوں کو پہلے سے جانتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں ایک ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں لیکن مجھے شیکسپیر نے مسحور کر رکھا ہے - نفسیاتی حیثیت سے بھی میں اسی عالم میں ہوں کہ اُس کے اَلمئے پڑھوں چنانچہ دو تین دن میں میں نے ہیملٹ ، میکبتھ اور رومیو جولیٹ پڑھ ڈالا ، اب آتھیلو پڑھ رہا ہوں - ان کے پڑھنے سے تسکین ہوتی ہے ، جذبات میں بالیدگی اور سلامت روی آتی ہے - غالباً ارسطو نے اپنی شعریات میں اسی تطہیرِ نفس کی طرف اشارہ کیا ہے - ایک طرف جذبات اپنے بہاؤ کا راستہ پاتے ہیں دوسری طرف کائنات کی عظیم الشان کشمکش میں اُنھیں اپنا مقام سمجھنے میں مدد ملتی ہے - اُس پر جادو کا سا کام کرنے والی شیکسپیر کی شاعری !

کل شام کے وقت جبرالٹر کی آبنائے سے گذر کر ہم لوگ بحیرۂ روم میں داخل ہو گئے - ایک طرف یورپ دوسری طرف افریقہ - کچھ دُور تک دونوں کے ساحل ساتھ ساتھ چلتے رہے ، آج کہیں کہیں صرف افریقہ کے ساحلی علاقے نظر آتے ہیں - چھوٹے بڑے متعدد جزیرے دکھائی دیے - دن گرم اور راتیں ٹھنڈی ہیں - سمندر کی سطح بالکل ساکن ہے ، یہاں تک کہ دُور پر چاندنی کی لکیر بھی

بے حس و حرکت معلوم ہوتی ہے ۔

سوا اس کے کہ اپنے کیبن میں، آ کر سو رہوں میں سارا وقت جہاز کے مختلف عرشوں پر گذارتا ہوں ۔

۲۵ر جون پنجشنبہ ۔ بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوگئی ہے ۔ میں اگرچہ اپنا زیادہ وقت تو اپنے ہی درجے کے عرشے پر گذارتا ہوں لیکن دن بھر میں تین چار چکّر ٹورسٹ کلاس کے بھی لگا لیتا ہوں ۔ یہاں کچھ دلچسپ لوگ ہیں ۔ ذرا اور واقفیت ہو جائے تو ان لوگوں کا ذکر کروں گا ۔

کھانے کی میز پر میرے ساتھ پانچ آدمی اور ہوتے ہیں ۔ دو میاں بیوی دہلی کے رہنے والے ہیں ۔ مسٹر اُلّال، اصلاً کونکنی ہیں ۔ برما شل میں کسی بڑے عہدے پر ہیں ۔ بے حد شگفتہ مزاج، دلچسپ اور خلیق ۔ اُن کی بیوی بھی بہت خاموش، متین، لیکن شگفتہ رو ہیں ۔ ایک آندھرا دیش کی عیسائی نرس ہے ۔ امریکہ میں دو سال گذار کر آ رہی ہے ۔ نام لمبا سا ہے مگر تارے کہی جاتی ہے ۔ بہت نیک، ہنس مکھ لیکن خالِ رُخِ ایام کہہ لیجئے، جوان ہے اور سیاہ فام ۔ سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت بوڑھے مسٹر چٹو پادھیا کی ہے ۔ ڈھاکہ کے رہنے والے ہیں، عمر تقریباً پچھتّر سال، ساٹھ سال سے بنگال کی سیاست میں ایک کانگریسی کی حیثیت سے حصہ لے رہے ہیں ۔ پاکستان کی مجلس دستور ساز میں کانگریس پارٹی کے لیڈر رہیں ۔ اپنی حکومت کی طرف سے کارونیشن میں شریک ہونے کے لئے انگلستان گئے تھے ۔ دلچسپ باتیں کرتے ہیں، مجھ پر مہربان ہیں اور جب بھی فرصت ہوتی ہے ڈک پر کچھ وقت میرے ہی ساتھ گذارتے ہیں ۔

ایک اور تجربہ ۔ معلومات کی کمی کی وجہ سے جس سے لُطف اندوز ہونا مشکل تھا ۔ آج جہاز کے کپتان نے "انجن روم" اور "نیوی گیشن برج" یعنی اُس حصّے کی سیر کرائی جہاں سے جہاز کی پوری مشین پر قابو رکھا جاتا ہے ۔ سمندر کی گہرائی، ہواؤں کا رُخ، طوفانوں کی آمد، دوسرے جہازوں کے فاصلے سب دیکھے جا سکتے ہیں ۔ انجن روم بالکل تہہ میں ہوتا ہے، اِس قدر گرم کہ خدا کی پناہ!

دو تین دن کے اندر میں نے لِنگاٹ لیئر اور آتھیلو پڑھے ۔ ساحرانہ اور عظیم الشان!

۲۶ر جون جمعہ ۔ جہاز آج چند گھنٹوں کے لئے پورٹ سعید میں رُکا ۔ چھوٹا سا شہر ہے جس میں مشرق و مغرب کا امتزاج ہے ۔ بازار بہت بڑا نہیں، تحفے تحائف کے لئے چیزیں ملتی ہیں اور اندازہ ہوا کہ دام چکانے میں بہت دھوکا ہو سکتا ہے ۔ مردوں اور عورتوں کے لباس جیسے تصویروں میں دیکھے تھے وہی تھے ۔ کاش اسکندریہ اور قاہرہ دیکھ سکتا!

سب سے دلچسپ چیز جہاز کا نہر سویز میں داخلہ تھا ۔ یہ نہر جس کے لئے مصریوں اور انگریزوں میں اتنی زبردست کشمکش جاری رہتی ہے ذرا بھی مرعوب کن نہیں ہے ۔ پانی کی ایک پتلی سی جھیٹ، مگر سیاسی اور فوجی حیثیت سے بہت اہم ۔ یہاں سے موسم بھی اچھا خاصا بدل گیا ہے، گرمی محسوس ہو رہی ہے لیکن جیسے جیسے رات بھیگتی جا رہی ہے، ٹھنڈک بڑھ رہی ہے ۔

۲۸ر جون اتوار ۔ کوئی خاص بات نہیں ۔ نہر سویز سے نکلتے ہی داہنے ہاتھ پر مصر کے ساحلی علاقے دُور ہوتے گئے لیکن داہنی طرف کوہ سینا نے کچھ دُور تک

نظر نوازی کی ۔ شاید ہم میں کوئی "ربِّ ارنی" کی تکرار کرنے والا نہیں تھا کیونکہ طُورِ سینا پر کوئی برق نہیں چمکی ۔ بحیرۂ قلزم بے حد گرم ہے لیکن میں پڑھے جا رہا ہوں کچھ لوگ ہیں جن سے باتیں کر لیتا ہوں، سینما دیکھ لیتا ہوں، بھولے بھٹکے کسی کھیل میں شریک ہو جاتا ہوں ۔ لکھنے کو جی نہیں چاہتا ورنہ آنکھیں بہت کچھ دیکھ رہی ہیں اور کان بہت کچھ سُن رہے ہیں ۔

۳۰ رجون منگل ۔ ابھی رات ہی تھی کہ جہاز عدن میں لنگر انداز ہوا ۔ عدن کو دیکھنے اور تحائف کے طور پر کچھ چیزیں خریدنے کی نیت سے میں بھی اُترا ۔ عدن میں اس وقت بھی گرم ہوا چل رہی تھی ۔ کچھ دوکانیں کُھل گئی تھیں، کچھ کُھل رہی تھیں ۔ قریب ہی ایک بازار ہے زیادہ تر لوگ وہیں وقت گذاری اور خریداری کرتے رہے، کچھ لوگ دس گیارہ میل دُور ایک اور بازار میں پہونچ گئے ۔ بہر حال ایک اور انگریزی نوآبادی دیکھنے کا موقع ملا، افلاس زدہ، غیر تعلیم یافتہ اور زبوں حال! ہندوستانیوں کی بہت سی دوکانیں ہیں جو مدتوں سے یہاں کاروبار کر رہے ہیں ۔ اس بندرگاہ پر چیزوں کے قدرے ارزاں ہونے کا راز یہ ہے کہ یہ محاصل سے آزاد ہے لیکن قیمتوں کا ہیر پھیر یہاں بھی بہت ہے چنانچہ لوگوں نے چیزیں خرید خرید کر جب ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کیا تو بعض کی چالاکی اور بعض کی حماقت کا کُھلا ہوا ثبوت ملا ۔ پورٹ سعید میں بھی دیکھا اور یہاں بھی دیکھا، چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں تاجر اپنی چیزیں سجا کر جہاز کے قریب لاتے ہیں اور بڑی پھرتی سے سودا کرتے ہیں ۔

اب جہاز بمبئی ہی میں رُکے گا ۔ ہم بحرِ ہند میں گرم سفر ہیں ۔

۲ رجولائی جمعرات ۔ کل ہی سے سمندر پر مانسونی کیفیت طاری ہے ۔ بے پناہ

لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ موسم ہی طوفانی ہے۔ جہاز کے زیادہ تر لوگ بیمار ہیں، مجھ پر ذرّہ برابر بھی اثر نہیں۔ پانی اکثر اُن عرشوں پر آجاتا ہے جو سطح سمندر سے قریب ہیں جی چاہتا ہے اس تلاطم کو دیکھتا ہی رہوں۔ یہ سمندر، یہ فضائیں یہ ہواؤں کا خروش، جہاز سے متھے ہوئے پانی کی جھاگ، جیسے بہتی ہوئی چاندی یا تلملاتا ہوا سیماب! یونانیوں کے اس خیال میں کتنی شاعری تھی کہ حُسن کی دیوی وینس اسی جھاگ سے پیدا ہوئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سیکڑوں مچھلیاں ایک خاص حسین انداز میں اُچھلتی ہیں اور کمان بن کر پانی میں غوطہ لگاتی ہیں۔ بس تیس بتیس گھنٹے کا سفر اور ہے، اس کے بعد بمبئی، سمندر کو الوداع اور پھر ساحل ہی ساحل!

۳ رجولائی جمعہ — کچھ لوگوں کا سفر ابھی بہت سا باقی ہے لیکن جنھیں بمبئی میں اُترنا ہے جلد جلد ملنے کے ارمان نکال رہے ہیں۔ تصویریں لینے، پتے لکھنے، خطوں کے وعدے کرنے کی اِنتہا نہیں۔ آج لوگ کھیل کود میں کم منہمک ہیں شاید اُترنے کی تیاریاں بھی ہیں۔ میں مِلنے جُلنے میں بہت کچّا ہوں پھر بھی کتنے لوگوں سے ملاقاتیں ہو گئی ہیں۔ یہ میجر دت ہیں، کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر، نہایت شریف، سنجیدہ اور باوقار، سادہ مزاج لیکن جہاں دیدہ، ان کی بیوی اُن خواتین میں سے معلوم ہوتی ہیں جن کے نام سے اُن کے شوہروں کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ یہ لکھنؤ کے اُلجھے بالوں والی عیسائی لڑکی کیتھرین پیٹرس ہے، خوب ہنستی بولتی ہے لیکن آنکھوں میں ایک افسردگی کی جھلک ہے، کوئی اُس سے باتیں کرے تو جان سکتا ہے کہ یہ کیا ہے! اور یہ ملا باری اُنما ہے۔ علم الحیوانات میں پی ایچ ڈی کر کے واپس ہو رہی ہے، ہنس مُکھ، ذہین اور حوصلہ مند! یہ پنجاب کے رہنے والے مصوّر کنول کرشن ہیں،

عمر کا زیادہ حصّہ بنگال میں گذرا ہے، مدّتوں سے تبّت میں رہتے ہیں، کافی گھوم پھر چکے ہیں۔ شاعر مزاج اور دلچسپ ہیں۔ اپنی بہت سی تصویریں دکھائیں، بڑی حقیقت پسندانہ ہیں، خطوط بھی دلکش اور رنگوں کا تناسب بھی۔ اسٹریلیا کی ایک لڑکی ہے روز میری، سارا وقت اُسی کے ساتھ گذارتے ہیں۔ روز میری اپنے خیالات میں ترقی پسند ہے، شاعری کرتی ہے اور سماجی علوم سے دلچسپی لیتی ہے۔ اُردو کے اشعار سُننا چاہتی ہے اور ترجمہ کرا کے داد دیتی ہے۔ ڈاکٹر راؤ مدراس حکومت کے ایک اسپتال میں اچھی جگہ پر ہیں۔ سال بھر امریکہ میں تعلیم حاصل کر کے واپس ہوئے ہیں، سارا وقت ایک فرانسیسی خاتون کے ساتھ گذارتے ہیں۔ اس فرانسیسی خاتون نے ایک ہندوستانی ڈاکٹر سے شادی کر لی ہے اور اب اُس کے پاس ہندوستان آ رہی ہے۔ دلچسپ باتیں کرتی ہے اور باتیں کر کے تھوڑی دیر آپ کا بھی دِل بہلا سکتی ہے۔ ایک مرہٹی خاتون ہیں، بالکل مغربی انداز سے رہتی ہیں، عمر وہ ہے جسے جوانی نہیں کہہ سکتے لیکن وہ اِس سے زیادہ توجہ چاہتی ہیں۔ یہ پروفیسر آنند ہیں، ادھیڑ لیکن بہت گری ہوئی طبیعت کے، مجھے پڑھے لکھے بھی کم ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک دلچسپ شخص کا تذکرہ اور کرنا چاہتا ہوں، مسٹر بوزا، یہ جزائر سلیمان کے سردار ہیں۔ جشن تاجپوشی میں شرکت کے لئے گئے تھے، بدصورت، مضبوط اور خاموش لیکن جب اُن سے باتیں ہوئیں تو اُن کے کارنامے معلوم ہوئے۔ پچھلی بڑی لڑائی میں جاپانیوں نے اُن کے جزیرے پر قبضہ کر لیا تھا اور انھیں بڑی تکلیفیں پہونچائی تھیں اور واقعی انھوں نے اپنے جسم پر زخموں کے درجنوں نشان دکھائے۔ جب جاپانیوں کو یقین ہو گیا کہ وہ مر گئے تو اُنھیں چھوڑ دیا،

کسی طرح یہ بچ نکلے۔ اپنی سوانح عمری انگریزی میں لکھی ہے۔ کھانے پر ساتھ بیٹھنے والوں کا ذکر کر ہی چکا ہوں، ایک بوڑھے روسی کا ذکر اور کر دوں۔ مسٹر زرناف انقلابِ روس کے زمانے میں بھاگ آئے تھے، اب آکسفرڈ یونیورسٹی میں تاریخ روس پڑھاتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنّف ہیں۔ آرتھوڈاکس گریک چرچ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ٹراونکور کے علاقے میں اس عیسائی مشن کا کوئی کالج ہے اُس کے پرنسپل ہو کر جا رہے ہیں۔ بیوی ساتھ ہیں، عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اُن سے کافی باتیں ہوئیں، شروع میں تو ہر بات کا جواب مختصر دیتے تھے لیکن بعد میں مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر اُنھیں اطمینان ہو جائے تو وہ روس جانے کو تیار ہیں۔ اُن کی بیوی البتہ محض عیسائی ہیں۔ میں نے انھیں ڈرا دیا ہے کہ جہاں وہ جا رہے ہیں وہاں روس بن رہا ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ درجنوں اور لوگوں سے ملاقاتیں اور باتیں ہوئیں، کہاں تک سبھوں کا ذکر کروں۔ کچھ طالب علم تھے کچھ پڑھانے والے، کچھ تاجر اور کچھ عیسائی مشنری۔

سچ پوچھو تو میں خود لوگوں سے کہاں ملا، کچھ لوگ شائد میری ہی تنہائی پر رحم کھا کر مجھ سے مل لئے! میں تو بس پڑھتا رہا، ایک کے بعد شکسپیر کا دوسرا ڈرامہ! تنہائی محض اکیلا ہونا نہیں ہے، نا آسودگیوں اور شخصیت کے سہم کر رہ جانے کا احساس ہے جس کی لامعلوم تہیں ہو سکتی ہیں۔

۱۹ جولائی سنیچر۔ تقریباً دس مہینے کے بعد آج پھر بمبئی میں ہوں۔ بمبئی جو مجھے پسند ہے، نیویارک، لاس اینجلس، شکاگو، سین فرانسسکو، لندن اور پیرس دیکھ لینے کے بعد بھی۔ پھر چرچ گیٹ کے قریب اُسی ہوٹل میں ہوں، ایرلائنس ہیں۔

جہاز صبح سویرے ہی بندرگاہ میں داخل ہوگیا، بارش ہورہی تھی۔کسٹم سے گزرنا سب سے سخت آزمائش تھی۔میرے پاس تو کوئی ایسی چیز نہ تھی دوسروں کے لئے دئے ہوئے تحائف پر پچاس روپے کے قریب محصول ادا کرنا پڑا۔لکھنؤ کے کئی خط ملے، میں نے بھی گھر بمبئی پہونچنے کا تار دے دیا۔یہاں کے احباب اور شاگرد کئی دن کے لئے بمبئی میں روک لینا چاہتے ہیں۔

۶ر جولائی دوشنبہ ۔ آج ۸ر جولائی کے لئے جگہ بُک ہوگئی۔تین دن، رات کو سو رہنے کے سوا گھومتا پھرتا اور دعوتیں کھاتا رہا ہوں، ابھی ڈیڑھ دن اور اِسی عالم میں گذریں گے پھر لکھنؤ پہونچ جاؤں گا اور دائرہ مکمل ہوجائے گا۔ مگر دائرہ مکمل کہاں ہوتا ہے۔کیا میں اُسی نقطہ پر ہوں جس سے چلا تھا؟ اس کا اندازہ تو بعد ہی میں ہوسکے گا! لکھنے کا موقع ملا اور جی بھی لگا تو آئندہ بتانے کی کوشش کرونگا۔

۹ر جولائی جمعرات ۔ بارہ بجے رات ۔سب کی نظریں بچا کر یہ سطریں پنسل سے لکھ رہا ہوں ۔ لکھنؤ میں ہوں ۔ عزیزوں اور دوستوں کے درمیان ۔بہت سے عزیز آگئے ہیں، گھر بھرا ہوا ہے۔بچّے اسٹیشن ہی پر پہونچ گئے تھے اور میرے دِل کا قافلہ بھی منزل پر پہلے ہی سے پہونچ کر اُن سے مِل لیا تھا۔

ڈائری ختم ——— اب اپنے خیالات کا جائزہ ذرا تھم کر لوں گا۔

سُخنہائے گُفتنی

تقریباً دس مہینے اور لگ بھگ چالیس ہزار میل — دیکھنے اور سمجھنے، کھونے اور حاصل کرنے کے لئے نہ مُدّت کم ہے نہ سفر چھوٹا ہے۔ مگر دشواری یہ تھی کہ نہ تو میں مکمل سیاح تھا نہ طالب علم، نہ پابند تھا نہ آزاد۔ نہ میرے سفر کا باقاعدہ پروگرام بنا ہوا تھا نہ لوگوں سے ملنے جلنے میں مجھے اپنی یا دوسرے ملکوں کی حکومتوں کا تعاون حاصل تھا، نہ کوئی رہنمائی کرنے والا تھا نہ ساتھ دینے والا — اس لیے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ توازن قائم رکھنے کے لئے سارے سفر میں میرے اعصاب پر اچھا خاصا زور پڑتا رہا۔ اگر ایک یونیورسٹی میں جاتا، طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لے لیتا، کسی پروفیسر سے وابستہ ہوجاتا تو یہ الجھن نہ ہوتی، کچھ لوگوں سے بے تکلفی ہوجاتی، بحث مباحثہ میں آسانی ہوتی، کچھ سیکھتا کچھ سکھاتا، لیکن یہ کچھ نہیں تھا، بہت کم ایسے لوگ ملے جن سے ایک بار سے زیادہ ملنے کا موقع ملا ہو، ایسے میں بعض دفعہ تو گفتگو تمہید کی منزل ہی میں ختم ہوجاتی تھی یا سوالات اور جوابات محض دُہراتے جاتے تھے۔ اِس نقص پر

قابو پانا میرے امکان میں نہیں تھا ۔ اِن مواقع کے ساتھ اگر میرا عزیز قاری اُن اشاروں کو بھی ذہن میں رکھے ، اِس ڈائری میں اُکتا دینے کی حد تک جن کی بھرمار ہے تو وہ شائد کچھ معقول نتائج نکال سکے ۔

جب سے آیا ہوں امریکہ اور انگلستان کی سیاسی ، سماجی ، تمدنی ، ادبی ، اخلاقی ، جنسی ، تہذیبی اور اِقتصادی زندگی کے متعلق سیکڑوں پہلوؤں سے پوچھے ہوئے ہزاروں سوالات کے جواب دے چکا ہوں ۔ میں نے صرف انھیں سوالوں کا جواب دیا ہے جو میرے علم اور مشاہدہ کی حد تک صحیح جواب کے لائق تھے جب تاثر اور علم ایک دوسرے میں مل جائیں تو جواب کچھ عجیب بن جاتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے یعنی میں کسی جواب سے خود اپنی جگہ پر مطمئن تھا لیکن دوسروں کو مطمئن نہ کر سکا ۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے اِس لیے مجھے یہ اُلجھن نہیں ہے کہ شاید کسی اور کا علم اور مشاہدہ میرے خیالات اور تاثّرات کی نفی کر دے اور میری رائیں غلط نکلیں ۔ میں نے واقعات کے گذرتے ہوئے لمحوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے ، میں نے تھوڑے مواد سے زیادہ سمجھنے کی سعی کی ہے اِس لئے انھیں تاریخی حقائق کا مرتبہ دینا غلط ہوگا تاہم اگر میرے احساسات ، میری آنکھیں اور میرا دماغ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتے رہے ہیں تو میں نے کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی سمجھا ہے ۔

امریکہ کی تاریخ میں دورِ جدید کی ابتدا پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے ہوتی ہے کیونکہ اسی لڑائی کے دَوران میں امریکہ پہلی دفعہ اپنے علیحدگی پسندی کے خول سے پوری طرح باہر نکلا اور باہر نکلا تو اُسے اپنی دولت اور سیاسی اہمیت کا اندازہ ہوا ۔

اہمیت کا یہ احساس بڑھتا رہا، دولت بڑھتی رہی، قوت بڑھتی رہی، صنعت اور تجارت کے زور پر سیاسی اقتدار بڑھتا رہا اور چونکہ واشنگٹن، جفرسن، لنکن کی دی ہوئی جمہوری روایات کا احترام باقی تھا اس لیے کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دئے بغیر، دوسری قوموں کو غلام بنانے کی خواہش کا اظہار کئے بغیر امریکہ آگے بڑھتا رہا لیکن صنعتی اِرتقا نے یہ کشمکش ضرور پیدا کر دی تھی کہ فاضل صنعتی مال کے لئے بازار تلاش کیا جائے۔ دنیا میں پس ماندہ، غیر ترقی یافتہ اور زندگی کی دوڑ میں پچھڑے ہوئے ملکوں کی کمی نہ تھی، اِس لئے آہستہ آہستہ امریکی سرمایہ داری نے اپنے خونخوار پنجے دوسری قوموں کے جسم میں گڑو دئے۔ ایک موقع پر ابرہام لنکن نے اِس خطرے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا:۔ "میں مستقبل میں ایک ایسے بحران کا تصوّر کر رہا ہوں جس کا اثر میرے اعصاب پر ہو رہا ہے اور میں اپنے ملک کے لئے خطرے کا احساس کر کے کانپنے لگتا ہوں۔ جنگ (یعنی خانہ جنگی) کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بڑے بڑے کارپوریشن وجود میں آگئے ہیں، اِس کے بعد اونچے لوگ گندی فضا پیدا کر دیں گے، سرمایہ دار عوام کے تعصّبات سے فائدہ اٹھا کر اپنا اقتدار بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ یہاں تک کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ آئے گی اور جمہوریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔" آخر وہی ہوا، بلکہ اس سے بڑھ کر ہوا لنکن نے جس کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

امریکی سرمایہ داری دھیرے دھیرے سامراجی رنگ اختیار کرنے لگی۔ براہِ راست مداخلت، نوآبادیاتی طریق کار اور اثر و نفوذ کے مختلف حربے کام میں لائے جانے لگے۔ جغرافیائی اور تاریخی صورت حال نے امریکہ کو اس کا

موقع بھی دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صنعت میں اضافہ ہوا، باہر بازار بننے لگے، چھوٹی بڑی جنگوں میں جنگی مال بکے اور ساری دنیا کی دولت سمٹ کر امریکہ میں آنے لگی۔ امریکہ کا اقتدار اتنا بڑھا کہ وہ یورپ اور ایشیا کے اکثر ملکوں کا قائد بن گیا۔ اب اپنی تجارت، اپنے سرمایہ اور دولت، اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے اُسے اس پالیسی کو جاری رکھنا ہے اس لئے وہ اربوں ڈالر خرچ کرکے اُس سیاسی اور معاشی بحُران سے بچنا چاہتا ہے جو اُس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ جب جنگ کا خطرہ کم ہوتا ہے تو امریکہ میں بیروزگاری بڑھتی ہے، منافع کم ہوتا ہے، اثر گھٹتا ہے، جب دوسرے ممالک اپنی قومی زندگی کو استوار کرنا چاہتے ہیں یا قومی جذبات کی بنیاد پر آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں یا اپنی ملکیتوں کو قومی بناتے ہیں تو امریکہ پر ضرب پڑتی ہے اور وہ ان کی مخالفت کرتا ہے۔ اب بھی اُس کی صنعت جنگی پیمانہ پر ہے، اگر لڑائی کا خطرہ ختم ہو جائے تو اُس کا مال کہاں جائے گا، اپنے یہاں جو مال بنائے گا وہ کون خریدے گا۔ صدر روزولٹ کے زمانے میں ایک خاص طرح کا اقتصادی توازن قائم کرنے کی کوشش ہوئی تھی جو سرمایہ داری کی بعض برکتوں سے دوسروں کو بھی فیض پہونچاتی تھی، وہ اب بُری نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ اِسی لئے رِی پبلکن پارٹی کو پچھلے الکشن میں سرمایہ داروں نے کروڑوں ڈالر خرچ کرکے جتا دیا۔ بہرحال امریکہ زندگی کی اس منزل میں ہے جہاں یا تو اُسے جنگ کے شعلے بھڑکانا، دنیا میں آزادی اور اشتراکیت کی جدوجہد کو روکنا ضروری ہے یا پھر اپنے ہی ذرائع کی بنیاد پر ایک معمولی سرمایہ دار ملک کی طرح رہنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امریکہ کی زیادہ تر آبادی خوش حال ہے، وہ یہ چاہتی ہے کہ یہ خوش حالی برقرار رہے اور بڑھے اس لئے وہ حکومت کی پالیسی کی حمایت کرتی ہے۔ عام امریکی آدمی کو چاہیے وہ کسان ہو یا مزدور، تاجر ہو یا دفتر میں ملازم، معلم ہو یا متعلم یہی معلوم ہے کہ اُس کا نظام حکومت سب سے اچھا ہے۔ جب پروپیگنڈے اور اشتہار کے ہر ذریعے سے اُسے یہی معلوم ہو، جب چرچ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات، سنیما، تعلیمی ادارے اور سیاست داں اُسے یہی بتائیں کہ تم دنیا کی برگزیدہ قوم ہو تو اُسے کسی دوسری بات کا خیال کیونکر آئے۔ مصروف زندگی میں نجی تحقیق کی فرصت کسے ہے! یہ فاشزم اور خیالات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی ایک شکل ہے مگر پھر بھی انفرادی آزادی کا چرچا جتنا وہاں کیا جاتا ہے کہیں اور شکل سے ہوگا۔ میرا تجربہ ہے کہ انگلستان اور فرانس میں اس سے سیکڑوں گنا زیادہ انفرادی آزادی کا وجود ہے۔ اب اگر اس کے نفسیاتی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو بہت سی باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔ امریکہ کے زیادہ تر کھاتے پیتے لوگ اپنا نظام برقرار رکھنے کی جدوجہد کر رہے ہیں، وہ کہیں باہر جاتے ہیں تو یہ آرزو سینے میں چھپا کر لے جاتے ہیں، اُن کا ہر قدم امریکہ کے مفاد کے لئے اُٹھتا ہے۔ انھیں امریکی حکومت نے اس کے لئے متعین نہ کیا ہو لیکن اُن کا مقصد امریکہ کو فائدہ پہونچانا ہی ہوتا ہے۔ اپنے ملک کو فائدہ پہونچانے کی کوشش کوئی غیر اخلاقی بات نہیں لیکن دوسروں کی آرزوؤں اور زندہ رہنے کی خواہشوں کا خون کر کے ایسا کرنا کسی سنگدل اور بے رحم افادی فلسفہ ہی کی رو سے جائز ہو سکتا ہے۔ اسی سے

تجرباتی یا عملی افادیت کا وہ فلسفہ وجود میں آتا ہے جو امریکہ کا قومی اور سرکاری فلسفہ بن گیا ہے ۔ اسی فلسفہ کے محور پر وہاں کا نظامِ تعلیم ، نظامِ اخلاق اور نظامِ ادب گھومتا ہے ، اِسی سے نیم سرکاری اور سرمایہ داروں کے اشاروں پر چلنے والی تجارتی یونینوں کی رگوں میں خون جاری ہے ۔

امریکہ کا سرمایہ باہر لگنا چاہیئے تاکہ قومی دولت میں اضافہ ہو ، سُونا سُونے کو کھینچتا ہے ، اِسے امریکی سرمایہ دار سے زیادہ اور کوئی نہیں سمجھتا ۔ اِسے قانونی شکل دینے کے لئے مارشل پلان ، باہمی تحفظ اور چار نکاتی پروگرام جنم لیتے ہیں ۔ بڑے بڑے فاؤنڈیشن انسانی ہمدردی ، سخاوت اور علم دوستی کے نام پر کم و بیش یہی کر رہے ہیں ۔ جب ان سے وہ سیاسی نتائج برآمد نہیں ہوتے جن کی توقع کی جاتی ہے تو انھیں بند کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے ۔ یہ باتیں نہ تو راز رکھی جاتی ہیں اور نہ کوئی کھلی آنکھ والا ان سے لاعلم رہ سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں کسی قسم کے ترقی پسند خیالات رکھنا یا ظاہر کرنا امریکہ میں کس طرح پسند کیا جا سکتا ہے ۔ ایف بی آئی ، غیر امریکی کمیٹی اور میکارتھی کا سرگرم کار ہونا اِس کا منطقی نتیجہ ہے ۔

ایک ایسے مُلک میں جہاں طبقات کی تقسیم واضح ہو اور مفاد متصادم ہوں ایسی صورتِ حال کا پیدا ہونا ضروری ہے ۔ اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر ہوا ہے ۔ ادب میں بھی یہ کشمکش دیکھی جا سکتی ہے ۔ جہاں ایک طرف اُن ادیبوں اور شاعروں کی روایتیں خطروں میں گھری ہوئی ہونے کے باوجود زندہ ہیں جو امریکی جمہوریت کے علمبردار تھے وہاں دوسری طرف برابر ایسی ادبی ، تہذیبی اور

فلسفیانہ تحریکیں جنم لیتی رہتی ہیں جو امریکی سرمایہ داری اور حاکم طبقہ کی تائید کرتی ہیں۔ پریگمیٹزم (عملی افادیت) نیو ہومینزم (جدید انسانیت دوستی) نیو کریٹی سزم (جدید تنقید)، کریٹی ایٹو کریٹی سزم (تخلیقی تنقید) کیتھولک دبستانِ ادب اور اور ائیت کی مختلف شکلیں یہی فرض انجام دے رہی ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک کا منشا یہی ہے کہ ادب کو زندگی کی جدوجہد سے دُور رکھا جائے۔ ادب کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اچھا اور بُرا بتائے (حالانکہ امریکہ میں بھی ادب یہ بتاتا ہے) یہ کام تو فلسفی کا ہے اور امریکہ کے فلسفی ہیں ڈیوی اور جیمس جو یہ کہتے ہیں کہ جو سب سے زیادہ مفید ہے وہی سب سے زیادہ ٹھیک ہے اور یہ مفید ہونا جتنی وسعت رکھتا ہے اُسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ یہ ادبی اور فلسفیانہ تحریکیں سرمایہ داری کو تقویت پہونچاتی ہیں اور اپنی علینیت پرستی سے محنت کشوں، حبشیوں اور کمزوروں کو اُن کے حق سے محروم کرنا چاہتی ہیں اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ ان غیر جانب دار نقادوں کی کتابیں پڑھے جن میں سیاسی اور اخلاقی مسائل بھرے ہوئے ہیں۔ بڑی آسانی سے اُنھیں ہر ترقی پسند خیال میں عیسائیت اور کمیونزم کی آویزش نظر آنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ٹی ایس ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ کی پرستش ہوتی ہے۔

اِس میں کسی قسم کا شک نہیں کہ امریکہ میں علمی اور ادبی کام بڑے پیمانے پر ہو رہے ہیں۔ جن ادیبوں کو تھوڑی بہت کامیابی بھی حاصل ہو گئی ہے وہ اچھی حالت میں ہیں۔ رسائل، اخبارات اور کتابوں کی اشاعت کی انتہا نہیں بلکہ وہاں کے لوگ فخر یہ کہتے ہیں کہ ہم میگزین پڑھنے والی قوم ہیں۔ اچھے ادبی اور

علمی رسائل انگلستان سے زیادہ نکلتے ہیں لیکن چند ہزار سے زیادہ نہیں بکتے۔ متعدد ناشروں اور مصنفوں نے شکایت کی کہ امریکہ میں کتابیں بہت کم بکتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سی اعلیٰ سنجیدہ کتابوں کے ایک اڈیشن کے ختم ہونے میں بھی سالہا سال لگ جاتے ہیں لیکن جنھیں اچھے تبصرے مل جاتے ہیں اور اشتہار دینے کا موقع حاصل ہو جاتا ہے وہ لاکھوں کی تعداد میں بک جاتی ہیں۔ یہاں ضمناً یہ بھی کہہ دوں کہ امریکہ میں اشتہار بازی کی کثرت، ندرت اور کبھی کبھی دلکشی حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ اگر اخباروں اور رسالوں کے تین چوتھائی حصے میں اشتہار ہو تو تعجب نہیں کرنا چاہئے۔ چند علمی اور ادبی رسالوں کے علاوہ سبھوں کا یہی حال ہے۔ تو ذکر تھا ادیبوں کی آمدنی کا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے۔ نیو امریکن لائبریری والے مِنٹر اور سگنٹ کے نام سے دو سلسلے چلا رہے ہیں۔ اچھی کتابیں شائع کرتے ہیں مگر پہلا اڈیشن نہیں لیتے بلکہ دوسرا تیسرا یا اُس کے بعد کا۔ ہر اڈیشن کم سے کم دس لاکھ کا چھاپتے ہیں قیمت ۳۵ سے ۵۰ سنٹ تک رکھتے ہیں اس میں سے ایک سنٹ مصنف کو دیتے ہیں۔ یہ ظاہر یہ ایک سنٹ کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ تین فی صدی رائلٹی ہے لیکن جب دس لاکھ کتابیں بک جاتی ہیں تو مصنف کو دس ہزار ڈالر (تقریباً سینتالیس ہزار ہندوستانی روپئے) مل جاتے ہیں۔ بعض کتابیں کئی کئی اڈیشن نکل جاتی ہیں اس سے ان کتابوں کے بازار کی وسعت کا اندازہ بھی لگا یا جاسکتا ہے۔ ایک مثال اور۔ بعض رسائل اپنی پسندیدہ کہانی یا مضمون کے لئے دو سنٹ سے تین چار سنٹ فی لفظ تک معاوضہ دیتے ہیں (اکیس سنٹ کا

ایک ہندوستانی روپیہ ذہن میں رکھئے) یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ بڑے بڑے خالص ادبی رسائل کچھ نہیں دیتے اور نہ ہر ادیب کو یہ موقع ملتا ہے کہ اُس کی کتاب خراب ہی سہی لیکن دس لاکھ والے اڈیشنوں میں چھپ جائے۔ میں جب ناشروں، کتب فروشوں اور مصنفوں سے بات کرتا تھا اور وہ یہ پوچھ لیتے تھے کہ آپ کی کتاب کس رفتار سے بکتی ہے اور آپ اُس سے کیا حاصل کر لیتے ہیں تو میں انھیں جواب دینے کے بجائے یہ بتانے لگتا تھا کہ ہندوستان میں چودہ پندرہ زبانیں ہیں اور پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ پندرہ فیصدی ہے، اِس سے اندازہ لگا لیجئے کہ علمی اور تنقیدی کتابیں کتنی چھپتی اور کتنی بکتی ہوں گی! کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ عام ہندوستانی کی قوتِ خرید کو بھی سامنے رکھئے اور مجھ سے نہ پوچھئے کہ میری کتابیں کتنی بکتی ہیں! کہنا تو میں یہ بھی چاہتا تھا کہ بہت سے لوگ اُردو کی کتاب نہیں صرف انگریزی کی خریدتے ہیں، چاہے وہ سڑا گلا ناول ہی کیوں نہ ہو، لوگوں کو تہذیبی کاموں سے بہت کم دلچسپی ہے، ادبی تعصّب کا شکار ہونے کی وجہ سے علم کے لئے نہیں تفریحاً صرف اپنے پسندیدہ ادیب کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں ہونٹوں تک آ کر رہ جاتی تھیں۔

اخبارات بڑی تعداد میں نکلتے ہیں، چھوٹے چھوٹے قصبوں، کالجوں اور اسکولوں سے بھی اخبارات اور رسائل شائع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر "سنسنی خیز" خبروں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں مگر نیویارک ٹائمز، نیویارک ہیرلڈ ٹریبون اور ایسے ہی دو چار اور اخبارات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اتوار کے دن نو

کبھی کبھی ان کے صفحات کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہونچ جاتی ہے۔ سات آٹھ حصّے ہوتے ہیں آپ اپنی دلچسپی کے حصّے نکال کر باقی سڑک کے کنارے والی ردّی کی ٹوکری یا صندوق میں پھینک سکتے ہیں۔ اخباروں میں جرائم کا ذکر بہت ہوتا ہے۔ لاس اینجلس میں ایک ہی دن کے اخبار میں میں نے چوری، ڈاکہ، زنا، اغوا، قتل، جنسی کجروی، بم پھینکنا، خودکشی، عاشق کو قتل کر کے اُس کا بوسہ (کیونکہ لاش کے چہرے پر لپ اسٹک لگے ہوئے ہونٹوں کا نشان تھا۔ شاید محبوبہ نے سالومی اور یوحنّا کی کہانی دُہرائی تھی) طلاق، زنا اور جبر کے الزامات اور مقدمہ بازی، جُوا، نشہ کی حالت میں نقضِ امن سبھی طرح کی خبریں پڑھیں۔ افسوس یہ ہے کہ چند اخباروں کے سوا بہت کم ایسے ہیں جو یونیورسٹیوں میں سیکڑوں کی تعداد میں ہونے والے لکچروں، نمائشوں اور تہذیبی سرگرمیوں کو کوئی اہمیت دیتے ہوں۔

کسی ملک کی تہذیبی زندگی کو دلکش اور بھرپور بنانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے اُن کی امریکہ میں بھرمار ہے لیکن ابھی تک اس کی جڑیں زندگی کی گہرائیوں میں پیوست نہیں ہوئی ہیں۔ تعلیم، کالج اور یونیورسٹیاں، آرٹ اکیڈمی اور سوسائٹیاں، لائبریریوں کے جال اور میوزیم، فطرت کی فیاضی اور انسان کی محنت، دولت کی فراوانی اور حوصلہ مندی تمام باتیں موجود ہیں لیکن ابھی امریکہ کی عمر کم ہے اور جب ان چیزوں سے تہذیبی زندگی کو سنوارنے کا وقت آیا تو امریکہ سرمایہ پرستی اور سامراجیت کے جنون میں مبتلا ہو گیا اور زندگی کے مقاصد بدل گئے۔ پھر بھی اِس وقت امریکہ کے دانشور سب سے زیادہ جس اُلجھن میں مبتلا ہیں وہ

اسی کا تعین ہے کہ امریکی تہذیب سے کیا مراد ہے؟ یورپ سے وہ کس حد تک آزاد ہے؟ اس میں وسعت کتنی ہے؟ اور اُسے امریکہ کے عام انسانوں کی تہذیب کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ بہت سے دانشور تو امریکی تہذیب کو یورپ کی تہذیب سے بالکل آزاد بتاتے ہیں، امریکہ کی تہذیب کو بین الاقوامی اور یورپ کی تہذیبوں کو قومی کہتے ہیں۔ اُسے محض مادّی اور مفاد پرستی پر مبنی ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ خیر یہ بحث تو الگ ہے کہ امریکی تہذیب کی خصوصیات کیا ہیں اصل سوال جو میرے ذہن میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ امریکہ کی تہذیب کو مکمل، یورپ سے آزاد اور سب سے برتر ثابت کرنے کا جذبہ کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چونکہ اس وقت امریکہ دنیا کی سب سے دولت مند قوم ہے، اُس کا اثر دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے، بہت سی قومیں اس کی دست نگر ہیں اور دنیوی معاملات میں اُس کی قیادت کو تسلیم کرتی ہیں، اس لئے امریکہ یہ چاہتا ہے کہ اُسے محض مادّی حیثیت ہی سے بلند و برتر تسلیم نہ کیا جائے بلکہ تہذیب اور روحانیت میں بھی قائد مان لیا جائے۔ بہت سی جگہوں پر اس کا اظہار بھی کیا گیا ہے چنانچہ میرے سامنے ہی ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہندوستان کے مشہور مسٹر مسانی نے (جو سوشلسٹ بھی ہیں اور نہ جانے کیا کیا) لڑکیوں کے معروف ماؤنٹ ہولیوک کالج میں تقریر کرتے ہوئے کہا، ہمیں امریکہ کے گیہوں کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی روحانیت کی ضرورت ہے کیونکہ ہم اپنی روحانی قوتوں کو پارہ پارہ کر چکے ہیں۔ بہرحال تہذیبی برتری کا یہ خیال امریکیوں میں خاص قسم کی نفسیاتی کیفیت پیدا کر رہا ہے جسے فخر نہیں غرور، خود اعتمادی نہیں جارحانہ اندازِ نظر، رواداری نہیں احساسِ برتری کہہ سکتے ہیں۔ یہ تمام باتیں تہذیبی نقطۂ نظر سے

اُوچھا پن پیدا کرتی ہیں اور اس کے مظاہرے امریکہ میں بہت ہوتے ہیں۔ اِسی احساسِ برتری سے پیدا ہونے والی ایک کیفیت یہ بھی ہے کہ وہاں کے لوگ تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔ کسی نہ کسی شکل میں اس کا اِظہار گفتگو میں اکثر ہو جاتا ہے۔ میں پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ میں تہذیبی ترقی کے تمام امکانات موجود ہیں، بس سرمایہ دارانہ نظام اور اُس کی اُلجھنوں نے اُنھیں بھٹکا دیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں انگلستان کو دیکھا جائے تو انگریزوں کی سنجیدگی، متانت، گہرائی، بُردباری، تحمّل آزمائشوں پر آزمائشیں جھیل لینے کی صلاحیت بڑی معنویت رکھتی معلوم ہوتی ہے، گو محض سرسری نگاہ سے دیکھنے والا امریکہ کی چمک دمک، ظاہری اظہارِ ہمدردی، مصنوعی اخلاق سے جلد متاثر ہو جائے گا۔ اس کے برعکس انگریز کم آمیز اور دیر آشنا معلوم ہو گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ صدیوں کے تہذیبی نکھار نے یہ باتیں پیدا کی ہیں اور ان میں حُسن اور وِقار ہے۔

یورپ اور امریکہ دونوں جگہ تعلقات میں ایک قسم کی تاجرانہ ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ جس مروّت اور محبّت، احساسِ وقار اور تصوّرِ اخلاق میں ہم جو رہے ہیں وہ وہاں شاذ ہے۔ خاندانی زندگی زیادہ تر محض میاں بیوی اور نابالغ بچّوں تک محدود ہوتی ہے۔ بوڑھے ماں باپ تک اس محفل میں اجنبی ہوتے ہیں دوسرے عزیزوں کا کیا ذکر! اس طرح کی زندگی میں خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی، جن کا گِنانا مقصود نہیں، صرف فرق کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ماں باپ جب اسّی پچاسی سال کے ہو جاتے ہیں اور کسی کام کے نہیں رہتے تو اکثر انھیں "ضعیف خانوں" اور اسپتالوں وغیرہ میں زندگی کی آخری سانسیں گذارنی پڑتی ہیں۔

یہ بات وہاں کے لوگوں کے لئے بھی پریشان کن ثابت ہو رہی ہے کیونکہ امریکہ میں
اوسط عمر بڑھ رہی ہے اور "ضعیف خاتون" کی تعداد ناکافی ہے۔ چونکہ ہر شخص
خود کماتا ہے اس لئے وہ کسی کا محتاج نہیں لیکن خاندانی تعلقات، مہمان نوازی،
خاطر داری اور مجلسی آداب میں جو حسن ہے اُس کا بھی جواب نہیں۔ میرے ایک
ہندوستانی ملاقاتی نے بتایا کہ انھیں کیلی فورنیا کے ایک خاندان میں کھانا کھانے
کا اتفاق ہوا۔ بوڑھی خاتون نے، جو میزبان تھیں، اپنے بیٹے کی تصویریں دکھائیں،
بعض تصویروں میں بیٹا اور بہو دونوں تھے۔ بیٹا کوریا کی جنگ میں شریک تھا۔ بوڑھی
عورت نے کہا سال بھر ہوئے میرے بیٹے کی شادی ہوئی وہ کچھ ہی دن بعد کوریا
چلا گیا۔ ابھی بہو آئی تھی، میرے ساتھ دو ہفتے تک رہی، اور سُنتے ہو! میں نے
اُس سے کچھ بھی نہیں لیا حالانکہ وہ کھانا میرے ہی ساتھ کھاتی تھی۔ شائد یہ صورت
بہت عام نہ ہو لیکن کم و بیش یہی باتیں اور ذرائع سے بھی معلوم ہوئیں۔

مجھے امریکہ کی جنسی زندگی کے سمجھنے کا موقع زیادہ نہیں ملا، ویسے آپ جو کچھ
فلموں میں دیکھتے، کتابوں، رسالوں اور اخباروں میں پڑھتے ہیں وہ غلط نہیں ہے۔
جنسی جرائم اور غلط جنسی رجحان سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیات عام ہیں۔
تحلیل نفسی سے دلچسپی محض علمی نہیں عملی ہے کیونکہ موجودہ حالت میں امریکی مردوں اور
عورتوں کے اعصاب ضرورت سے زیادہ کھنچاؤ محسوس کر رہے ہیں۔ کم عمری ہی سے
اس جنسی زندگی کی ابتداء ہو جاتی ہے اور بعض حالات میں ہم جلبسی کا رُخ اختیار
کر لیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اخلاقی حیثیت سے بعض باتیں جنھیں ہم معیوب
یا عریاں سمجھتے ہیں، اُن کے یہاں معیوب نہیں، میں اس کا ذکر کر بھی نہیں رہا ہوں۔

میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ خود امریکہ کے ماہرینِ نفسیات جنسی کجرویوں اور اُن سے پیدا ہونے والے جرائم کی زیادتی سے بے حد خوفزدہ ہیں۔

جس شخص کو بھی امریکہ کے متعلق غور کرنے، پڑھنے یا جا کر اپنی آنکھوں سے وہاں کے حالات دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ حبشیوں کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ امریکہ کے دامن پر یہ ایک ایسا دھبہ ہے جو ہر وقت صاف نظر آتا رہتا ہے۔ اس وقت امریکہ میں ان کی تعداد ڈیڑھ اور دو کرور کے درمیان ہے۔ شمالی ریاستوں میں کم لیکن جنوب میں اُن کی بڑی بڑی آبادیاں ہیں۔ وہ علم و فضل، موسیقی اور اداکاری، ادب اور فن میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں لیکن نسلی امتیاز کے اندھے تصوّرات نے انھیں ذلیل بنا رکھا ہے۔ بعض علاقوں میں اُن کے اسپتال، اسکول اور کالج، محلّے اور گاؤں بالکل الگ ہیں اور اُن سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مساوی حقوق کے لئے اُن کی جد و جہد جاری ہے لیکن اُن میں وہ تنظیم نہیں ہے جو انھیں فتحمند بنا دے۔ بات یہ ہے کہ کچھ نیگرو انفرادی طور پر اچھی حالت میں ہیں، وہ موجودہ نظام کو ٹھیک سمجھتے ہیں، بہت سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ امریکی ہیں اور اُنھیں وہی حقوق حاصل ہیں جن کا ذکر امریکہ کے دستورِ اساسی میں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کا حاکم طبقہ اُن کے حقوق کا تحفظ نہیں کر رہا ہے اور نہ نسلی تعصّب کے اُس جذبے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے ان کی جان، مال اور آبرو سب ہر وقت خطرے میں ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ جلد ہی بڑے پیمانے پر اُنھیں اپنی باوقار زندگی کے لئے جد و جہد کرنا ہوگا۔ دوسری غیر سفید قوموں اور قبیلوں کی حالت بھی بہت خراب ہے لیکن مجھے اُن کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

امریکہ کی تعلیمی حالت کا ذکر درمیان میں کرتا رہا ہوں صرف اتنا ہی اور کہنا ہے کہ موجودہ دور میں وہاں کی اعلیٰ تعلیم کا معیار اونچا ہوا ہے گو اس کا اظہار زیادہ تر ٹکنیکل اور سائنٹیفک تعلیم میں زیادہ ہو رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ میں دو ہزار سے زیادہ ادارے موجود ہیں جن میں سے زیادہ تر غیر سرکاری ہیں لیکن تعلیم مہنگی ہے۔ یونیورسٹیوں میں تعلیم کے علاوہ کھیل کود، لکچر، ڈرامے مختلف قسم کی انجمنیں بنانے کی آسانیاں موجود ہیں۔ دفتروں سے لے کر امتحانوں تک ہر کام منظم طریقے پر ہوتا ہے۔ طالب علم محنتی ہوتے ہیں، اساتذہ طلباء سے عزت کا مطالبہ اُس طرح نہیں کرتے جیسے ہندوستان میں۔ آکسفرڈ اور کیمبرج میں البتہ فضا مختلف ہے۔ امریکہ میں طالب علم کرسی پر پاؤں رکھ کر یا میز پر پیر پھیلا کر بھی بیٹھ جاتا ہے، انگلستان میں تعلیمی روایات قدیم مذہبی روایات پر مبنی ہیں اور اب بھی اس میں ایک طرح کا تقدس نظر آتا ہے اس لئے تعلیمی اداروں میں بڑا رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔

اب میں چند بالکل بے ربط سی باتیں لکھ دینا چاہتا ہوں آپ اُن سے جو نتائج نکالنا چاہیں نکال سکتے ہیں۔

- امریکہ کی مشہور میگزین ووگ نے لکھا کہ ۱۹۵۲ء میں امریکہ میں عورتوں نے اپنے لئے دس ارب ڈالر کے کپڑے خریدے اور مردوں نے اِس کے نصف سے بھی کم۔
- امریکہ کی بنی ہوئی مصنوعات امریکہ کے باہر سستی ملتی ہیں وہاں مہنگی۔
- ۱۹۵۲ء میں امریکہ کے اندر صرف حادثات میں چھیانوے (۹۶) ہزار آدمی مرے۔

• حکومت کے بعد چرچ سب سے مضبوط اور اہم ادارہ ہے۔

• ایک سرمایہ دار نے صرف ییل یونیورسٹی کو ایک کروڑ پینتالیس لاکھ ڈالر ہدیہ کے طور پر دیا۔

• عریانی اور فحاشی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق امریکہ کی بارہ سو میگزینوں میں سے گیارہ سو محض لڑکیوں کے جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے نکلتی ہیں یا جرائم کی نئی شکلیں بتانے کے لئے۔

• فورڈ فاؤنڈیشن کا فنڈ پچاس کروڑ ڈالر سے زیادہ ہے۔

• ٹامس مان امریکہ میں رہنے کی نیت سے گیا تھا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ امریکہ کا سب سے بڑا ادبی انعام نازیسٹ ازرا پاؤنڈ کو دیا گیا جو ایک پاگل خانے میں ہے تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا گذر امریکہ میں نہیں ہو سکتا۔

• پروفیسر لیٹی مور نے ۱۹۴۶ء میں امریکی حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ چین کے چیانگ کائی شیک کو مالی امداد دینے سے کوئی فائدہ نہیں اُن پر ۱۹۵۳ء میں غیر امریکی رائے دینے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔

• برٹرینڈ رسل نے ہارورڈ یونیورسٹی میں لکچر دیتے ہوئے امریکیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں بھی کمیونزم سے نفرت کرتا ہوں لیکن میں تمھاری طرح پاگل نہیں ہو گیا ہوں کہ مجھے ہر میز اور کرسی کے نیچے کمیونسٹ ہی چھپے ہوئے دکھائی دیں۔

• نیویارک ٹائمز اسکوائر (سب سے آباد چوک) کے قریب خونچے کے انداز میں بعض لوگ مونگ پھلی یا بعض بھنے ہوئے بیج بیچتے بھی نظر آجاتے ہیں۔ فقیر بھی ملتے ہیں لیکن بہت کم۔

• امریکہ میں عام طور سے کافی پی جاتی ہے، چائے اچھی نہیں ملتی۔ ایک چھوٹے سے لفافے میں تھوڑی سی چائے ہوتی ہے جو گرم پانی کی کیتلی یا پیالی میں ڈال دی جاتی ہے۔ رنگ ہلکا آتا ہے۔

بس اتنا کافی ہے۔ آپ بھی اپنی رائے قائم کیجئے۔ مجھے امریکہ اندھیرے اُجالے کا ایک عجیب امتزاج نظر آیا۔ بار بار تاریکی کے اندر روشنی دکھائی دی اور بار بار تمدّنی ارتقا، کے پیچھے دنیا پر چھا جانے کی خواہش کا بھیانک چہرہ سامنے آیا۔ جنگ کی تمنّاؤں کے بیچ ایماندار ادیبوں کا امن کا نعرہ بھی سُنائی دیا۔ اس لئے نہ تو میں مایوس ہوا اور نہ مجھے اس سے نفرت ہوئی۔ توریت میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے یہودیوں سے کہا، دیکھو مصریوں سے نفرت نہ کرنا کیونکہ تم اُن کے ملک میں اجنبی اور مسافر کی طرح رہ چکے ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اُس امریکہ سے نفرت کیسے ہو سکتی ہے جس نے میری حیرت اور میرے علم میں اضافہ کیا۔ جس نے لنکن، جفرسن، وھٹ مین، پین، مارک ٹوین، فاسٹ، جرڈم، پال رابسن، گولڈ، سل سیم اور روزن برگ کو جنم دیا۔ مجھے نفرت ہے وہاں کے حاکم طبقہ سے، اُس سیاست سے جو دنیا کو ہڑپ کرنا چاہتی ہے، اُس سرمایہ دارانہ نظام سے جس کی نظر میں انسان بے حقیقت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج امریکہ جس ذہنی بحران، جس نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہے اُس سے وہ ضرور باہر نکلے گا اور اُس وقت اُس کی ساری عملی صلاحیتیں زندگی کو خوشگوار اور حسین بنانے میں صرف ہوں گی کیونکہ امریکہ کے جذبۂ عمل، لگن اور قوتِ تنظیم سے اُس کا دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا

لوگ پوچھتے ہیں (اور میں خود ان لوگوں میں شامل ہوں) کہ تمھیں اس سفر سے کیا فائدہ ہوا؟ اور میں کوئی واضح جواب نہیں دے سکتا۔ فائدہ ضرور ہوا لیکن میں اس کی ناپ تول سے معذور ہوں۔ اگر اپنی ذات اور صفات کا علم بھی فائدہ میں شمار کیا جاسکتا ہے تو میں دو چار لفظ اس کے متعلق ضرور کہہ سکتا ہوں۔

اِس طویل اور تنہا سفر میں اپنے کو بار بار اور بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مِلا، مختلف حالات میں اور بہت سے اثرات سے دُور، طرح طرح کی دماغی اور جذباتی کشمکش میں اُلجھا ہوا اور اپنی ذہنی ایمانداری کو برقرار رکھنے میں کوشاں، آزاد لیکن اپنی ضمیر کی سرگوشیوں پر گوش بر آواز، پابند لیکن آزادی کے راستے نکالتا ہوا۔ کبھی یہ احساس ہوا کہ میں مَیں نہیں کوئی اور ہوں کبھی یہ معلوم ہوا کہ بہت اہم ہوں اور بہت سے دِلوں میں اُتر رہا ہوں کبھی اپنی ذات بے وقعت ہو کر کائنات میں گُم ہوتی معلوم ہوئی۔ کبھی جہل کا احساس ہوا کبھی علم کا، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں اپنی حیثیت اور اپنے منصب سے غافل ہو گیا ہوں معلوم نہیں زندگی کی بہت سی غلطیوں کی طرح یہ بھی ایک بے درد چوک تو نہیں تھی کہ میں نے سفر کو ذہنی عیّاشی نہیں بننے دیا بلکہ چیخوف کی طرح خود اپنے اندر کے حیوان کو سُدھاتا، سُدھارتا اور شائستہ عمل بناتا رہا۔ ایسا سفر کانٹوں پر چلنے اور پھولوں میں بسر کرنے کا فن سکھاتا ہے۔ کیسے کہہ دوں کہ سارا سفر بے سود رہا! یہ اور بات ہے کہ تنہائی اور اُداسی ہمزاد کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہی۔ متوسّط طبقہ کے انسان انسان کی شائد یہی قسمت ہے کہ جب تک وہ اپنی انفرادیت اور شخصیت کے

اظہار میں سماج کے کسی عنصر سے برسرِ پیکار ہے، میدان میں ہے جیسے ہی اس سے الگ ہوا تنہائی کا احساس آ دبوچتا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ یا مسلسل جنگ یا تنہائی کا بھیانک سایہ!

خیر تو اِس طویل اور تنہا سفر میں میں نے اگر کچھ اور نہیں سیکھا تو اتنا ہی سہی کہ میں نے احتشام حسین کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں ہر وقت اُس کے ساتھ رہا، اُس سے مشکل اور نازک سوالات کئے، اُسے چھیڑا اور اُکسایا، اُسے آزمایا اور کسا، اُسے خلوت و جلوت میں دیکھا، عجیب انسان ہے متضاد کیفیتوں کا حامل، حقیقتوں سے جد و جہد کرنے کا شائق اور خوابوں کے پیچھے چھپ کر مارا مارا پھرنے والا، اُسے سمندر سے بھی محبت ہے ساحل بھی عزیز ہے، وہ طوفانوں کی خواہش بھی کرتا ہے اور سکون کا متمنّی بھی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے زندگی کے ساتھ بے پروائی برتی، اُس کی وسعتوں میں سے صرف مطالعہ کو چُن لیا، مطالعہ کتنا ہی وسیع ہو مشاہدے اور زندگی کی جد و جہد میں شریک ہو کر تجربے حاصل کرنے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ سماجی جانور بننے کے لئے کبھی کبھی احمق، مجنون یا محض بچّہ بننے کی ضرورت پڑتی ہے، اُس نے اِس راز کو نہیں سمجھا، وہ ڈرتا رہا کہ کہیں کوئی ہنس نہ پڑے، کوئی کچھ کہہ نہ دے۔ یہ ایک سمٹی، سہمی ہوئی اور محدود شخصیت کی نشانی ہے۔ تفریحوں اور لذّت کوشیوں کے بہت سے در کھلے ہوئے دیکھ کر میں نے اُس کو پُرزور انداز میں شرکت کی دعوت دی وہ مُسکراتا رہا اور اگر اُس نے کچھ کہا بھی تو اِس طرح جیسے اپنے گرد و پیش سے خوفزدہ ہو۔ جہاز میں جب لوگ دلچسپیوں میں مصروف ہوتے اور وہ پڑھتا یا سمندر کی موجوں کو

گنتا رہتا تو میرا جی چاہتا کہ میں کتاب اُس کے ہاتھ سے چھین لوں اور کہوں کہ یہ کھیل کود، یہ شراب نوشی، یہ رقص کے ہنگامے، یہ قمار بازی، یہ محض ہنسی کے لئے ہنسی، یہ صرف بات کے لئے بات محض حماقت تو نہیں، کچھ نہ کچھ لذت تو حاصل ہی ہوتی ہوگی، ورنہ لوگ خوش کیوں ہیں! میں نے اُس سے کہا بھی کہ یہ سنجیدگی بے محل ہے، اِس طرح اپنے خول کے اندر رہنا بے معنی ہے۔ رقص، کھیل کود، باتِ چیت کے بہانے دِل ملتے ہیں، جسم ملتے ہیں، تجربہ حاصل ہوتا ہے اور یہی باتیں سُنا سُنا کر اُسے کبھی کبھی منا بھی لایا لیکن اُس کی اُداسی، اُس کے فلسفیانہ غم اور اُس کے احساسِ تنہائی کو دُور نہ کر سکا۔ میں سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ چاہتا کیا ہے، غالباً اُسے خود بھی اس کا علم نہیں ہے، شائد اس میں اتنی گہرائی اور پیچیدگی ہے جس کو وہ بتا نہیں سکتا۔ جب میں نے اُسے ایک دِن بہت مجبور کیا تو اُس نے مُسکراتے ہوئے شیکسپیر کے ڈرامے آیز یو لائک اِٹ کا چوتھا ایکٹ میرے سامنے کر دیا:-

ROSALIND:- They say you are a melancholy fellow.

JAQUES:- I am so; I do love it better than laughing.

R:- Those that are in extremity of either are abominable fellows......

J:- I have neither the scholar's melancholy which is emulation; nor the musician's which is fantastical; nor the